باسمہ تعالیٰ

ڈاکٹر طٰہٰ حسین (مصری) کی عظیم تصنیف

الفتنۃ الکبریٰ

ترجمہ

پروفیسر محمد منور (ایم اے)

جس میں حضرت عثمانؓ کے زمانہ کے نازک ترین واقعات
کا بڑے ذمہ دارانہ اور غیر جانبدارانہ انداز سے جائزہ لیا گیا ہے

دوست ایسوسی ایٹس

پرنٹرز ۔ پبلشرز ۔ سپلائرز

الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

جملہ حقوق محفوظ
1999ء
محمد شاہد عادل نے
عالمین پریس سے چھپوا کر
دوست ایسو سی ایٹس اردو بازار لاہور
سے شائع کی۔

قیمت -/240

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مشمولات

الفتنۃ الکبریٰ

عنوان	صفحہ
فہرست	و
عرض مترجم	ش
تعارف	ط
○ باب اوّل	
تمہید	۱
تاریخ کے مطالعہ میں میرا نقطۂ نظر	۱
خلافتِ اسلامیہ کا مفہوم	۳
مختلف نظام ہائے حکومت کے تجربے اور ان کا مآل	۳
حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ اور عدل اجتماعی کا جرأتمندانہ تجربہ	۵
○ باب دوم	
اسلام کے دو بنیادی اہم مسائل توحید اور مساوات	۷
اقامتِ عدل کی جدوجہد	۱۰
خلیفۂ دوم کا طریقِ کار	۱۳
ایک سوال	۲۰

○ باب سوم

عہدِ فاروقی تک حکومت کا انداز و نوعیت	۲۱
شوریٰ	۲۲
بیعت	۲۵
کیا صدرِ اوّل کی اسلامی حکومت جمہوری نظام پر مشتمل تھی ؟	۲۸
اسلامی حکومت کے اجزائے ترکیبی	۳۳
پہلی شکل	۳۹
دُوسری شکل	۴۱
حضرت عُمرؓ کی حکمت عملی کا ایک پہلو	۴۷
حضرت عُمرؓ کی حکمتِ عملی کا دوسرا پہلو	۴۸
نظامِ شوریٰ	۵۰

○ باب چہارم

حضرت عثمانؓ (خلیفہ بننے سے پہلے)	۵۲
حضرت عُثمانؓ (اسلام لانے کے بعد)	۵۳
تدوین دواوین اور نظامِ عسکری	۵۹
نظامِ شوریٰ اور اس پر تنقید	۶۲
خلافت کے لئے حضرت عُثمانؓ کا انتخاب	۶۷

○ باب پنجم

حضرت عُثمانؓ کی خلافت کا آغاز	۶۸
مکاتیبِ حضرت عثمانؓ	۷۳
پہلا مکتوب (زکوٰۃ کا مفہوم ۔ مملکت کے محاصل اور اُن کے خرچ کرنے کا طریق)	۷۳
چوتھا مکتوب (کفر، عجمیت میں پنہاں ہے ۔)	۷۷
حضرت عمرؓ کے مقرر کردہ عمال جنہیں حضرت عثمانؓ نے بحال رکھا ۔	۷۸

حضرت عثمانؓ کی طرف سے وظائف اور عطیتوں میں اضافہ ۷۹

انتظامی امور میں حضرت عثمانؓ کا حضرت عمرؓ سے اختلاف ۸۱

عہدِ عثمانؓ کے متعلق مورخین کے بیان کا مطلب ۸۳

○ باب ششم

حضرت عثمانؓ اور اُن کی رعایا۔ ۸۴

قریش کے ساتھ طرزِ عمل ۸۴

جماعت انصار ۸۹

عرب کے عوام ۹۰

مفتوحہ اقوام ۹۱

○ باب ہفتم

حضرت عثمانؓ کی خلافت کا دوسرا دور ۹۵

مفتوحہ علاقوں کی مختلف حیثیتیں ۹۵

حضرت سعدؓ کی تقرری و معزولی ۹۶

کوفہ میں ولید اور اس کی سیاست ۱۰۱

○ باب ہشتم

کوفہ سعید ابن العاص کے دور میں ۱۰۹

کوفہ اور دیگر نئے مفتوحہ علاقوں میں اصل بیماری اور اس کا علاج ۱۱۰

اسلام میں بڑی بڑی ملکیتوں اور جاگیردارانہ نظام کا آغاز ۱۱۲

جلاوطنی کی سزا ۱۱۹

○ باب نہم

بصرہ میں ابوموسیٰ اشعریؓ کی معزولی اور عبداللہ بن عامر کی تقرری ۱۲۳

○ باب دہم

شام کے وسیع علاقے پر حضرت معاویہؓ کا اقتدار ۱۲۸

○ گیارھواں باب

مصر حضرت عثمانؓ کے عہد میں ۱۳۲

عمرو بن العاصؓ کی معزولی اور عبداللہ ابن سعد کی تقرری ۱۳۲

○ بارھواں باب

دو قریشی نوجوان مصر میں ۱۳۶

کوفہ سے اشتر کا خط ۱۳۹

○ تیرھواں باب

عبداللہ ابنِ سبا ۱۴۲

مسلک بوذری اور عبداللہ ابنِ سبا ۱۴۳

ایک اہم سوال اور اس کا جواب ۱۴۷

○ چودھواں باب

حضرت عثمانؓ کے ساتھ مرکز میں ۱۵۰

○ پندرھواں باب

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص ۱۵۵

○ سولھواں باب

حضرت زبیرؓ بن العوام ۱۵۸

○ سترھواں باب

حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ ۱۶۱

○ اٹھارواں باب

حضرت علیؓ بن ابی طالب ۱۶۴

○ اُنیسواں باب

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ۱۷۳

○ بیسواں باب

حضرت ابوذر غفاریؓ ۱۷۸

○ اکیسواں باب

حضرت عمارؓ بن یاسر ۱۸۳

○ بائیسواں باب

حضرت عثمانؓ کی مخالفت کے اسباب ۱۸۷

عہدِ عثمانی پر تنقید کرنے والوں کے نقطہ ہائے نظر ۱۸۸

○ تیئیسواں باب

حضرت عثمانؓ کے بارے میں قدماء کا نقطہ نظر ۱۹۳

دینی حیثیت رکھنے والے اعتراضات ۱۹۴

○ چوبیسواں باب

حضرت عثمانؓ کے خلاف نظم و نسق سے متعلق اعتراضات ۲۰۷

○ پچیسواں باب

حضرت عثمانؓ کے عہد میں نظام مالیات ۲۱۰

خلافت کے متعلق حضرت عثمانؓ کی رائے ۲۱۱

○ چھبیسواں باب

حضرت عثمانؓ کا اپنے مخالفوں کے ساتھ طرزِ عمل ۲۱۹

○ ستائیسواں باب

مخالفین اور حضرت عثمانؓ ۲۲۲

حضرت عثمانؓ کے خلاف پہلی جرأت ۲۲۳

حضرت عثمانؓ کی سخت ترین تقریر ۲۲۸

اموال عامہ کے متعلق حضرت عثمانؓ کا خیال ۲۳۰

حضرت عثمانؓ کی مشاورت ۲۳۱

کوفہ میں بغاوت ۲۳۲
مصری وفد کی مدینہ میں آمد ۲۳۲
مروان کی مداخلت اور اس کی تاثیر ۲۳۳
مدینے پر باغیوں کا قبضہ ۲۳۴
خط کا قصہ ۲۳۴
○ اٹھائیسواں باب
حضرت عثمانؓ کی شہادت ۲۳۶
مدافعت کرنے والی جماعت ۲۳۸
جھڑپ کی ابتداء ۲۳۹
کیا حضرت عثمانؓ آخری وقت میں خلافت سے دستبرداری کے لئے تیار تھے۔ ۲۴۰
○ انتیسواں باب
امیر معاویہؓ کی دو تجویزیں ۲۴۱
ان حالات کا خلاصہ جو باعث شہادت بنے۔ ۲۴۳
مسلمانوں کے سامنے آنے والا دوراہہ ۲۴۴
○ تیسواں باب
ایک جواب طلب سوال ۲۴۶
○ اکتیسواں باب
عثمانؓ کے خون ناحق کی ذمہ داری کس پر ۲۴۸
باغیوں کے عذر ۲۴۹
○ ضمیمہ
حضرت عثمانؓ کا صوبوں کے نام خط (برائے امداد طلبی) ۲۵۱
حاجیوں کے نام حضرت عثمانؓ کا خط ۲۵۳

عرضِ مترجم

"الفتنۃ الکبریٰ" عربی سے اُردو میں منتقل ہوگئی ہے —— عربی اور اُردو کے لسانی سانچے خاصے متفاوت ہیں۔ اس لئے ایک دوسرے میں ڈھلتے ہوئے ان کی اساسی رعنائی و دل کشی باقی نہیں رہتی۔ یہ راہ اس وقت اور بھی زیادہ پرپیچ ہوجاتی ہے جب اصل متن کا خالق ڈاکٹر طٰہٰ حسین ایسا فن کار مصنف ہو جس کے سہل ممتنع اندازِ بیان کی نقل خود عربی ادباء کے بھی حیطۂ قدرت سے باہر ہے۔

یہ ترجمہ قریباً سو فیصد لفظی ترجمہ ہے —— آزاد نہیں۔ ایسی صورت میں سلاست و روانی قائم رکھنے کا مسئلہ دشوار تر ہوجاتا ہے —— میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا اندازہ میں نہیں کرسکتا۔ قارئین بہترین مُنصف ہیں۔ رہا ترجمہ کی صحت و عدمِ صحت کا سوال تو گذارش ہے کہ میں ترجمہ شروع کرنے سے قبل بھی اپنی کم مائیگی محسوس کر رہا تھا اور اب بھی کر رہا ہوں —— عربی زبان سے مجھے عشق ہے مگر جہاں تک اس زبان کے علم کا تعلق ہے۔ محض مبتدی ہوں —— ترجمہ بذاتِ خود ایک نہایت مشکل فن ہے —— میں اس دریا کا بھی شناور نہیں ہوں۔ لہٰذا ملتمس ہوں کہ جن اربابِ علم کو جہاں کہیں ترجمہ اور ترجمانی میں غلطی دکھائی دے اس کی ہمدردانہ نشاندہی فرمائیں —— میں ان کا تہِ دل سے شکر گذار ہوں گا۔ اور انشاء اللہ آئندہ طباعت میں ان غلطیوں کی تصحیح کردی جائے گی۔

کتاب کا موضوع بڑا نازک ہے بقول عرفی ؎

ہشیار کہ رہ بردمِ تیغ است قدم را

یہ موضوع قارئین سے دقتِ نظر اور صداقتِ فکر کا شدید تقاضا کرتا ہے۔ حق یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کا یہ زمانہ روایات کی "گوناگونی" کے باعث آئندہ تمام اسلامی تاریخ کی عمارت پر خشتِ کج کی طرح اثر انداز ہوا ہے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس کتاب میں بڑے خلوص کے ساتھ اس مسئلہ کو سمجھنے (اور حد یہ ہے کہ سمجھانے) کی کوشش کی ہے —— لیکن

یاد رہے کہ یہ ایک شخص کی انفرادی کاوش ہے۔ دوسرے افراد کو اس سوچ سے کئی مقامات پر اختلاف ہو سکتا ہے خود مترجم کو بعض واجب التکریم شخصیتوں کے بارے میں مصنف کی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ لیکن جس بات کی اشد ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایسی سوچ ملت گیر ہو تاکہ اجتماعی ذہن کسی فیصلہ پر پہنچنے کے قابل ہو سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ایسے غیر فرقہ وارانہ تفکیر کی داغ بیل ڈالنے میں تاخیر ایک اجتماعی جرم ہے۔

اس کتاب کا ترجمہ کرنے کے لئے اگرچہ موضوع کتاب ہی کافی وجہ تھا۔ تاہم مجھ سے یہ کام کرا لینے کی ذمہ داری میرے کئی عزیزوں اور بزرگوں پر عائد ہوتی ہے ـــــ ورنہ میں نے دونوں جلدیں کئی بار پڑھنے کے بعد بڑے آرام سے اس نیت کے ساتھ الماری میں بند کر دی تھیں کہ اگر کبھی ہمت ہوئی تو ان کا ترجمہ کر دیا جائے گا۔ یہ نیت اسی طرح نیک تھی جیسے بقول حالیؔ ہر مسلمان کی حج پہ جانے کی نیت نیک ہوتی ہے ـــــ مگر کتنے افراد جانے میں کامیاب ہوتے ہیں؟ ـــــ کام کرنے کی خواہش کرنا اور فی الواقع کام کرنا یہ دو ایسے جزیرے ہیں جن کے مابین بے کراں موجیں حائل ہیں ـــــ بہرحال سب سے بڑی ذمہ داری میرے مشفق چودھری غلام احمد صاحب پرویزؔ پہ عائد ہوتی ہے۔ جنہوں نے اقتباساً اس کتاب کے کچھ ٹکڑے "طلوع اسلام" میں شائع کئے جس کے باعث میرے احباب کو اس ساری کتاب کا ترجمہ دیکھنے کا شوق پیدا ہوا ـــــ ان شائقین میں میرے دوست اور بھائی (دوست کے بعد بھائی کہنا یقیناً ایک فالتو سی بات ہے) محمد الیاس صاحب پیش پیش تھے۔ کیونکہ انہوں نے لڑکپن میں جس جوش و خروش کے ساتھ عربی پڑھی تھی جوانی میں اسی ذوق و شوق کے ساتھ بھلا ڈالی ہے ـــــ الیاس صاحب کی طرح حبیب گرامی قریشی محمد عبداللہ شاہ صاحب بھی جب کبھی اس کتاب کا ذکر سنتے ترجمہ پر اصرار فرماتے ـــــ محترم برادر محمد منیر اکبر صاحب سیکرٹری میونسپل کمیٹی سرگودھا تو طعن و تشنیع کے ہتھیاروں سے مسلح ہر وقت آمادۂ پیکار رہتے تھے۔ مثلاً کیا فائدہ آپ لوگوں کے پڑھنے کا ـــــ کوئی کتاب نہیں لکھی ـــــ اور نہیں تو کسی کتاب کا ترجمہ ہی کر دیا ہوتا ـــــ کسی کتاب سے مراد یہی "الفتنۃ الکبریٰ" تھی۔

یہاں یہ بات واضح کر دینی غیر محل نہ ہوگی کہ اگر تسوید دردِ سر ہے تو نظر ثانی اور تبییض دردِ جگر۔ میرے ایک کرم فرما کہا کرتے ہیں کہ اگر نظر ثانی اور تبییض بھی فقط اتنی ہی مشکل ہوتی جتنی تسوید ہے تو دنیا میں مصنفوں کی تعداد ہزاروں گنا زیادہ ہوتی ـــــ اس ترجمہ کی تسوید بھی یقیناً ایک مدت تک خلعت تبییض کی منتظر رہتی۔ مگر جناب محمد منیر اکبر صاحب پھر حملہ آور ہوئے ـــــ ۱۹۵۶ء کی تعطیلات ہو چکی تھیں۔ انہوں نے حکم دیا کہ تم سرگودھا سے کہیں باہر نہیں جا سکتے۔ اس کام کو ان تعطیلات میں مکمل کرو ـــــ یہ کہہ کر انہوں نے اپنی کوٹھی کا ایک مکلف کمرہ میرے لئے مخصوص کر دیا اور

میری جملہ آسائشوں اور ضرورتوں کی کفالت اپنے ذمہ لے لی — ایسے ظالم مہربانوں کا شکریہ کس زبانِ شکایت سے ادا کیا جا سکتا ہے ؛

بہرحال میں نے نظرِ ثانی وغیرہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس "قید" میں میرے جگری دوست نصیر احمد ناز ایم۔اے اور محمد خورشید عاصم ایم۔اے بھی شریک تھے۔ یہ دونوں عزیز عربی زبان کے متوالے ہیں۔ انہوں نے نظرِ ثانی میں میری گراں قدر اعانت کی — ترجمہ کی کئی غلطیاں درست کیں اور عبارت کو رواں تر بنانے کی خاطر خاصی جگر کاوی سے کام لیا — محمد خورشید عاصم نے تو کم از کم دو سو صفحات کی تبییض بھی کی۔ ان دونوں کا شکریہ کیونکر ادا کروں — دوست ہیں — ڈرتا ہوں میرے کلماتِ امتنان، ان کی طبعِ نازک پہ گراں نہ گزریں —

محبت کیش

(پروفیسر) محمد منوّر (ایم۔اے)

(گورنمنٹ کالج۔لائلپور)

تعارف

قرآن کریم نے تاریخ کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اس نے کہا ہے کہ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ (24/34)۔ "اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمہاری طرف واضح احکامات نازل کئے اور ان لوگوں کے حالات جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں"۔ اس نے تاریخ کو محض واقعات نگاری کی حیثیت سے پیش نہیں کیا بلکہ اس نے اسے فلسفہ یا سائنس کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ قوموں کا عروج اور زوال، فطرت کے اٹل قوانین سے وابستہ ہوتا ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ فلاں قوم نے جب قوانینِ خداوندی کے مطابق معاشرہ قائم کیا تو اس کا نتیجہ کیا مرتب ہوا اور جب اس نے ان قوانین کی خلاف ورزی کی تو اس کا انجام کیا ہوا۔ ان امور کے بیان کرنے سے قرآن کریم کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اگر تم بھی اس قسم کی روش اختیار کرو گے جس پر چل کر کوئی قوم تباہ ہوئی تھی تو تمہارا انجام بھی تباہی ہوگا اور اگر تم نے ایسی قوم کی راہ اختیار کی جس نے قوانینِ خداوندی کے اتباع سے عروج حاصل کیا تھا، تو تمہیں بھی سرفرازی اور بلندی نصیب ہو جائے گی۔

لیکن تاریخ کی اس اہمیت کے باوجود ہماری تاریخ کا جو عالم ہے اس کے پیشِ نظر اسے کسی طرح بھی قابلِ اعتماد تو ایک طرف، قابلِ اطمینان بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اول تو ہمارے قرنِ اول کی تاریخ باضابطہ طور پر تیسری چوتھی صدی ہجری سے پہلے مرتب نہیں ہوئی۔ اور جو مرتب ہوئی وہ بھی ایسے غیر ناقدانہ انداز سے کہ اُسے اُس عہد کی قابلِ اطمینان تاریخ کسی صورت میں بھی نہیں کہا جا سکتا۔

یہ تو اُس دور کی تاریخ کی عمومی حالت ہے۔ لیکن خاص طور پر حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے زمانے کا جو نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ بڑا ہی عبرت آموز اور تاسف انگیز ہے۔ ہم چاہتے تھے کہ کوئی بلند پایہ مورخ یا تنقید نگار اُس دور کی تاریخ کا غیر جانبدارانہ طور پر جائزہ لے کر یہ بتائے کہ وہ احوال و ظروف کیا تھے جن میں خلیفۃ المسلمین،

حضرت عثمانؓ کی مدینہ منورہ میں شہادت عمل میں آئی۔ اس ضمن میں جو کتب تاریخ ہماری نظروں سے گذریں ان میں ہم نے مصر کے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب "الفتنۃ الکبریٰ" کو فی الجملہ باقیوں کے مقابلہ میں بہتر پایا۔ ڈاکٹر موصوف علمی دُنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

ہم اس کتاب کا اُردو ترجمہ اس خیال سے شائع کر رہے ہیں کہ ہمارے ہاں جو طبقہ عربی زبان سے واقف نہیں، لیکن وہ اس موضوع سے دلچسپی رکھتا ہے، اُسے معلوم ہو جائے کہ عربی ممالک کے مفکر اور مؤرخ کس نہج پر سوچتے اور تاریخ کو پیش کرتے ہیں۔ چونکہ ہمارے پیشِ نظر نہ تنقید ہے اور نہ محاکمہ اس لئے ہم نے نہ کسی طویل تمہید کی ضرورت سمجھی ہے اور نہ ہی خاص حواشی کی۔ ہم نے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے خیالات کو اُردو میں منتقل کر دینے پر اکتفا کیا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم ان کے نتائج مستخرجہ سے بھی بالکلیہ متفق ہوں۔

امید ہے کہ ہمارا اردو دان طبقہ اس کتاب کو مفید پائے گا۔ الفتنۃ الکبریٰ (عربی) دو جلدوں میں ہے۔ جلد اوّل میں حضرت عثمانؓ کے زمانے کے حالات ہیں اور جلد دوم میں حضرت علیؓ اور آپ کے صاحبزادگانؓ کے حالات۔ ہم سردست جلد اوّل کا ترجمہ شائع کر رہے ہیں۔

الفتنة الكبرى

باب اوّل

تمہید

میری دلی خواہش ہے کہ اس بحث میں حتی الامکان حق اور صرف حق کو ملحوظ رکھوں اور جہاں تک بس چلے راستی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑوں۔ اس معاملہ میں اپنے آپ کو جادۂ انصاف کا پابند رکھوں اور اس سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر نہ ہٹوں۔ میری پوری کوشش ہوگی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں مسلمانوں کی مختلف لڑنے والی جماعتوں میں سے کسی کی طرف داری و حمایت نہ کروں۔ میں نہ پرستارِ عثمانؓ ہوں نہ شیعۂ علیؓ۔ نہ اس قضیہ میں میرا اندازِ فکر حضرت عثمانؓ کے ان ہمعصروں کی طرح ہے جنہوں نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ اس جھگڑے کی مشکلات برداشت کی تھیں اور پھر ان کے دوش بدوش یا اُن کی وفات کے بعد اس کے عواقب کا بار اٹھایا تھا۔

تاریخ کے مطالعہ میں میرا نقطۂ نظر

مجھے معلوم ہے کہ حضرت عثمان کے زمانہ سے لے کر آج تک اس جھگڑے میں لوگوں کے درمیان اختلاف آرا ء رہا ہے۔ چنانچہ ایک گروہ تو عثمانی ہے جو حضرات شیخین (ابوبکرؓ و عمرؓ) کو چھوڑ کر اصحاب رسولؐ اللہ میں سے کسی کو بھی حضرت عثمانؓ کا ہم پلہ نہیں مانتے۔

دوسری جماعت شیعوں کی ہے جو رسولِ خدا کے بعد کسی کو بھی حضرت علیؓ کا ہمسر تسلیم نہیں کرتی۔ اس ضمن میں وہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بھی مستثنیٰ نہیں کرتے نہ ان کے دلوں میں ان دونوں بزرگوں کی عظمت و منزلت کا کوئی خیال ہے۔ ایک گروہ ان دونوں کے بین بین ہے اور وہ حضرت عثمانؓ کی پاسداری یا حضرت علیؓ کی طرفداری میں کسی قدر میانہ روی سے کام لیتا ہے اور وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے ہر ایک کی قدر و عظمت کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ السابقون الاوّلون کی سبقت کا قائل ہونے کے ساتھ ساتھ کسی کو کسی پر فضیلت بھی نہیں دیتا۔ اُن کا عندیہ یہ ہے کہ اُن سب نے خدا و رسولؐ کے احکامات کی تابعداری میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی اور وہ سب کے سب اسلام اور مسلمانوں کے خیرخواہ تھے، ان سے اجتہاد میں خطاء و صواب کا وقوع ممکن ہے اور ہر دو صورت میں وہ اجر کے حقدار ہیں۔ کیونکہ انھوں نے نہ تو عمداً کوئی خطا کی تھی نہ قصداً کسی

غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ بہر حال یہ سب فریق اپنے اپنے نظریہ پر بڑی سختی سے کاربند ہیں اور اپنی اپنی آرا کی مدافعت میں جان تک لڑا دینے کو تیار ہیں۔ اس لئے کہ وہ اس قضیہ کو دینی نقطۂ نظر سے سوچتے ہیں اور اسے ایمان کی ایک شق قرار دیتے ہیں اور پھر اس کی حفاظت و مدافعت اس انداز سے کرتے ہیں جیسے ایک مومن اپنے دین کی حفاظت کرتا اور اپنے یقین و ایمان پر پختگی سے قائم رہتا ہے اور اس تمام قول وعمل سے وہ رضائے الٰہی کے حصول کا متمنی اور ثواب کا طالب ہوتا ہے۔

میں اس قضیہ کو ہر قسم کے جذبات و احساسات سے الگ ہوتے ہوئے، "دین و ایمان" سے بالاتر ہو کر، محض ایک ایسے مؤرخ کی نظر سے دیکھنا چاہتا ہوں جو جملہ میلانات، عواطف اور اغراض و خواہشات سے پوری طرح مبرّا و منزہ ہو خواہ ان کے مظاہر و مصادر اور غایات کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔

مسلمانوں کی ایک جماعت بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ صحابہ کرامؓ کا ایک بڑا حصّہ تو اس قضیہ کے رونما ہونے اور اس جھگڑے کے پھیلنے سے پہلے ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکا تھا۔ لہٰذا یہ حادثہ ان کے ایمان اور ان کی قدروں میں کوئی نقص و خلل پیدا نہ کرسکا بلکہ اس کی وجہ سے وہ شک و شبہ سے بالا اور لغزشوں سے محفوظ ہے۔ دُنیا سے رخصت ہوتے وقت وہ ان نعمتوں اور برکتوں سے بہرہ مند تھے جو خدا نے مسلمانوں کے لئے بطور اجر مخصوص کر رکھی تھیں اور ان تمام فتنوں اور برائیوں سے بچے رہے جو خدا (کے قانونِ مکافات) نے مسلمانوں کے لئے بطورِ سزا مقرر کی تھیں۔ جب یہ قضیہ ظہور پذیر ہوا اور مسلمان اُس شدید خانہ جنگی کا شکار ہو گئے جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ قاصر ہے تو اس وقت بہت سے صحابہ کرامؓ ایسے بھی موجود تھے جنھوں نے اس نزاع میں کسی قسم کی کوئی شرکت نہ کی اور نہ اس کے شدائد و آلام سے کوئی بار اپنے کاندھوں پر اُٹھایا۔ انھوں نے اپنے دین کو بچانے کے لئے اس قضیہ میں جھگڑنے والوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ انھیں بزرگوں میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بھی تھے جنھوں نے فرمایا تھا کہ میں اس وقت تک شریک پیکار نہ ہوں گا جب تک مجھے کوئی ایسی تلوار نہ لا دو جو صرف عقل و نظر ہی نہ رکھتی ہو بلکہ وہ یہ بھی بول کر بتا دے کہ فلاں غلطی پر ہے اور فلاں راستی پر۔

چنانچہ میں بھی حضرت سعدؓ اور ان کے رفقاء کی روش اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ نہ ایک کی حمایت میں جھگڑا مول لوں گا نہ دوسرے کی مدافعت میں۔ میری کوشش یہ ہو گی کہ پہلے خود اپنے سامنے اور پھر تمام لوگوں کے سامنے وہ احوالی و ظروف بیان کروں جنھوں نے متخالف گروہوں کو فتنہ و فساد اور نتیجتہً ایک ایسی شدید خانہ جنگی کی طرف دھکیل دیا جس سے مسلمانوں کا شیرازہ آج تک منتشر ہوتا چلا آ رہا ہے اور جو اغلباً تا قیامت...... ان میں پھوٹ ڈالتی رہے گی۔ اس داستان کا مطالعہ کرنے والوں کو معلوم ہو جائے گا کہ حقیقتاً یہ معاملہ حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ اور ان کے ہوا خواہوں اور جاں نثاروں کے بس کا نہ تھا۔ اس وقت حضرت عثمانؓ کی جگہ جو شخص بھی مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوتا اُسے انہی مصائب و فتن سے دوچار ہونا پڑتا

جس سے حضرت عثمانؓ ہوئے تھے اور نتیجتاً اسی خصومت عامہ اور اس سے پیدا ہونے والے قتال کا مقابلہ کرنا پڑتا جس کا حضرت عثمانؓ کو سامنا کرنا پڑا۔

مجھے اس اعتقاد کے اظہار میں بھی باک نہیں کہ خلافت اسلامیہ کا جو مفہوم حضرات ابوبکر و عمر رضوان اللہ علیہما کے یہاں

خلافت اسلامیہ کا مفہوم (سیاسی تجربہ)

تھا وہ ایک بہت بڑا جراًتمندانہ تجربہ تھا جو تقریباً جان کی بازی لگانے کے مترادف تھا، لیکن یہ جان آزما مہم اپنے انجام تک نہ پہنچی۔ نہ ہی اس کا انجام تک پہنچنا ممکن تھا کیونکہ اس کی داغ بیل ایک ایسے دور میں ڈالی گئی جو اس کے لئے موزوں و مناسب نہ تھا۔[1] وہ اس عہد کے لئے بہت ہی پیش از وقت چیز تھی۔

کیا یہ صحیح نہیں کہ انسانیت اپنے گوناگوں تجربات، علمی ترقیات، مختلف قسم کی حکومتوں اور حکمرانی کے طریقوں کی آزمائش کے باوجود آج تک کسی ایسے سیاسی نظام کی تشکیل نہ کر سکی جس میں لوگوں کے درمیان سیاسی و اجتماعی عدل کا وہ نظام روبعمل لایا جا سکے جسے حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ عملی جامہ پہنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

انسانیت نے حکومت کے کئی طریقے اختیار کئے ایسے بادشاہ بھی آئے جو خود کو خدا سمجھتے تھے۔ ایسے بھی جو اپنے آپ کو مختلف

مختلف نظامہائے حکومت کے تجربے اور اُن کا مآل

دیوتاؤں کا سایہ تصوّر کرتے تھے۔ ازاں بعد ایسے بادشاہ بھی منصۂ شہود پر آئے جو خود کو خدائے واحد کا ظلِ خیال کرتے تھے تاہم یہ جملہ ملوک و سلاطین مخلصانہ یا غیر مخلصانہ طور پر رائے یہی رکھتے تھے کہ انہیں حکومت خدا یا دیوتاؤں کی طرف سے تفویض ہوئی ہے اور وہی انھیں اپنا ظل بنا کر بندوں میں بطور نائب و خلیفہ بھیج دیتے ہیں۔ لہٰذا ان ملوک کے کے اوامر و نواہی اور ان کے اعمال و دعاوی کو اس سے کوئی غرض نہ ہوتی تھی کہ لوگ اس سے راضی ہوں گے یا ناراض۔ اس لئے کہ لوگوں کو راضی یا ناراض ہونے کا کوئی حق ہی نہ تھا۔ ان کا فرض فقط یہ تھا کہ وہ سرِ تسلیم خم کر دیں۔ ان کی خوشی یا ناخوشی کو ہرگز یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ بادشاہوں کا طرزِ عمل بدل ڈالے۔ ایسے ہی جیسے آپ سورج کے طلوع ہونے پر خوش اور غروب ہونے پہ ناراض ہوتے رہیں کیونکہ نہ آپ کی خوشی اسے نمودار ہونے پہ اُکسا سکتی ہے اور نہ آپ کا غصہ اُسے روپوش ہونے سے روک سکتا ہے۔

انسانیت کو ان ملوک کی حکومت میں خوش بختی کم اور بدبختی زیادہ نصیب ہوئی۔ لہٰذا، وہ اس میں تغیر و تبدل کے لئے

---

[1] یعنی زمانے کی سطح ابھی اتنی اونچی نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس قسم کے نظامِ عدل و مساوات کو اپنا سکتا۔

کوشاں رہی اور بعض حالات میں اسے یہ تبدیلی میسر بھی آگئی۔ چنانچہ انسانیت نے اس چند سری حکومت (ARISTOCRACY) کا رنگ بھی دیکھا جس میں حکومت معدودے چند آدمیوں کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ جو ہر معاملہ میں عامۃ الناس سے قطع نظر کرکے عدل کا ترازو اپنے خود غرض ہاتھوں میں محدود و مخصوص رکھتے تھے۔ انسانوں نے ان "باغیوں" کی حکومت کا ڈھنگ بھی دیکھا جو اس لئے آئے تھے کہ عوام کو ان قلیل التعداد خود غرض افراد کی چیرہ دستیوں سے نجات دلائیں اور عوام میں ایسے عدل کو رواج دیں جس کی رو سے قوی و ضعیف، غنی و فقیر اور قادر و عاجز میں کوئی فرق باقی نہ رہے مگر وہ بھی عوام میں ظلم و جور عام کرنے۔ اکثریت کے ساتھ اقلیت کو ذلیل کرنے۔ اور اسے از سر نو انہی ضعف و بے بسی اور مصیبت میں مبتلا کر دینے کے سوا کچھ نہ کر سکے جس سے وہ اسے نکالنا چاہتے تھے۔

ازاں بعد انسانوں نے وہ نظام حکومت دیکھا جو ان کے خیال میں بہترین ترقی یافتہ، بلند اور مثالی نظام حکومت تھا

جمہوریت

جسے وہ اس قابل سمجھتے تھے کہ وہ عامۃ الناس میں سیاسی و اجتماعی عدل برقرار رکھ سکے گا۔ یہ وہ نظام تھا جس میں جمہور کی حکومت جمہور ہی کے سپرد ہوتی ہے کہ وہ جو تصرف چاہیں کریں اور جو تدبیر پسند کریں عمل میں لائیں۔ انسانوں کو اس تجربہ سے عدل کا ایک حصہ تو ضرور مل گیا مگر مکمل عدل تک نہ پہنچ سکے۔ بلکہ جو عدل انھیں حاصل ہوا تھا وہ بالکل معمولی اور ادنیٰ درجہ کا تھا۔ ازاں بعد آج تک عوام الناس کو یہ موقع میسر نہ آیا کہ وہ کسی ایک رائے یا ایک نظریہ پر متفق و متحد ہو سکتے تاکہ اُن کی آواز ایک ہوتی اور آرزو بھی۔ اس طرزِ حکومت میں وہ جمہور کے مسائل بظاہر اُنہی کے ہاتھ میں دیدیتے ہیں مگر درحقیقت جہاں تک عمل کا تعلق ہے انھیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ مثلاً وہ جمہور سے ان کے کسی معاملہ میں رائے طلب کرتے ہیں اور جب اختلاف رونما ہوتا ہے اور جس کا رونما ہونا لازمی امر ہے۔ تو پھر وہ اکثریت کی رائے کو نافذ کرکے اقلیت کی منشاء کا خون کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح وہ اکثریت کو یہ اختیار دے دیتے ہیں کہ وہ حسبِ مرضی اقلیت کو ذلیل کریں اور ان میں ایسے احکام نافذ کریں جنھیں وہ نہ چاہتی ہو۔ اگر یہ طرزِ حکومت اس امر کا ضامن ہوتا کہ اکثریت اپنے اوپر بھی حکومت کرتی اور اقلیت پر بھی تو یہ چیز عدل سے نسبتاً قریب اور ظلم سے کسی حد تک بعید ہوتی۔ لیکن اکثریت والے خود تو حکومت کرتے نہیں اور نہ وہ کر سکتے ہیں بلکہ وہ فرائض حکومت اپنے منتخب شدہ نمائندوں کے سپرد کرکے یہ بار اُن پر ڈال دیتے ہیں۔ اس انتخاب میں کبھی پارٹی بازی، تشدد، لالچ اور خوف کی آمیزش ہوتی ہے اور کبھی یہ ان چیزوں سے پاک صاف ہوتا ہے۔ بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ لوگ جنھیں عوام اپنے اوپر حکومت کا حق سونپتے ہیں اسی معاشرہ کے انسانوں میں سے ہوتے ہیں۔ ان میں طاقت بھی ہوتی ہے اور کمزوری بھی، سختی بھی ہوتی ہے اور نرمی بھی، قناعت بھی ہوتی ہے اور طمع بھی، ایثار کا جذبہ بھی ہوتا ہے اور مصلحت پرستی و خود پروری کا بھی، للہذا، ہر وقت

ان کی طرف سے خطرہ ہوتا ہے کہ وہ اعتدال چھوڑ کر راہِ حق سے منحرف ہو جائیں اپنے ساتھ دوسروں کو بھی غلط راہ پر لگا دیں اور پھر اسی طرح ظلم و ستم ڈھانے لگیں جس طرح مطلق العنان بادشاہ، یا خود سر و خود رائے ارستقراطیت، یا جاہ پسند باغی ڈھاتے رہے ہیں۔

بایں ہمہ جب حال یہ ہے کہ ابھی تک ہم عدلِ سیاسی کو بھی پوری طرح قائم نہیں کر سکے تو پھر اگر ہم عدلِ اجتماعی بھی بروئے کار لانا چاہیں جس کا تقاضا صرف یہی نہیں کہ جملہ عوام حاکم کی نگاہ میں برابر ہوں بلکہ یہ بھی ہے کہ سب لوگ اس پیداوار

عدل سیاسی اور عدل اجتماعی

میں بھی برابر کے شریک ہوں جس پر انسانوں کی زندگی کا دار و مدار ہو (تو یہ چیز کس قدر مشکل ہو گی) اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اب تک دنیا کے انسانوں نے مختلف ادوار و احوال، متعدد معاشروں کی تشکیل میں جن نظامہائے حکومت کا تجربہ کیا ہے وہ سب کے سب اس اجتماعی عدل کو اس کی پوری پوری شرائط کے ساتھ قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں، یا ایسا عدل اجتماعی جس میں انسانیت مکمل طمانیت سے بہرہ اندوز ہوتی۔ اسے ایسا سکون نصیب ہوتا جس میں کسی قسم کا تکدّر نہ ہوتا۔ اور وہ ایسے امن سے ہمکنار ہوتی جس میں کسی قسم کے خوف کی آمیزش نہ ہوتی، ہمارے موجودہ دور میں انسانیت پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مختصر یہ کہ جمہوریت نے عوام کو کسی حد تک آزادی اور قانون کی نگاہ میں تھوڑی سی مساوات ضرور عطا کر دی ہے لیکن وہ اجتماعی عدل بروئے کار لانے کے لئے کوئی ذمہ داری قبول نہ کر سکی۔ کمیونزم نے تھوڑے سے بہت اجتماعی عدل کی ضمانت لے کر عوام کے باہمی امتیازات کو ختم کر دیا۔ ہر مزدور کو کام مہیا کیا اور اپنی محنت سے نفع اندوز ہونے کا موقع بہم پہنچایا۔ اسی طرح معاشرہ کے اپاہج اور معذور لوگوں کی روزی کا ایسا بندوبست کیا کہ وہ ذلت۔ توہین اور شرمندگی سے محفوظ رہ کر باعزت زندگی بسر کر سکیں۔ لیکن اس کارگزاری کے عوض انھوں نے لوگوں کی آزادی تماما کیمونزم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دی۔ فسطائیت نے آزادی اور عدل دونوں کا خون کر دیا۔ اور لوگوں کو حکومت کے تسلط کے سامنے بالکل بے دست و پا بنا دیا۔ انھیں اپنی محنت اور مزدوری کے صلہ سے محروم کر کے آزادی کی ایک سانس بھی اُن پر حرام کر دی۔

حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ اور عدل اجتماعی کا جرأتمندانہ تجربہ

انسانیت نے صالح حکومت کی تلاش میں یہ سب مراحل طے کئے اور ان تمام نظامہائے حکومت کو آزمایا لیکن بایں ہمہ مقصد تک نہ پہنچی۔ ظلم و جور کا شکوہ بدستور اپنی جگہ رہا۔ ذلت و غلامی میں جکڑی رہی، اور مسلسل کسی ایسے صحیح نظام کی جستجو اور تلاش میں لگی رہی جو عامۃ الناس کو حریت اور عدل دونوں کی نعمتوں سے ہمکنار کر سکے۔ یہی وہ

صحیح نظام تھا جس کی نشو ونما کے لئے خلافت اسلامیہ حضرات ابوبکرؓ اور عمرؓ کے عہد میں سرگرم عمل رہی مگر حضرت ابوبکرؓ ابھی اس تجربے کو شروع بھی نہ کرنے پائے تھے کہ وفات پاگئے۔ حضرت عمرؓ جب شہید ہوئے تو وہ اس تجربہ کی راہ میں کئی قدم آگے بڑھا چکے تھے مگر اولاً تو وہ خود اپنے تجربہ سے مطمئن نہ تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی خلافت کے آخری ایام میں فرمایا کرتے تھے "جو کچھ میں نے بعد میں معلوم کیا اگر اس کا علم پہلے ہوجاتا تو میں سرمایہ داروں سے فالتو دولت چھین کر فقراء میں بانٹ دیتا"۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت عمرؓ خود بھی ایسا اجتماعی عدل (مکمل طور پہ) قائم نہ کرسکے جس کے وہ آرزومند تھے۔ جب حضرت عمرؓ کا یہ حال ہے حالانکہ آپ وہ خلیفہ ہیں جس سے زیادہ عدل پرور و عدل گستر امیر مسلمانوں اور غیر مسلموں کو کبھی میسر نہ ہوا تو پھر دوسروں کا ذکر ہی عبث ہے۔ ثانیاً یہ کہ حضرت عمرؓ کے اس تجربہ سے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہمعصر بھی خوش نہ تھے، اس لئے کہ وہ ان کے اقتدار و دبدبہ سے خائف و لرزاں رہتے تھے اور ان میں سے اکثر افراد ان کی اطاعت خوف وہیبت کی بنا پر کرتے تھے۔ چنانچہ وہ افراد جنھیں حضرت عمرؓ سے بے پناہ محبت تھی یا جن سے حضرت عمرؓ کو بیحد الفت تھی وہ حضرت عمرؓ کو یہ تلقین کیا کرتے تھے کہ وہ اپنے اور عامۃ الناس کے حق میں نرمی اختیار کریں لیکن وہ ایک نہ مانتے تھے۔ کیونکہ ان کی نظر میں عدل ہر شے سے زیادہ عزیز تھا۔ علاوہ ازیں اس تجربہ سے مفتوحین بھی راضی نہ تھے۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ان سے جو کچھ کرایا جاتا ہے۔ وہ ان کے لئے ناگوار ناقابلِ برداشت تکلیف ہے۔ یہ لوگ خود کو تہذیب و تمدن میں بہت آگے سمجھتے تھے۔ اور ان کے خیال میں عربوں نے ان کی ثقافت پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ لہٰذا انھیں ہرگز گوارا نہ تھا کہ عرب کے بادیہ نشین اس متمدن قوم پر مسلط ہوجائیں۔ حضرت عمرؓ کی شہادت اسی غم و غصہ کا نتیجہ ہے کیونکہ انہیں مفتوحین میں سے ایک شخص نے آپ کو شہید کردیا تھا۔ یہ شخص مغیرہ بن شعبہؓ کا غلام تھا۔ اس نے حضرت عمرؓ کے پاس مغیرہ بن شعبہؓ کی سخت گیری کا شکوہ کیا تھا لیکن جب حضرت عمرؓ نے تحقیق کی تو اُس کی شکایت بےجا ثابت ہوئی اور حضرت عمرؓ نے اس کے آقا کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو نماز ادا کرتے ہوئے نیزہ مار کر شہید کردیا گیا۔

تاہم اگر ہم اس جرأتمندانہ تجربہ کے بارے میں یوں سرسری طور پر فیصلہ صادر کردیں تو یہ زیادتی ہوگی۔ یہ معاملہ اس کا مستحق ہے کہ ذرا توقف کرکے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے اور دیکھا جائے کہ آیا اس تجربانی نظام کی بقاء، کامیابی اور فائز المرامی ممکن بھی تھی؟ اس غور و تامل کے وقت میں ہم اس انصاف پہ پابند رہ کر جسے ابتداء میں ہم نے اپنے اوپر لازم کیا ہے اس بات کو پایۂ تحقیق تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ غور و تامل ہماری اس ضمن میں بھی اعانت کرتا ہے کہ ہم ان بے شمار مشکلات کو سمجھنے کی کوشش کریں جو عہد حضرت عثمانؓ میں خود بخود رونما ہوئیں یا پیدا کی گئیں اور جن کا باعث فقط یہ نہ تھا کہ خلیفہ حضرت عثمانؓ تھے بلکہ درحقیقت خود وہ وقت ہی آپہنچا تھا جو ان مشکلات سے بعض کو ابھار کر سامنے لاتا اور رہی سہی کسر لوگ پوری کردیتے۔

باب دوم

اسلامی سیاسی نظام کا دارومدار مساوات پر ہے

وہ بنیادی قاعدہ جس پر حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ نے اپنا نظامِ حکومت استوار کیا، یہ تھا کہ مسلمانوں کے حق میں ان کا طرزِ عمل حتی الوسع وہی ہو جو آنحضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ آپؐ کی سیرتِ پاک سے مسلمان حتی الامکان

اسلام کے دو بنیادی اہم مسائل توحید اور مساوات

بڑی حد تک آگاہ تھے۔ اس سیرت کا بنیادی عنصر یہ تھا کہ عامۃ الناس میں خالص اور مطلق عدل نافذ کیا جائے۔ یہ وہ بات ہے جس کے لئے ہمیں کسی دلیل و ثبوت کی ضرورت نہیں۔ جو بھول گیا ہو اسے اتنا ہی یاد دلا دینا کافی ہے کہ جب اسلام آیا تو اُس نے دو مسائل پر سب سے زیادہ زور دیا۔ ایک توحید اور دوسرا مساوات۔ خدائے عزّوجل کا ارشاد ہے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ٥ (۴۹: ۱۳)

اے لوگو! بیشک ہم نے تم کو نر اور مادہ سے پیدا کیا اور تمہیں قبائل اور خاندانوں میں بانٹ دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بیشک خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہے۔ بیشک اللہ سب کچھ جانتا ہے اور پوری طرح باخبر ہے۔

قریش کو آنحضرت رسول اکرمؐ اور اُن کی دعوت کے خلاف جو غم و غصہ تھا اس کا سب سے بڑا بنیادی سبب یہی تھا کہ آپ اسی قرآنی عدل و مساوات کی طرف دعوت دیتے تھے۔ اور آقا و خادم۔ آزاد و غلام۔ قوی و ضعیف۔ اور غنی و فقیر میں کوئی فرق روا نہ رکھتے تھے۔ آپؐ کی دعوت کا مقصد یہی تھا کہ تمام انسان کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر ہو جائیں۔ کسی کو کسی کے مقابلے میں کوئی امتیاز حاصل نہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام نے غلامی کا خاتمہ نہیں کیا اور نہ لوگوں کو اس سے روکا کہ وہ ایک دوسرے کو اپنی مِلک بنائیں لیکن وہ لوگ جو اسلام کو بخوبی سمجھتے ہیں اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ

اسلام کا یہ پرخطر اقدام جس کی رُو سے آزاد اور غلام کو خدا کے نزدیک ہم مرتبہ قرار دے دیا گیا تھا انسانی تاریخ کا ایک بہت ہی اہم اور بالآخر نہایت دوررس نتیجہ پیدا کرنے والا واقعہ تھا۔ بشرطیکہ مسلمانوں کے حالات اسی رفتار سے بڑھتے رہتے اور انھیں ان مصائب ومحن اور حوادث وفتن کا سامنا نہ کرنا پڑتا جن سے وہ دوچار ہوئے۔ اللہ تعالٰی نے نمازیں غلام اور آزاد دونوں پر یکساں فرض فرمائیں جیسے روزہ ان دونوں پر فرض کیا، اسی طرح دونوں پر یہ بھی فرض کیا تھا کہ وہ اپنے دلوں کو خالصتاً خدا کے لئے خاص کر دیں، اللہ تعالٰی نے ان دونوں کے خون کو باحرمت ومعصوم قرار دیا۔ دونوں کے لئے ایک ہی دین مقرر کیا۔ یہ نہیں کیا کہ دین کا ایک حصہ آزاد کے لئے ہو اور دوسرا غلام کے لئے۔ اگر حالات درست رہتے تو یہی ایک بات غلامی کو مٹانے اور حرام کر دینے کے لئے کافی تھی۔ غلامی کیسے ختم نہ ہوتی جبکہ خدا نے غلام کے آزاد کرنے کو ان معاملات میں شامل کر دیا جن کی انجام دہی میں مسلمان ایک دوسرے سے مسابقت کرنے لگ گئے تاکہ خدا کے حضور خدا کے اجر وثواب کے مستحق ہوں؟ غلامی کیسے ختم نہ ہوتی جب کہ خدا نے دین میں ایسے کئی دروازے کھول دیئے تھے کہ غلام جونہی ان دروازوں سے گزرے آزاد ہو جائے۔ غلام کو آزاد کرنے کے لئے خدا نے کئی اسباب بنائے مثلاً جیسا کہ ابھی بتایا گیا ہے غلام کے آزاد کرنے کو ان اعمالِ صالحہ میں شمار کیا جو ایک مسلمان کا مقصود ومنتہی ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعض خطاؤں کا کفارہ غلام کا آزاد کرنا مقرر فرمایا۔ الغرض خدائے تعالٰی نے غلام کی آزادی کے لئے کوئی ایسا ذریعہ باقی نہ چھوڑا جس سے اس کی آزادی کی راہ آسان ہوتی ہو اور اسے مسلمانوں کے لئے فرض اور دستور العمل نہ بنا دیا ہو۔[1]

جب حضرت رسولِ اکرمؐ نے اس امر کا اعلان فرمایا تو قریش کے غیظ وغضب کی کوئی حد نہ رہی۔ بلکہ میں تو یہاں تک ماننے کو تیار ہوں کہ اگر آنحضرتؐ صرف توحید کی تلقین فرماتے اور قریش کے نظامِ اجتماعی واقتصادی سے تعرض کر کے عبد و حُر، غنی وفقیر، قوی وضعیف میں مساوات پیدا کرنے کی جدوجہد نہ فرماتے، سود کا قلع قمع نہ کرتے اور غریبوں میں بانٹنے کے لئے سرمایہ داروں سے دولت طلب نہ کرتے تو قریش کی اکثریت کسی تکلیف کے بغیر آپ کی دعوت قبول کر لیتی۔ کیونکہ قریش بتوں کو بہ خلوص ایمان نہیں مانتے تھے، اور نہ انہیں ان سے سچی محبت تھی۔ قریش کی بت پرستی تفننِ طبع سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ ان کے نزدیک بتوں کی حیثیت وسیلہ کی تھی نہ کہ غایت کی۔ یعنی قریش بتوں کے ذریعے اہلِ عرب کو دامِ تقدس میں گرفتار رکھنا چاہتے تھے۔ (اگر معاملہ صرف بتوں کو چھوڑنا ہوتا تو قریش کے لئے آسان ہو جاتا)۔ عوام میں جو چاہتا آپ کی دعوت قبول کر لیتا جو چاہتا انکار کر دیتا۔ اس صورت میں کسی کو کسی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑتا کیونکہ

---

[1] اور آئندہ کے لئے قرآن کے حکم کی رُو سے غلامی کا دروازہ بند کر دیا۔ (مترجم)

قریش کو بتوں سے اگر محبت تھی تو اس لئے کہ بتوں کی وجہ سے انہیں اہلِ عرب میں وقار بھی حاصل تھا اور ایک طرح کا وسیلۂ زر اندوزی بھی۔ تاہم قریش کو رسولِ خدا کی طرف سے ان کے بتوں کی عیب چینی اور یہ دعوت کہ اپنے اور خدا کے مابین بتوں کا وسیلہ ختم کر دیا جائے اتنی ناگوار نہ تھی جتنی یہ بات کہ آپؐ ان کے نظامِ اجتماعی سے تعرض کر کے ایک ایسا عدل قائم کرنا چاہتے تھے جو قریش کے رؤساء و زعماء کی مصلحتوں کے خلاف تھا۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ آنحضرت رسول اکرمؐ بسا اوقات سردارانِ قریش کے ساتھ اس خیال سے بہت نرمی اور خلوص رعایت فرماتے تھے کہ شاید ان کا دل اسلام کی طرف مائل ہو جائے اور وہ اس دعوتِ جدیدہ کے لئے ایک قوت ثابت ہوں۔ بعض اوقات اس کوشش میں آپؐ سے کسی غریب دورماندہ کے حق میں غفلت اور بے پروائی ہوئی ہو گی۔[1] چنانچہ اللہ تعالےٰ نے اس ضمن میں قرآن مجید میں آیات نازل فرما کر آپ کو متنبہ کیا۔ ابنِ ام مکتوم کے واقعہ سے متعلق جو کچھ خدائے عزّوجل نے وحی نازل فرمائی اسے لوگ آج تک پڑھتے چلے آرہے ہیں۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۙ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ؕ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۙ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ؕ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ؕ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ؕ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۙ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۘ فِىْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ (۸۰ : ۱۔۱۴)۔

پیغمبر چیں بجبیں ہوئے اور منہ موڑ لیا کیونکہ ان کے پاس ایک اندھا آیا تھا۔ اے پیغمبر آپ کو کیا معلوم ممکن تھا کہ وہ پاکبازی اختیار کرتا، یا نصیحت پکڑتا اور ... نصیحت اسے نفع دیتی۔ مگر آپ اس شخص کی طرف ملتفت ہوئے جو بے نیازی کا اظہار کر رہا تھا۔ حالانکہ اگر وہ پاکبازی اختیار نہ کرے تو آپ پر کوئی الزام نہیں آتا۔ لیکن جو آپ کے پاس دوڑتا ہوا آیا اور خائف بھی تھا تو آپ نے اس سے بے اعتنائی برتی۔ ایسا ہرگز نہ چاہیئے۔ بیشک یہ ایک پیغام و نصیحت ہے جسے جو چاہے یاد کرے۔ وہ پیغام باعزت صحیفوں میں ہے جو بلند کئے ہوئے اور مقدس و پاکیزہ ہیں۔[2]

الغرض انسانوں کے درمیان باہمی مساوات ان دو اہم بنیادی اصولوں (یعنی توحید و عدل) میں سے ایک ہے جن پر اسلام قائم ہوا۔ چنانچہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اور ازاں بعد مدینہ میں اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین

---

[1] یہ مصنف کا خیال ہے۔ حقیقت نہیں۔

[2] ان آیات کا یہ مفہوم نہیں۔

اقامت عدل کی جدوجہد

کے ساتھ ہر بڑے اور چھوٹے معاملہ میں جو سلوک روا رکھا اس کا بنیادی عنصر عدل تھا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ عدل اسلام کے اساسی ارکان میں سے ایک رکن ہے اور اس سے انحراف گویا اسلام سے انحراف ہے۔ اور اس میں خلل اندازی گویا دین میں خلل اندازی کے مترادف ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب ایک مسلمان نے خود رسول کریمؐ کو دیکھا کہ جنگِ حنین کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم میں آپؐ بعض عربوں کو ان کی تالیف قلوب کی خاطر دوسروں سے زیادہ حصہ دے رہے ہیں تو وہ ناسمجھی کے باعث اس طرزِ عمل کو برداشت نہ کر سکا۔ چنانچہ اس نے کہا "اے محمدؐ عدل کرو یہ آپ عدل نہیں کر رہے" آپؐ نے پہلی بار اس کی جانب توجہ نہ فرمائی لیکن اس شخص نے دوبارہ وہی بات کہی۔ اس پر آپؐ کے چہرے پر غصہ کے آثار نمایاں ہو گئے اور آپؐ نے فرمایا "ہوش کرو اگر میں بھی عدل نہیں کر رہا تو پھر عدل کون کرے گا؟" یہ دیکھ کر کچھ مسلمانوں نے چاہا کہ اس شخص کو پکڑیں لیکن انھیں آپؐ نے روک دیا۔ اس لئے کہ آپ اپنے ساتھیوں کی حریت کا تحفظ کرتے تھے۔ اور انھیں مشورہ تنقید اور اعتراض کا حق عطا فرماتے تھے۔ علاوہ ازیں رسولِ خدا (صلعم) اگر بعض عربوں کی تالیفِ قلب کر رہے تھے تو یہ عمل عین وحیٔ الٰہی و اجازتِ قرآنی کے مطابق تھا۔ خدا نے آپ کو سورۂ "برأت" میں اس بات کی اجازت دی تھی کہ آپؐ اموال صدقہ کے ذریعے بعض لوگوں کی تالیف قلوب کر سکتے ہیں کیونکہ خدا نے اموال صدقہ کے مصارف کی تعیین کرتے وقت اس امر کو بھی ایک مصرف قرار دیا ہے۔ اندریں صورت اگر آپ نے اموال غنیمت میں سے بہ اجازتِ خداوندی ایک جماعت کی تالیف قلوب کے لئے بخشش کی تو یہ راہ عدل سے انحراف نہ تھا۔ جہاں تک عدل کی انتہائی ممکن حد تک پاسداری کا تعلق ہے اس کا سب سے بڑا ثبوت وہ طریقِ عمل ہے جو آپؐ نے اپنے حق میں بھی اختیار کیا اور اپنے خلفاء کو بھی یہ شوق دلایا کہ وہ آپؐ کے بعد اسی طریقِ عمل کو عامۃ الناس میں رواج دیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں آنے والے وہاں تک نہ پہنچ سکے جہاں تک پہنچنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ خود رسولِ خداؐ نے اپنے آپ کو قصاص اور پاداش کے لئے پیش کر رکھا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے بھی اپنے عہدِ خلافت میں اس امر کا عام احساس دلایا ہوا تھا کہ جو عامل بھی رعیت کے کسی فرد کو بلا وجہ ایذا دے گا اس سے ضرور قصاص لیا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شخص نے ایام حج میں حضرت عمرؓ کے پاس شکایت کی کہ اس کے عامل نے اسے بلا سبب زدوکوب کیا ہے۔ جب عامل کی زیادتی ثابت ہو گئی تو حضرت عمر نے فیصلہ صادر کیا کہ صاحبِ شکایت اس سے اپنا انتقام لے لے۔ یہ سن کر عمال گھبرائے ہوئے حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ عامل سے درگزر فرمایا جائے کیونکہ بدیں صورت حکومت کے وقار کو دھکا لگتا ہے اور رعیت حکام کے حق میں گستاخ ہو جاتی ہے۔ غرض بہت الحاح و اصرار کیا مگر حضرت عمرؓ نے ایک نہ مانی۔ آخر کار صرف اس شرط پر سزا سے درگزر کرنا

گوارا فرمایا کہ وہ عامل صاحبِ شکایت کو راضی کرلے۔ چنانچہ عامل نے اس شخص کو راضی کیا اور اس طرح سزا سے بچ سکا۔

حضرت عمرؓ کے پاس دلیلِ قاطع یہ تھی کہ جب آنحضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو سزا سے مستثنیٰ قرار نہ دیتے تھے درآنحالیکہ امت میں کوئی شخص بھی آپؐ کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتا تو پھر کسی خلیفہ یا والی کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ کو پاداش کے لئے پیش کرنا کسرِ شان سمجھے، یا یہ کہ جب حکومت انھیں سزا دے تو وہ ناپسندیدگی کا اظہار کرے۔ حضرت عثمانؓ کے مخالفین بھی یہ دلیل پیش کیا کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کو قصاص کے لئے پیش فرمایا تھا اور حضرت عمرؓ نے بھی حکام سے رعیت کو قصاص دلایا تھا، ان کا حضرت عثمانؓ سے یہی مطالبہ تھا۔ مگر حضرت عثمانؓ نے (موجودہ) ان کا مطالبہ منظور نہ کیا۔ جن لوگوں نے تاجدارِ دو عالمؐ کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ آپؐ خود کو کسی وصف میں بھی دوسروں سے بالاتر نہ سمجھتے تھے۔ سوائے اس وصف کے جس کی رُو سے خدائے تعالےٰ نے آپؐ کو برتری عطا فرمائی تھی۔ یعنی یہ کہ خدا نے آپ پر وحی نازل فرمائی تھی۔ آپؐ لوگوں سے مشورہ کرتے تھے۔ اُن کے مشوروں کو قبول فرماتے تھے۔ آپؐ دوسروں کے شانہ بشانہ شریکِ جنگ اور شاملِ صلح ہوتے تھے۔ آپؐ نے تعمیرِ مسجد کے موقع پر لوگوں کے ساتھ مسجد بنانے میں حصہ لیا۔ ان کے ساتھ خندق کھودی۔ اور جب لوگوں نے کھُدائی یا تعمیر کی کلفت و شدت دور کرنے کے لئے کوئی نغمہ الاپا تو آپؐ نے اس میں بھی شرکت فرمائی۔ بہرحال آپؐ نے پتھر اُٹھائے۔ مٹی ڈھوئی اور اپنے آپ کو ایک عام فرد سمجھا جسے فضیلت صرف یہی تھی کہ خدا نے اسے وحی و نبوت سے سرفراز فرمایا تھا۔ لہٰذا جس قدر امتیاز خدا نے دیا تھا اس سے بڑھ کر آپؐ نے اپنے بارے میں کبھی کچھ خیال نہ فرمایا۔ کتبِ سیرت و سنن میں مروی ہے کہ آپؐ نے مرض الموت کے دوران میں پوچھا کہ میرے یہاں مسلمانوں کے مال میں سے کوئی بچی کھچی شئے تو نہیں پڑی رہ گئی؟ اس پر گھر سے کچھ سونا (چند دینار) لایا گیا جو آپؐ نے لوگوں میں تقسیم فرما دیا۔ جب آپؐ نے رحلت فرمائی تو آپؐ کے گھر میں نہ سونا تھا نہ چاندی۔ آپؐ خود بھی اس بارے میں بہت سخت تھے۔ پھر اس ضمن میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے جو ہدایات تھیں وہ بھی سخت تھیں، اور بموجب "مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی"، آپ اپنی خواہش نفسانی کے تحت کچھ نہ کہتے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا کہ اپنے آپ کو دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر کوئی ترجیح نہ دی بلکہ اپنے اہلِ بیت کے لئے بھی وہی طریقہ اختیار فرمایا جس پر خود پابند تھے۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا۔

عدل و مساوات کی مثالیں

نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِیَاءِ لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ۔

"ہماری نبیوں کی برادری کا یہ دستور ہے کہ وہ کسی وارث کے لئے اپنا مال نہیں چھوڑتے، ہم جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔"

اسی بناء پر جب حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں اپنے والد محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث فدک کا مطالبہ کرنے کے لئے تشریف لائیں تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کا مطالبہ منظور نہ کیا اور انہیں یہی فرمانِ نبوی سنایا۔

بہر حال رسولِ خدا کی سیرت کا بنیادی پہلو یہ تھا کہ ہر ایک کے ساتھ عدل روا رکھا جائے۔ خواہ اس عدل کا تعلق عامۃ الناس کے باہمی معاملات و مسائل سے ہو خواہ آپ کی ذاتِ گرامی اور عامۃ الناس سے یا آپ کے اہلِ بیت اور عوام الناس سے، آپ کے بعد صاحبین (حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ) نے حتی المقدور آپ کی روش اور آپ ہی کا طریقہ اختیار کرنے کی کوشش

خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ کا طریق کار

کی۔ بلکہ حضرت عمرؓ نے تو اپنی بساط سے بھی کچھ بڑھ کر کرنا چاہا۔ ان کا ارادہ تھا کہ مسلمانوں کی امامت و قیادت کی پابندی کرنے نیز ان کے معاملات کی دیکھ بھال میں اپنا وقت اور کوشش صرف کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے روزی بھی کماتے رہیں۔ چنانچہ لوگوں نے ایک روز دیکھا کہ خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ کچھ سامان اٹھائے بغرض تجارت بازار کی طرف تیز تیز جا رہے ہیں، ویسے ہی جیسے خلیفہ مقرر ہونے سے قبل عام مسلمانوں کی طرح ان کا معمول تھا۔ مسلمانوں کو ان پر ترس آ گیا۔ خود انھوں نے بھی محسوس کیا کہ خلافت اور کسب معاش کی ذمہ داریوں سے بیک وقت عہدہ برآ ہونے کی ان میں سکت نہیں ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق مختلف روایات بیان کی جاتی ہیں۔ بہر حال مسلمانوں نے بیت المال میں سے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ مگر اس وظیفہ کی مقدار زیادہ نہ تھی۔ وہ اتنی ہی تھی کہ ان کا اور ان کے اہل و عیال کا گزارہ ہو سکے۔

حضرت ابوبکرؓ کی روش بالکل وہی تھی جس پر رسولِ خدا گامزن رہے تھے۔ لہٰذا وہ بھی اس بات سے ڈرتے تھے کہ مبادا ان کی وفات ہو جائے اور ان کے گھر میں اموالِ مسلمین کا کچھ حصہ پڑا رہ جائے۔ اسی خوف کے پیشِ نظر انھوں نے آلِ ابوبکرؓ کو وصیت کر دی کہ ان کے گھر میں مسلمانوں کی جو چیز بھی پڑی ہے وہ حضرت عمرؓ کے حوالے کر دی جائے۔ چنانچہ ایسی تمام اشیاء حضرت عمرؓ کے حضور پیش کی گئیں جنھیں اپنے سامنے دیکھ کر حضرت عمرؓ رو پڑے۔ جب انھیں اپنی تحویل میں لینے لگے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے انھیں اس سے منع کیا۔ لیکن انھیں اپنے رفیقِ محترم کے بارے میں اتنی ہی احتیاط ملحوظ تھی جتنی خود اپنی ذات کے بارے میں۔ انھیں یہ بات گوارا نہ ہوئی کہ حضرت ابوبکرؓ جب خدا کے حضور پیش ہوں اور ان سے امانتوں[1] کے بارے میں پوچھا جائے تو وہ خدا کو یہ جواب دیں کہ میرے اہلِ خاندان نے وہ سب چیزیں حضرت عمرؓ کے حوالے کی تھیں مگر انھوں نے ان کے لینے سے انکار کر دیا تھا۔

---

[1] مومن کے پاس جو کچھ بھی ہو وہ اسے امانت سمجھتا ہے۔

سرورِ عالم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ کی احتیاط کا یہ عالم تھا، دونوں کی نظروں میں عمل کی اس درجہ اہمیت تھی کہ جہاں گناہ واقع نہ ہوتا انھیں وہاں بھی خوف گناہ لاحق رہتا۔ وہ ان امور میں بھی تنگی و تکلیف محسوس کرتے تھے جن میں عام متقی اور پاک دل لوگوں کے ضمیر کوئی مضایقہ محسوس نہیں کرتے۔ اگر حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کچھ مدت اور رہتی تو ایسی

خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کا طریق کار

کتنی عجیب و غریب باتیں ہمارے سامنے آتیں۔ لیکن چونکہ حضرت عمرؓ کی مدت خلافت دس سال سے متجاوز تھی۔ لہٰذا، ہمارے سامنے ایسے ایسے واقعات آتے ہیں کہ جنھیں لوگ بمشکل باور کر سکتے ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ راویوں نے حضرت عمرؓ کے بارے میں افراط و مبالغہ سے کام لیا ہے اور وہ سختیاں اور سخت گیریاں ان کی طرف منسوب کی ہیں جو ان میں نہ تھیں؛ لیکن جو لوگ کتب سنن و طبقات اور تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں وہ بغیر کسی دشواری کے سمجھ سکتے ہیں کہ کیا کچھ راویوں نے بڑھایا ہے اور کون سے واقعات و حوادث ایسے ہیں جو حضرت عمرؓ کی سیرت و طبیعت اور مزاج سے ہم آہنگ ہیں۔ بلاشک حضرت عمرؓ حدود الٰہی کی اقامت کے بارے میں لوگوں کے ساتھ انتہائی سختی روا رکھتے تھے۔ لیکن خود وہ اپنی ذات پر اس سلسلہ میں جو تشدد برتتے تھے وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ سختی سے بدرجہا زیادہ تھا۔ میں نہیں جانتا کہ تاریخ انسانی کسی ایسے شخص کی مثال پیش کر سکے جو حضرت عمرؓ کا سا زندہ حساس، محتاط اور گناہ سے خائف ضمیر رکھتا ہو۔ جو اپنے حق میں ان باتوں سے بھی ڈرتا ہو جن میں ڈرنے کی کوئی بات نہ ہو، ان امور سے بھی ابا کرتا ہو جن سے ابا نہیں کیا جاتا، اور اپنی ذات پر ایسی سختیاں کرتا ہو جو صرف ایک اولوالعزم انسان ہی کر سکتا ہے۔

لوگوں کو معلوم ہے کہ عام الرمادہ (قحط سالی) کے دوران میں مسلمانوں کو تنگی و سختی میں مبتلا دیکھ کر حضرت عمرؓ بھی عوام کے شریکِ حال ہو گئے اور عوام میں سے بھی ان لوگوں کے جو بہت زیادہ قحط سے متاثر اور پریشان حال تھے۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ ان کے معاشرہ میں عوام کو گھی میسر نہیں آ رہا لہٰذا، انھوں نے اپنے اوپر گھی حرام کر کے خشک روٹی اور تیل پر قناعت کر لی۔ اور جب تیل نے نقصان پہنچایا تو انھیں خیال آیا کہ اگر اسے پکا لیا جائے تو شاید اس کی حدت کم ہو جائے۔ اور نسبتاً زیادہ آسانی سے کھایا اور ہضم کیا جا سکے۔ لہٰذا، انھوں نے ہدایت کی کہ تیل کو پکا لیا جائے۔ لیکن جب پکا ہوا تیل کھایا تو وہ اور بھی زیادہ تکلیف دہ اور مضر صحت ثابت ہوا۔ یہاں تک کہ آپ کی رنگت میں فرق آگیا۔ مسلمان یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ مگر انھیں روک نہ سکتے تھے۔ کیونکہ انھوں نے عہد کر رکھا تھا کہ جب تک عامۃ الناس کو راحت نصیب نہ ہوگی وہ بھی راحت اندوز نہ ہوں گے۔

حضرت عمرؓ کے دل میں ہرگز کبھی یہ خیال نہ گزرتا تھا کہ وہ اس عظیم سلطنت کے مہتمم و منتظم ہیں جس کی حدود و ثغور دور دراز تک پھیلتی چلی جا رہی ہیں، بلکہ اپنی حاکمیت کو دل ہی دل میں ایک اعجوبہ اور حیرت انگیز امر سمجھتے تھے۔ تنہا ہوتے تو

اپنے آپ سے کہتے "کیا کہنے تمہارے اے ابن خطاب! تم امیر المؤمنین بن گئے ہو"۔ انھوں نے اس بات کو کبھی نہ بھلایا کہ وہ اسلام سے قبل اپنے والد خطاب کے اونٹ اور بکریاں چرایا کرتے تھے۔ وہ اپنے اونٹ چرانے کا قصہ لوگوں کو سناتے۔ وہ مقامات دکھاتے جہاں ان کے اونٹ چرتے تھے۔ ان سختیوں کا تذکرہ بھی کرتے جو جانور چرانے میں کسی قسم کی کوتاہی پر اُن کے والد کی طرف سے اُن پر ہوتی تھیں۔ حضرت عمرؓ مسلمانوں کے کسی کام سے جی نہ چُراتے تھے خواہ وہ کتنا ہی سخت اور مشکل کیوں نہ ہوتا۔ ایک روز لوگوں نے دیکھا کہ وہ صدقے کے اونٹوں کے باڑے میں ہیں اور اونٹوں کو گن گن کر بڑی باریک تفصیلات سے ان کے حلیے اور نشانات بتا رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ یہ چیزیں حضرت علیؓ کو بتا رہے ہیں اور حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ کو اور حضرت عثمانؓ اس عبارت کو رجسٹر میں درج کر رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ کی اس کاوش اور باریک بینی سے حضرت علیؓ نے حیرت و مسرت کا اظہار کرتے ہوئے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی جس میں بنت شعیبؑ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہتی ہیں :-

يَاَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ۝ (۲۸/۲۶)

ابا جان! اسے (موسیٰ کو) ملازم رکھ لیجئے کیونکہ بہترین شخص جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہو سکتا ہے جو قوی بھی ہو اور امانتدار بھی۔

آیت تلاوت کر چکنے کے بعد حضرت علیؓ نے فرمایا اور وہ قوی امین یہی ہیں (یعنی حضرت عمرؓ) اسی طرح ایک روز لوگوں نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ چرواہوں اور عام لوگوں کی طرح صدقہ کے اونٹوں کے خارشتی نشانوں پر قطران مل رہے ہیں تاکہ وہ زخم ٹھیک ہو جائیں۔ اس عمل میں انہیں نہ کوئی دقت محسوس ہوتی تھی نہ عار۔ ان کی یہ شدت اپنی ذات تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اپنے اہل و عیال کو بھی اس میں مبتلا کر کے تنگ حال کر دیا تھا۔ چنانچہ آپ جب کبھی لوگوں کو کسی بات سے منع کرتے اور اس کے کرنے والے کو سزا کی دھمکی دیتے تو اپنے افراد خاندان کو جمع کر کے کہتے، میں نے لوگوں کو فلاں بات سے منع کر دیا ہے اور انہیں متنبہ کر دیا ہے کہ خلاف ورزیٔ حکم کرنے والے کو سزا دی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ لوگ تمہارے اور میرے باہمی رشتہ سے واقف ہیں لہٰذا، اگر تم میں سے کسی نے اس حکم کی خلاف ورزی کی اور مجھے معلوم ہو گیا تو اسے دگنی سزا دوں گا۔ عام الرمادہ (قحط سالی) میں وہ اپنے افراد خاندان کے کھانوں کی بڑی سخت نگرانی کیا کرتے تھے۔ اگر کسی کے کھانوں سے تمول کی بُو آتی تو اسے نہایت سختی سے منع فرماتے تھے۔ اپنے اور اپنے اہل و عیال پر اس سخت گیری کے بعد انھیں اس امر میں کوئی باک نہ تھا کہ وہ عوام پر بھی اسی انداز سے حکومت کرتے جس کی تعریف ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے "سختی جس میں کرخت تشدد نہ ہو، نرمی جس میں کمزوری اور ضعف نہ ہو"۔

روایت ہے کہ ایک روز حضرت عمرؓ مسلمانوں میں مال تقسیم کر رہے تھے۔ آپ کے گرد لوگوں کا بڑا ہجوم تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بھی وہاں تشریف لے آئے انھیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے جو نسبت تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔ فتح فارس میں ان کی جانبازیوں اور نمایاں کارناموں سے سب آگاہ تھے بہر حال حضرت سعدؓ ہجوم کو چیرتے ہوئے حضرت عمرؓ کی جانب

نکل آئے۔ لیکن جونہی قریب پہنچے تو حضرت عمرؓ نے ان پر کوڑا اٹھاتے ہوئے کہا "تم نے حکومت الٰہیہ کا خوف و احترام نہیں کیا۔ لہٰذا، میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ حکومتِ الٰہیہ بھی تمہارا خوف و احترام نہیں کرے گی"۔

غرضیکہ حضرت عمرؓ کو لوگوں کے مابین اپنی ذات، اپنے خاندان اور عوام کے مابین مساوات قائم رکھنے کا اتنا شدید خیال رہتا تھا۔ اور یہ سب باتیں ان کی اسی روش کی تصویر ہیں جو ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔

لیکن حضرت عمرؓ کی زندگی کا یہ پہلو سخت گیری اور شدت کے لحاظ سے سب سے زیادہ آسان پہلو تھا۔ ان کی اصلی شدت تو اس عمومی سیاست میں ابھر کر سامنے آتی ہے جسے انھوں نے اپنی خلافت کا دستور العمل بنا کر خود کو اس کا پابند کر لیا تھا، اس سیاست کی ابتداء انھوں نے صحابہ کرامؓ میں سے سربرآوردہ مہاجرین و انصار سے کی، یہ وہ صحابہؓ تھے جنھیں اسلام میں سبقت اور رسولِ اکرمؐ کے ہاں امتیازی منزلت حاصل تھی۔ مسلمانوں کے جملہ امور کی بست و کشاد انہی کے ہاتھ میں تھی۔ خود حضرت عمرؓ انہی عمومی کارروائیوں میں ان کے سامنے جوابدہ ہوتے تھے اور چھوٹے بڑے معاملات میں ان سے مشورے لیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ گو وہ ان صحابہؓ پہ والی مقرر ہوئے ہیں لیکن وہ ان سب سے بہتر و فائق نہیں ہیں۔ ان امور کے باوجود انھیں یہ فکر دامنگیر رہتی تھی کہ ان افراد کے ساتھ کون سا طرزِ عمل روا رکھا جائے۔ چنانچہ انھوں نے ان صحابہ کرامؓ کے حق میں نرمی بھی برتی اور احتیاط بھی۔ انھیں اپنا جلیس و مصاحب، مقرب و ہمدم اور مشیر بنا لیا لیکن ان سے ہمیشہ محتاط بھی رہے کہ ان (صحابہ) کے خلاف یا خود ان کی جانب سے کوئی فتنہ برپا نہ ہو جائے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ان سب کو مدینہ میں روک لیا اور بغیر اجازت انہیں مدینہ سے باہر جانے کی آزادی نہ دی۔ انہیں اسلامی مفتوحہ علاقوں میں بھی بغیر اجازت کے جانے سے منع کر دیا۔ وہ ڈرتے تھے کہ مبادا لوگ ان صحابہ کرامؓ کے حلقہ بگوش ہو کر کسی آزمائش میں نہ پڑ جائیں نیز خود انہیں لوگوں کی عقیدت سے غلط فہمی نہ ہو جائے ان کو خطرہ تھا کہ ان صورتوں میں اُمت کے لئے نقصان دہ نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ بات اکثر صحابہ خصوصاً مہاجرینؓ کو سخت ناگوار گزرتی تھی (جس کا ثبوت یہ ہے کہ جونہی زمامِ اقتدار حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں میں آئی انھوں نے یہ پابندی ہٹا دی۔ لہٰذا، صحابہ کرامؓ اطراف ملک میں پھیل گئے اور خلافتِ عثمانؓ کے بارے میں کامل مسرت کا اظہار کیا لیکن ابھی بمشکل چند ہی برس گزر پائے تھے کہ وہ اس اجازت سے زچ پڑ گئے اور آخر وہی فتنہ برپا ہو گیا جس کا حضرت عمرؓ کو خدشہ رہتا تھا) حضرت عمرؓ نے ان بزرگوں میں سے ہر ایک کا وظیفہ ان کے مرتبہ و مقام، سبقت بہ اسلام اور رسولؐ خدا سے نسبت و قرابت کے مدِ نظر مقرر کر رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کو جو وظائف دیئے جاتے ہیں وہ ان کی ضروریات کے لئے کافی ہیں اور انھیں مزید کاروبار کی تلاش سے مستغنی کرتے ہیں۔ بایں ہمہ وہ کمائی کے لئے دیگر ذرائع اختیار کرتے تھے۔ ان میں سے بہت سے تجارت کے لئے سفر کرتے تھے، اس طرح ان کے سرمایہ میں بہت اضافہ ہو رہا تھا۔ مگر وہ لوگ جوں جوں امیر ہوتے گئے ان کی بخشش و عطا بھی بڑھتی گئی،

حضرت عمرؓ انھیں اکتسابِ زر سے منع نہ کرسکتے تھے۔ کیونکہ وہ لوگ عہدِ نبویؐ میں بھی اسی طرح سوداگری کرتے اور کماتے رہتے تھے۔ اور آپؐ نے انہیں کبھی منع نہ فرمایا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ صحابہ کرامؓ اور دوسرے مسلمانوں میں تقسیم ہونے والے مالِ غنیمت اور سالانہ وظائف کا مشاہدہ فرماتے تو آپ کو یہ صورتِ حال تسلی بخش نہ معلوم ہوتی نہ آپ کا دل اس سے خوش ہوتا۔ اور آپ یہ فرمایا کرتے تھے: "اگر یہ بات جو مجھے اب معلوم ہوئی پہلے سوجھ گئی ہوتی تو میں امیروں سے ان کی ضرورت سے زائد دولت لے کر فقراء میں تقسیم کر دیتا" اور اگر حضرت عمرؓ کچھ مدت اور زندہ رہتے تو ممکن تھا کہ تاریخ اسلامی ان کے ہاتھوں اس معاملہ میں حیرت انگیز اقدام کا مشاہدہ کرتی۔

بہر حال حضرت عمرؓ کے عہد میں فتوحات کی بدولت اموالِ مسلمین میں اس قدر اضافہ ہوا کہ شروع میں حضرت عمرؓ حیران سے ہوئے اور انھوں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ ساتھیوں میں سے حضرت علیؓ کا مشورہ موروثی دستور کے مطابق تھا جو اس دَور کے بدلے ہوئے حالات سے ہم آہنگ نہ تھا۔ ان کی رائے تھی کہ جو اموال موصول ہوں سب کے سب تقسیم کر دیئے جائیں اور سال کے خاتمہ پر بیت المال کا ایک ایک درہم و دینار مستحقین کے پاس جا چکا ہو۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ مال کی افراط نظر آرہی ہے اگر اسے سنبھالا نہ گیا تو معاملہ میں ابتری پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ آخر کار حضرت عمرؓ نے اس معاملہ میں جو اقدام فرمایا اس کا واقعہ مشہور ہے آپ نے رجسٹر مرتب کر کے لوگوں کے وظائف مقرر کر دیئے جو کچھ بچ رہتا تھا اسے (حضرت عثمانؓ کی رائے کے مطابق) مسلمانوں کے مصالح عامہ کی خاطر بیت المال میں جمع کر دیتے تھے۔

بہت جلد حوادثاتِ زمانہ نے یہ ثابت کر دیا کہ حضرت عثمانؓ کی رائے صحیح تھی۔ کیونکہ وہی حقیقتاً ایک متمدن یا مائل بہ تمدن سلطنت کے احوال کے لئے مناسب و موزوں رائے تھی۔ چنانچہ جب قحط سالی آئی تو حضرت عمرؓ کو بیت المال میں اتنا کچھ مل گیا جس کے ذریعہ صوبوں سے آنے والی مدد کے پہنچنے تک کی حالت بخوبی سدھاری جا سکتی تھی۔ حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ فی الحال تو ہم بیت المال سے مسلمانوں کی پرورش کر رہے ہیں لیکن اگر بیت المال میں کچھ نہ رہا تو ہر کھاتے پیتے شخص کے گھر میں اس کے افرادِ خاندان کی تعداد کے برابر فقراء داخل کر دیئے جائیں گے۔ اور جب تک سب مسلمانوں کو رزق مہیا نہ ہو جائے ہم اسی طریق پر کاربند رہیں گے۔

حضرت عمرؓ کی مالی سیاست کا یہ پہلو تو سب سے آسان اور نرم حیثیت رکھتا ہے گو اس میں بھی ان کی انتظامی صلاحیتیں اُبھر کر سامنے آگئی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں عدل کو ترجیح دینے اور عوام کے ساتھ نرمی و مہربانی کرنے کا بڑا وافر

حضرت عمرؓ کی مالی سیاست

حصہ ملا تھا۔ لیکن ابھی ان کی مالی سیاست کا ایک دوسرا پہلو بالکل مخفی ہے جسے حضرت عمرؓ نے اختیار کیا اور وہ جس میں بہت آگے بڑھ گئے تھے اور میرا خیال ہے کہ دنیا کی

متمدن اور ترقی یافتہ قومیں آج وہاں تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں جس مقام پر حضرت عمر فاروقؓ اس زمانہ میں پہنچے تھے لیکن یہ متمدن قومیں آج بھی اس مقام تک سخت جدوجہد اور مشکلات کا مقابلہ کئے بغیر نہیں پہنچ سکیں گی۔

حضرت عمرؓ علانیہ اس خیال کے حامی تھے کہ غنیمت اور جزیہ و خراج سے جمع ہونے والا تمام مال جملہ مسلمانوں کی ملک ہے۔ لہٰذا، اس میں رعیت کے کسی فرد کو دوسرے فرد پر فوقیت حاصل نہیں ہے اور نہ کسی گروہ کو دوسرے گروہ پر کوئی فضیلت ہے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ اس مال کی حفاظت اور پھر مستحقین میں اس کی تقسیم کی ساری ذمہ داری ان کے سر پر عائد ہوتی ہے لہٰذا، فرمایا کرتے تھے کہ صدقہ کے اونٹوں میں سے اگر کوئی اونٹ کسی دور دراز مقام پر بدک کر بھاگ جائے یا اسے کوئی گزند پہنچے تو میں ڈرنے لگتا ہوں کہ اگر خدائے تعالےٰ روزِ محشر مجھ سے پوچھے گا تو میں کیا جواب دوں گا۔ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اگر میں زندہ رہا تو کوہ صنعاء کے گڈریئے کو بھی اس کا حصہ رسد ضرور پہنچے گا۔

بہرحال اس مال سے ہر ایک کا وظیفہ مقرر تھا۔ مرد۔ عورت۔ بچہ۔ بوڑھا اور معذور سب کا حصہ الگ الگ متعین تھا۔ حضرت عمرؓ کا گمان تھا کہ انھوں نے یہ سب کر چکنے کے بعد مطلوبہ عدل قائم کر دیا ہے لیکن ایک رات وہ ایک گھر کے پاس سے گزرے۔ وہاں ایک بچہ رو رہا تھا۔ آپؓ اپنے خیال میں گزر گئے۔ دوسری بار گزرے تو بچہ اب بھی رو رہا تھا۔ آپؓ نے بچہ کی ماں سے بچے کے رونے کا سبب پوچھا اس نے یوں ہی جواب دے دیا۔ تیسری بار گزرے تو بچہ پھر بھی رو رہا تھا۔ اس مرتبہ انہوں نے بااصرار دریافت کیا۔ اس پر عورت نے کہا کہ وہ بچے کا دودھ چھڑا رہی ہے۔ کیونکہ جب تک بچوں کا دودھ نہ چھڑایا جائے حضرت عمرؓ اس کا وظیفہ نہیں مقرر کرتے۔ جب حضرت عمرؓ نے یہ بات سنی تو سخت پریشان و مضطرب ہوئے۔ اور صبح ہوتے ہی آپ نے اعلان کرا دیا: "کہ بچوں کا دودھ چھڑانے میں جلدی نہ کی جائے۔ ہم نے ہر مسلمان بچے کا وظیفہ اس کے یوم ولادت ہی سے مقرر کر دیا ہے"۔

حضرت عمرؓ وصولیٔ صدقات کے ضمن میں ہمیشہ حکمِ خداوندی پر عمل کرتے تھے مگر پھر بھی اس کی وصولی و تقسیم میں انتہائی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ سب کو معلوم ہے کہ ایک روز ایک بدوی نے رسولِ خدا سے دریافت کیا تھا کہ کیا خدا یہ حکم دیتا ہے کہ آپ اغنیاء سے مال لے لیں اور اسے فقراء میں تقسیم کر دیں؟ تو رسولِ خدا نے فرمایا تھا "ہاں"—— اسی لئے حضرت عمرؓ نے اپنے تمام کارندوں کو شدید ہدایت کر رکھی تھی کہ تمام عرب قبائل میں وصولیٔ صدقہ کے موقعوں پر عدل کو مدِنظر رکھیں اور ہر قبیلہ کا صدقہ وہاں کے فقراء میں اس طرح بانٹ دیں کہ وہ گداگری سے بے نیاز ہو جائیں اس کے بعد جو کچھ بچے وہ ہمراہ لائیں اور ان کے حوالے کر دیں۔ جب کارندے یہ بقیہ مال لاتے تھے تو آپ اسے بڑی احتیاط کے ساتھ ان مدوں میں خرچ کرتے تھے جو خدا نے قرآن میں مقرر فرما دی تھیں۔ چنانچہ آپ آیتِ صدقات میں بیان کردہ مدوں کے مطابق فقیر، مسکین،

مسافر وغیرہ کی اعانت کرتے تھے۔

اس وقت میرے پیش نظر نہ اشتراکیت (سوشلزم) ہے اور نہ اشتمالیت (کمیونزم) کیونکہ حضرت عمرؓ نہ اشتراکی تھے نہ اشتمالی، وہ تو حکومت کا نظام ان بنیادوں پر استوار کرنا چاہتے تھے جس پر اسے حضور اکرمؐ اور قرآن مجید نے رکھا تھا۔ اور انھوں نے دولت رکھنے کی اجازت بھی حسب اجازت رسولِ خدا و قرآن مجید دی تھی۔ میرے پیش نظر وہ عدل اجتماعی ہے جو ملکیت اور سرمایہ داری کے خاتمہ کے بغیر بھی عمل میں لایا جاسکتا ہے۔ اور جیسے جدید جمہوریتیں ملکیت داروں اور سرمایہ داروں کے حقوق کی حفاظت کرتے ہوئے برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

مجھے لارڈ بیورڈگ کی وہ اسکیم یاد آرہی ہے جس میں انھوں نے حکومت پہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ عوام کی زندگی، روزی صحت، کاروبار اور عزت کی کفیل بن جائے۔ اس طرح کہ نہ انھیں ذلت برداشت کرنی پڑے نہ ان کی محنتوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے۔ نہ وہ بے کاری کا شکوہ کریں۔ مجھے یہ بھی نظر آرہا ہے کہ عہدِ حاضر میں جمہوریت اس ترقی اور بلند بانگ دعوؤں کے باوصف عدل اجتماعی کو حسب دل خواہ عملی جامہ پہنانے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ اور اس کے ساتھ ہی جب میری نظر حضرت عمرؓ اور اس سلسلہ میں اُن کی کامیاب مساعی پر جاتی ہے تو اس شاعر کی تصدیق کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں ہوتا ہے جس نے حضرت عمرؓ کے مرثیہ میں آپ کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا:۔

جَزَى اللّٰهُ خَيْرًا مِنْ إِمَامٍ وَ بَارَكَتْ
يَدُ اللّٰهِ فِي ذَاكَ الْأَدِيْمِ الْمُمَزَّقِ
فَمَنْ يَجْرِ أَوْ يَرْكَبْ جَنَاحَيْ نَعَامَةٍ
لِيُدْرِكَ مَا أَدْرَكْتَ بِالْأَمْسِ يُسْبَقِ
قَضَيْتَ أُمُوْرًا ثُمَّ غَادَرْتَ بَعْدَهَا
بَوَائِقَ فِيْ أَكْمَامِهَا لَمْ تُفَتَّقِ

خدائے تعالےٰ اس امام کو بہتر بدلہ دے اور اس شہید کے اعمال میں برکت دے، اب اگر کوئی خود دوڑے یا شتر مرغ (جیسے تیز رفتار پرند) پر سوار ہو کر یہ چاہے کہ کل (گزشتہ) جو آپ نے کیا ویسا ہی وہ کر دکھائے تو وہ آپ سے پیچھے ہی رہے گا۔ آپ نے بہت سے معاملات فیصل کئے اور بہت سی آفتوں کو سر بند ہی چھوڑ دیا۔

---

[۱] اصل سوال عدل و احسانِ اجتماعی ہے نہ کہ اشتراکیت و سرمایہ داری۔ لیکن سرمایہ داری کی موجودگی میں عدلِ اجتماعی ممکن کس طرح سے ہے!

حضرت عمرؓ حکام و عمال کے حق میں نرمی یا درگذر سے کام نہ لیتے تھے بلکہ وہ اُن کی شدید نگرانی کیا کرتے تھے۔ جسے بھی عامل مقرر کرتے اس کے مال کا حساب تقرری کے وقت بھی کرتے اور برطرفی کے وقت بھی۔ اور پھر جو فرق نظر آتا اسے دو حصوں میں بانٹ دیتے ایک حصہ عامل کو دے دیتے اور ایک حصہ بیت المال میں داخل کرا دیتے۔ اس کے علاوہ حضرت عمرؓ لوگوں کے ساتھ اپنے عمال کے طرزِ عمل کا مطالعہ بھی بہت قریب سے کرتے تھے۔ اپنے عمال کو خفیہ و علانیہ شدید ہدایات کرتے رہتے تھے کہ وہ مسلمانوں کو جانی و مالی کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ بعض اوقات وہ اپنے والیوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے تم نے لوگوں کو غلام سمجھنا کب سے شروع کیا ہے حالانکہ ان کی ماؤں نے انھیں آزاد جنا ہے (یعنی آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے)

حضرت عمرؓ روزمرہ کے پیش آنے والے معاملات میں ان صحابۂ کرامؓ سے مشورہ لیتے رہتے تھے جو مدینہ منورہ میں مقیم تھے۔ حج کے دنوں میں تمام عمال کو وہاں پہنچنے کی تاکید ہوتی تھی۔ آپ لوگوں کو حج کراتے تھے اور عمال سے ان کی رعیت کے بارے میں اور رعیت سے ان کے عمال کے متعلق باتیں دریافت فرماتے۔ پھر ہر معاملہ کو اس کی صحیح جگہ پر رکھتے۔ میں تو یہاں تک اعتقاد رکھتا ہوں کہ اگر حضرت عمرؓ کچھ مدت اور زندہ رہ جاتے تو وہ مسلمانوں کے لئے ایک مستقل اور مستحکم "نظامِ شوریٰ" قائم کر جاتے جو عوام کو ہر قسم کے فتنہ و اختلاف سے محفوظ رکھتا اور عمال کو ہر نوع کے جور و ستم سے باز رکھتا

یہاں میں حضرت عمرؓ کی اس پختہ کاری و جانسوزی کا ذکر نہیں کرتا جس سے کام لے کر انھوں نے مسلمانوں کے معاملات کا انتظام و انصرام کیا تھا اور جس کے سبب انہوں نے دور دراز کے علاقے فتح کئے۔ نئے نئے شہر بسائے ایک بہت وسیع و عریض سلطنت عربیہ و اسلامیہ قائم کر دی، کیونکہ میں حضرت عمرؓ کی تاریخ قلمبند نہیں کر رہا، نہ میں سرسری طور پر ان کی سوانح حیات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد صرف اتنا ہی کہ اس طریقِ کار کی وضاحت کر دوں جسے رسولِ خدا نے اختیار فرمایا اور جس پر آپ کے بعد حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے کاربند ہونے کی کوشش کی۔ اس طریقِ کار کا تمام تر دار و مدار خالص و مطلق عدل پر تھا۔ ایسا عدل جو راہِ حق میں کسی ملامت گر کی ملامت سے ہراساں نہیں ہوتا۔ اور جس کے قائم کرنے والے کو یقین ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ روز و شب کے ہر لمحہ اور ہر گھڑی میں ہر طرف سے اسے دیکھ رہا ہے۔ اور ہر پوشیدہ و ظاہر شے اس کی نگاہوں کے سامنے ہے اور وہ اس سے ہر بات میں محاسبہ کرے گا۔ پھر دوسری طرف وہ یہ بھی جانتے تھے کہ لوگ مجھ پر کڑی نگاہ سے تنقید کرتے ہیں۔ اور اس طرح کڑی نگاہ سے تنقید کرنے کی انھیں صرف اجازت ہی نہیں بلکہ یہ ان لوگوں کا فرض بھی ہے۔ ان پر واجب ہے کہ خلیفہ کی اس وقت تک اطاعت و فرمانبرداری کریں جب تک کہ وہ راہِ راست پر قائم رہے اور جب وہ انحراف کرے تو ان کا فرض ہے کہ اسے راہِ راست پر لا کھڑا کریں۔ اگر خلیفہ کی سیرت میں انھیں کوئی بات مشکوک نظر آئے تو فوراً اس

کی وضاحت چاہیں تاکہ اس کا اتباع علیٰ وجہ البصیرت کرسکیں۔ ان پر لازم ہے کہ وہ خلیفہ کو مشورہ دیں تو پوری طرح غور و پرداخت کر کے دیں اور اگر مخالفت کریں تو عزم کے ساتھ اور جواز کا ثبوت رکھتے ہوئے۔

ایک سوال؟ کیا یہ طرزِ عمل جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا تھا اور جس پر کاربند رہنے کی حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے حسبِ مقدور کوشش کی تھی انسانی فطرت[1] کے موافق تھا جس میں خودغرضی طمع اور حرص کے وہ عناصر موجود ہوں جو فوری منفعت اور دُنیاوی اغراض و مقاصد کے طالب ہوتے ہیں؟ اور کیا اس طرزِ عمل میں اتنی دیر باقی رہنے کی سکت تھی[2] کہ وہ لوگوں کے طبائع کو بدل کر انھیں ان بلند مثالی مقامات پر لے جائے جن کی طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے دعوت دی تھی؟

———— (۰) ————

[1] "انسانی فطرت" کے متعلق فاضل مصنف بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں جس میں دُنیا ایک مدت سے مبتلا چلی آرہی ہے۔ قرآن کی رُو سے "انسانی فطرت" کوئی چیز نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر انسان کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے تو وہ جبلت جو دیگر حیوانات اور انسان کی طبعی زندگی میں مشترک ہے اسے مفادِ خویش کے حصول اور تحفظ پر اکساتی رہتی ہے۔ لیکن اگر اس کی روحی کی روشنی میں) مناسب تعلیم و تربیت کی جائے تو یہ اس سے بلند اقدار کے حصول کے لئے پست مفاد کو چھوڑ دینے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ قرآن یہی چاہتا اور کرتا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

[2] اس نظام میں یقیناً یہ سکت تھی بشرطیکہ اسے (بعد میں) جاری رکھنے والے اپنے اوپر وہی پابندیاں اور سختیاں روا رکھتے جو اُن کے پیش روؤں نے اپنے اوپر روا رکھی تھیں۔ (طلوعِ اسلام)

باب سوم

عہدِ فاروقیؓ تک حکومت کا انداز و نوعیت

(مصنف نے سابقہ باب کے اخیر پر جو دو سوال اٹھائے ہیں؛ ربط و تسلسل کا تقاضا تھا کہ زیرِ نظر باب میں ان سوالات کے جواب براہِ راست سامنے آتے۔ لیکن اس کے لئے مصنف نے دوسرا اندازِ اختیار کیا ہے اور بعنوان دگر ان کا جواب بالواسطہ دیا ہے۔ ان کا یہ انداز غور و فکر چاہتا ہے۔) (طلوعِ اسلام)

اوّل الذکر سوال کا جواب دینے کے لئے سب سے پہلے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اس حکومت کی نوعیت کیا تھی جس کی بناء رسولِ خدا کے مدینہ منوّرہ میں ہجرت کر آنے کے وقت پڑی اور جو اُس وقت سے لے کر شہادتِ عمرؓ تک مسلمانوں میں نفاذ پذیر رہی؟ بعض افراد ظاہری باتوں سے دھوکا کھا کر یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ حکومت یا بالفاظِ دقیق یہ نظامِ حکومت جو اس قلیل عرصہ کے لئے قائم رہا تھیاکریسیؔ (THEOCRACY) تھی جس میں اوّل و آخر ہر معاملہ میں "دین" پر اعتماد کیا جاتا تھا، اور چونکہ اس خاص دور میں دین تمام تر منزّل من اللہ وحی پر مشتمل تھا لہٰذا، اس رائے کے ماننے والوں کا یہ خیال ہے کہ حکومت جو اُس عہد میں مسلمانوں میں رائج تھی اس کے سارے اختیارات خدا اور صرف خدا کی طرف سے عطا ہوتے تھے۔ لہٰذا، ان کے خیال کے مطابق ان اختیارات میں لوگوں کا کوئی دخل نہ تھا۔ انھیں نہ اس میں شریک ہونے کا حق حاصل تھا نہ اس پر اعتراض کرنے کا۔ نہ وہ اس کی کسی چھوٹی یا بڑی بات پر اظہارِ ناپسندیدگی کر سکتے تھے۔ ان کے خیال میں اس امر کی واضح تر دلیل یہ ہے کہ اس سلطنت کی بنیاد حکمِ الٰہی کے بموجب رسولِ خدا نے رکھی تھی۔ اللہ تعالیٰ ہی نے ہجرتِ مدینہ کا حکم دیا تھا۔ خدا ہی

ؔ تھیاکریسی اس نظامِ حکومت کو کہتے ہیں جس میں بادشاہ یا مذہبی پیشوا اپنا ہر حکم خدا کے نام سے منواتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسلام کو ایسی حکومت سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ (طلوعِ اسلام)

نے مسلمانانِ مکہ کو یہ دعوت دی تھی کہ وہ آپؐ کے ہمراہ ہجرت کریں۔ اور خدا ہی نے آپؐ کو بذریعہ وحی امورِ حکومت کے مجملات ومفصّلات عطا کئے تھے۔ سورۂ "والنجم" میں آتا ہے۔

مَاضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی ۝ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ۝ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝ (۵۳ / ۲-۴)

تمہارا رفیق (رسولِ اکرمؐ) نہ بے راہ چلا نہ بہکا۔ اور نہ وہ اپنی ذاتی خواہش سے بولتا ہے۔ یہ نازل کی جانے والی وحی کے سوا اور کچھ نہیں۔

خدا نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ خدا و رسولِ خدا کی اطاعت کریں۔ یہ بات بھی واضح کر دی کہ جب تک وہ اپنے باہمی اختلاف میں رسولِ خدا کو حکم نہ مانیں گے اس وقت تک ان کا ایمان کامل نہیں ہے۔ مزید برآں ان کا کہنا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ رسولِ خدا کے خلیفہ تھے حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان دونوں راشد اماموں کو حکومت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ملی تھی اور رسولِ خدا کو وہ حکومت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔

لہٰذا، ثابت ہوا کہ اس دور کا نظامِ حکومت بتمام وکمال نظام تھیا کریٹک تھا۔ مجھے اس میں کوئی شک نظر نہیں آتا کہ یہ خیال حقیقت اور صواب سے بہت دور ہو گیا ہے۔ یقیناً اسلام اوّل و آخر ایک دین اور ضابطۂ حیات ہے۔ اس نے لوگوں کے لئے حدود اللہ اور احکاماتِ خداوندی بیان کرنے میں پہلے توحید اور پھر تصدیقِ رسالت سے ابتداء کرتے ہوئے انھیں دنیا و آخرت میں کامیابی کا راستہ بتایا، ان کو اپنے کردار و سیرت میں نیکی اور بھلائی کا حکم دیا۔ لیکن بایں ہمہ اسلام نے نہ اُن کی آزادی کو سلب کیا نہ اُن کی قوتِ ارادی کو ختم کیا اور نہ اُن کے معاملات کو اپنی تحویل میں لے کر انھیں بے دست و پا بنایا۔ بلکہ اس نے مقررہ حدود کے اندر رہتے ہوئے انھیں پوری آزادی دے دی۔ اسلام نے تمام کرنے کی باتیں یا نہ کرنے کی باتیں انھیں گن کر نہیں بتائی تھیں، بلکہ انہیں عقلِ بینا اور دلِ ہوشمند دے کر کُلی اجازت دے دی کہ وہ حتی المقدور بھلائی، رفاہ عامہ، راستی اور مصالح خاصہ کی خاطر سرگرمِ عمل رہیں۔

شوریٰ

خدا تعالیٰ نے حضورِ اکرمؐ کو یہ حکم دیا تھا کہ مسلمانوں سے حکومت کے معاملات میں مشورہ لیا کریں اگر حکومت محض وحیِ آسمانی ہی پر مبنی ہوتی تو آپ ہر معاملہ کو حسبِ حکمِ الٰہی فیصل کیا کرتے نہ کسی سے مشورہ لیتے اور نہ اپنے دوستوں میں سے کسی کو اپنا رازدار و مشیرِ کار بناتے۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا ارشادِ باری تعالیٰ تو یہ ہے:-

وَلَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِکَ ص فَاعْفُ عَنْھُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَھُمْ وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ ج (۳ / ۱۵۹)

اور اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے گرد سے ہٹ گئے ہوتے ۔ لہٰذا، ان سے درگزر کیجئے اور ان کے لئے مغفرت طلب کیجئے اور ان سے ہر امر میں مشورہ لیا کیجئے۔

یہ آیت کریمہ واقعۂ اُحد کے بعد اتری تھی۔ لیکن اس آیت کے نزول سے قبل بھی آپؐ نے غزوۂ بدر میں اپنے اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مشورہ قبول فرمایا تھا۔ اس وقت جبکہ آپؐ نے میدان بدر میں لشکر کو ایک جگہ پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا تھا تو بعض صحابۂ کرامؓ نے دریافت کیا کہ آیا یہاں بحکمِ خداوندی کی تعمیل میں ڈیرہ ڈالا گیا ہے۔ یا یہ آپؐ کی اپنی صوابدید ہے۔ آپؐ نے فرمایا

شورائیہ

یہ میری اپنی صوابدید ہے۔ اس پر آپ کو یہ مشورہ دیا گیا کہ مسلمانوں کو اس مقام سے ہٹا لیا جائے کیونکہ وہ مصالحِ جنگ کے لئے موزوں نہ تھی۔ اور کسی ایسی جگہ اُترا جائے جو موزوں ہو اور پانی سے قریب ہو۔ پھر جنگ بدر کے بعد بھی آپؐ نے قیدیوں کے بارے میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مشورہ تسلیم کر لیا تھا۔ چنانچہ اس پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے قرآن مجید میں یہ تادیب نازل ہوئی ۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ (۸/۶۷) ۔

کسی نبی کو زیب نہیں دیتا کہ اس کے پاس جنگی قیدی ہوں تا وقتیکہ وہ ملک پر غلبہ حاصل نہ کر لے۔ تم دنیوی دولت چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے۔

اسی طرح جنگِ احد کے لئے جب رسولؐ اللہ کو قریش کے کوچ کا علم ہوا تو آپؐ کی رائے یہ تھی کہ شہر بند ہو کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے اور میدانِ جنگ میں نہ پہنچا جائے۔ لیکن آپؐ کے اصحابؓ نے بالخصوص انصار نے اصرار کیا کہ دشمن کا مقابلہ میدان میں کیا جائے۔ چنانچہ آپؐ نے ان کی رائے کو قبول فرما لیا۔ اور خود لباس بند ہونے کے لئے گھر میں تشریف لے گئے۔ اس دوران میں مسلمانوں کو احساسِ ندامت ہوا کہ انھوں نے رسولؐ خدا کو ایسی بات پر مجبور کیا تھا جو آپؐ کو پسند نہ تھی۔ چنانچہ آپ مسلح ہو کر باہر تشریف لائے تو صحابہؓ نے معذرت چاہی اور آپؐ کی رائے پر عمل پیرا ہونے کی اجازت مانگی۔ مگر آپؐ نے ارادہ بدلنے سے انکار کر دیا اور اپنے عزم پر گامزن ہو گئے۔ اگر ہر معاملہ اور ہر جزئی بات کے متعلق بھی وحیِ آسمانی نازل ہوا کرتی تو مسلمان آپؐ کو ہرگز کسی ایسی بات پر مجبور نہ کر سکتے تھے جو آپؐ کی مرضی کے خلاف ہوتی۔ اور آپؐ کسی حالت میں بھی اُن کی بات نہ مانتے۔ اسی طرح جب غزوۂ احزاب میں آپؐ نے خندق کھودنے کا حکم دیا تھا تو آپؐ نے صحابۂ کرامؓ کے مشورہ اور ان کی رائے پر بھروسہ کر کے ہی دیا تھا۔

ان معاملات اور ان کے علاوہ بہت سے دیگر مواقع پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرامؓ سے مشورے لئے۔ کبھی خوشی سے ان کی رائے مان لی اور کبھی ان کی خوشنودی کے لئے اپنی رائے کو واپس لے لیا۔ "صلح حدیبیہ" کے موقع

پر رسولِ خدا نے صحابہؓ کے ساتھ قریش کی پیش کردہ شرائط کے بارے میں مشورہ کیا جن میں یہ بھی شرط تھی کہ اس سال مسلمان بیت اللہ کی زیارت کئے بغیر واپس چلے جائیں تو آپؐ کے صحابہ کرامؓ کو قریش کی یہ شرط ناگوار گزری۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مطالبہ مان لینے پر اصرار فرمایا۔ بعض صحابہؓ آپؐ کے اصرار پر جزبز ہوئے۔ حضرت عمرؓ سے نہ رہا گیا تو انہوں نے کہا۔ "ہم اپنے دین کے معاملہ میں دوسروں سے دب کر معاملہ کیوں کریں"؟ یہ سُن کر آپؐ کے چہرہ پر غصّے کے آثار نمودار ہوئے اور آپؐ نے فرمایا: "اَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ وَعَبْدُہٗ" میں اللہ کا رسول ہوں اور اُس کا بندہ بھی ہوں"۔ تب مسلمان سمجھ گئے کہ یہ بات محض صلاح و مشورہ کے طور پر نہیں کی جا رہی ہے بلکہ اس معاملہ میں آسمان سے وحی اُتر چکی ہے۔ چنانچہ سب نے توبہ کی اور اپنے نبیؐ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اس بارے میں جو وحی نازل ہوئی تھی اُس کی ابتداء

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ (۴۸:۱)

بالتحقیق ہم نے آپ کو واضح اور بین فتح عطا کی۔

سے ہوئی تھی۔

اگر ہم ان تمام مواقع کا ذکر کرنا چاہیں جہاں رسولِ خدا نے اپنے صحابہؓ سے مشورہ کیا تھا تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔ تاہم جو تھوڑے سے واقعات ہم نے نقل کئے ہیں یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ عہدِ نبویؐ میں تمام احکامِ سلطنت تفصیلاً آسمان سے نہیں اُترتے تھے۔ وحی آسمانی نبی کریمؐ کے صحابہ کرامؓ کو ان کے مصالح عامہ و خاصہ کی جانب متوجہ کرتی تھی لیکن وہ انھیں موافق حق و خیر اور عدل کی حدود کے اندر رہ کر اپنے معاملات حسبِ دلخواہ فیصل کرنے کی آزادی سے محروم نہیں کرتی تھی۔ اور شاید ہمارے پاس اس ضمن میں سب سے بڑا اور ناقابلِ تردید ثبوت یہ ہے کہ قرآن نے سیاسی امور کی مجملاً یا تفصیلاً کسی قسم کی تنظیم نہیں کی۔ وہ تو عدل و احسان اور اقرباء پر شفقت کا حکم دیتا ہے۔ فحاشی بدعملی اور گناہ و معصیت سے منع کرتا ہے۔ قرآن مجید نے عمومی حدود مقرر کر دی ہیں۔ اور یہ بات مسلمانوں پر چھوڑ دی کہ وہ ان حدود سے تجاوز کئے بغیر اپنے معاملات اپنی مرضی اور مشوروں سے طے کریں۔ خود رسولِ خدا نے بھی اپنے طرزِ عمل سے نہ حکومت کے بارے میں کوئی نظام معین فرمایا اور نہ سیاست کے متعلق۔ اور جب آپؐ کا مرض شدید ہو گیا تو اُس وقت بھی آپؐ نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہ کیا جو آپؐ کے بعد مسلمانوں کا خلیفہ بنتا۔ آپؐ نے فقط یہ کیا کہ حضرت ابوبکرؓ کو نماز میں لوگوں کی امامت کرنے کا حکم دے دیا۔ لہٰذا، بعد میں مسلمانوں نے کہا کہ اگر رسولِ خدا نے ہمارے دینی معاملات کے لئے حضرت ابوبکرؓ کو پسند کیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم انھیں اپنے دنیوی معاملات کے لئے نہ پسند کریں۔ اگر مسلمانوں کے لئے کوئی نظام سیاسی آسمان سے اُترا ہوتا تو قرآن اس کا ضرور تعیّن کرتا یا رسولِ اکرمؐ اس کی حدود اور اس کے اصول ضرور بالوضاحت بیان کرتے۔ اور مسلمانوں پر فرض کر

دیا ہو تاکہ وہ اس نظام پر ایمان لائیں اور بغیر بحث و مجادلہ بلا نزاع و مخالفت اس کے آگے سرِ تسلیم خم کریں۔

بیعت دوسری چیز جو یہ ثابت کرتی ہے کہ عہدِ نبویؐ اور عہدِ ابوبکرؓ و عمرؓ میں نظامِ حکومت منزل من اللہ نہ تھا وہ بیعت ہے جس کی طرح خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں ڈالی تھی۔

سب جانتے ہیں کہ حضورؐ نے صحابہ کرامؓ کو جنگ بدر میں حصہ لینے کے لئے دعوت دی لیکن کسی کو اس میں حصہ لینے کے لئے حکم نہیں دیا۔ آپ نے انھیں ترغیب و تشویش دلانے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالےٰ کا یہ وعدہ بھی یاد دلایا کہ اس جنگ میں دو کامیابیوں میں سے ایک ضرور ان کے ہاتھ آئے گی، اس لئے کہ آپؐ نے انصار سے معاہدہ کیا تھا کہ آپؐ ان کو جنگ کے لئے باہر نہ لے جائیں گے، اور یہ کہ انصار آپؐ کی تکلیف و پریشانی کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ جب غزوۂ بدر کا وقت آیا تو آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ فرمایا اور انھیں موقع دیا کہ وہ اس بارے میں اپنے مشورہ سے مطلع کریں اور آپؐ اس وقت تک ان کو جنگ میں نہ لے گئے جب تک کہ خود انصار کے سربرآوردہ لیڈروں نے یہ نہ کہہ دیا "اگر آپؐ ہمیں سمندر میں لے چلیں گے تو بھی ہم آپؐ کے پیچھے لگے رہیں گے" اس وقت آپؐ نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ آپؐ کے ساتھ جنگ میں نکلنے کے لئے راضی ہیں۔

یہ بھی معلوم ہے کہ "حدیبیہ" کے موقع پر حضرت عثمانؓ کے خلاف قریش کی دغابازی کی خبر سُن کر بھی آپؐ نے اپنے صحابہؓ کو قریش کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا۔ اور جب آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے اس معاملہ میں بیعت لی تو سب نے جان دینے کا عہد کیا۔ اس وقت بھی اگر کوئی چاہتا تو اس کو بیعت سے الگ رہنے کی اجازت تھی۔ لیکن سبھی نے بیعت کر لی کیونکہ انھیں آپؐ پر اور خدا پر ایمان تھا۔ اور خدا و رسول کی پکار پر وہ لبیک کہنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ سورۂ فتح میں اس بیعت کے بارے میں خدائے تعالےٰ نے کہا ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ (فتح)

بے شک جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں گویا وہ خدا سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں پر ہے۔

قرآن میں اور بھی کئی آیات ہیں جو مومنین کو جہاد کا شوق دلاتی اور جہاد پر اُبھارتی ہیں نیز ان لوگوں کا تذکرہ کرتی ہیں جو جہاد میں شریک نہ ہوئے مگر اللہ و رسولؐ نے ان کا عذر قبول کر لیا۔ ان آیات میں کچھ ایسے لوگوں کا ذکر بھی ہے جنھوں نے عذر ہائے لنگ تراشے اور جہاد سے پہلوتہی کی۔ چنانچہ ان کا کوئی عذر قبول نہ ہوا۔ لیکن اس کے باوجود رسولِ خدا نے انھیں کوئی سزا نہ دی۔ نہ ان کے خلاف ناگوار اقدام کیا۔ آپؐ نے ان سب کا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا کہ وہ چاہے تو سزا دے چاہے تو معاف کر دے[1]۔

---

[1] فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے۔

یہ چیز بھی کم اہم نہیں کہ خلافت کا سارا معاملہ بیعت یعنی رضائے رعیت پہ منحصر تھا۔ چنانچہ بیعت حاکم و محکوم کے مابین ایک عہد نامہ کی صورت اختیار کر گئی۔ خلفاء یہ عہد دیتے تھے کہ وہ حق و انصاف کے ساتھ مسلمانوں پر حکومت کریں گے۔ ان کی مصلحتوں[۱] کا احترام کریں گے اور حتی الوسع رسولِ خدا ہی کی روش پر چلیں گے۔ مسلمان اپنی جانب سے یہ عہد دیتے تھے کہ وہ گوش برآواز رہیں گے۔ سرتسلیم خم کریں گے۔ خیر خواہ و مخلص رہیں گے۔ اور ہر امکانی مدد دیں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کوئی خلیفہ بھی اپنی ذات اور اپنی حکومت کو مسلمانوں پر ایک فرض کی حیثیت سے عائد نہیں کر سکتا تھا تاوقتیکہ وہ مسلمانوں سے یہ عہد نہ کرتا اور مسلمان اس سے یہ پیمان نہ کر لیتے۔ ازاں بعد خلیفہ اس باہمی متبادل عہد کے مطابق ان پر حکومت کرتا۔ یہی سبب ہے کہ اقتدار و حکومت حضور اکرمؐ کی طرف سے بطور وراثت منتقل نہ ہوا، نہ اہلِ بیت میں سے کسی کو اور نہ خود حضرت ابوبکرؓ کو یہ مسند بطور وراثت ملی۔ حضرت ابوبکرؓ کو خلافت اس جماعت کی طرف سے ملی تھی جنھوں نے ان کی بیعت کر کے یہ امانت ان کے سپرد کی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد ان کے لڑکے خلافت کے وارث نہ ہوئے۔ حضرت عمرؓ کو بھی خلافت وراثتاً نہ ملی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین مسلمانوں کے مشورے سے مقرر کیا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ حضرت ابوبکرؓ کی جانب سے مہر زدہ وصیت نامہ لے کر حضرت ابوبکرؓ کی زندگی ہی میں لوگوں کی طرف آئے۔ حضرت عثمانؓ نے لوگوں سے کہا "اس خط میں جو کچھ رقم ہے اس پر آپ لوگ بیعت کرتے ہیں"؟ لوگوں نے کہا "ہاں" کیونکہ انھیں حضرت ابوبکرؓ پر کلی اعتماد تھا۔ وہ ان کی رائے کو پسند کرتے تھے اور جانتے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ ان کے بہی خواہ اور مہربان ہیں۔ فرزندانِ حضرت عمرؓ بھی خلافت کے وارث نہ ہوئے۔ حضرت عمرؓ کو یہ بات پسند نہ تھی کہ ان کے بعد ان کا کوئی بیٹا خلیفہ ہو۔ انھوں نے اپنے بیٹے (حضرت) عبداللہؓ کو رکن "شوریٰ" تو مقرر کیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ ان کا خلافت پہ کوئی حق نہ ہوگا۔ یہی سبب ہے کہ جب حضرت معاویہؓ نے حکومت کو وراثت بنالیا[۲] تو مسلم عوام بہت بگڑے اور انھوں نے کہا کہ امیر معاویہؓ نے خلافت کو ہرقلی اور کسروی حکومت بنا دیا ہے۔ یہ ساری باتیں اگر کسی معاملہ پہ دلالت کرتی ہیں تو وہ صرف یہ ہے کہ عہدِ نبوی کا نظام

---

[۱] (سالم تمنا کی) یہ ٹھیک ہے کہ اسلام میں ہر کام بہ طیب خاطر کیا جاتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ کوئی شخص جو چاہے آپ کو برضا و رغبت اسلامی مملکت کا فرد بنائے اسے پھر اس کا بھی اختیار رہتا ہے کہ مملکت کے جس حکم کی جی چاہے اطاعت کرے اور جس سے جی چاہے انحراف کرے۔ اور اس پر حکومت اس ...... سے کوئی مواخذہ نہ کرے۔ اس طرح تو کوئی نظام بھی قائم نہیں رہ سکتا۔

[۲] یہ مقامات ذرا نازک ہیں اور وسعت اور گہرائی کے محتاج۔

حکومت وہ نہ تھا جس کا تمام تر دارو مدار وحی آسمانی پر ہوتا تھا اور جس میں عوام کی رائے کا کوئی دخل نہ ہوتا تھا پھر جب عہدِ نبوی میں جب کہ آپؐ پر وحی اترا کرتی تھی ایسا طرزِ حکومت تھا تو عہدِ ابوبکرؓ و عمرؓ کے متعلق یہ بہت زیادہ قرینِ قیاس ہے کیونکہ اس وقت تو وحیِ آسمانی کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا تھا۔

وہ لوگ جن کا خیال ہے کہ اسلامی تاریخ کے صدرِ اول کا نظامِ حکومت اللہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا تھا انھیں یہ مغالطہ خلفاء کے خطبوں اور ان کی باتوں کے باعث لگ جاتا ہے۔ پھر خلفاء کے بارے میں لوگوں کی باتیں بھی اس خیال کی تائید کرتی ہیں کیونکہ ان میں اللہ تعالےٰ کا ذکر، اس کے اقتدار اس کے حکم اور اس کی اطاعت کا ذکر ہوتا تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ یہ باتیں اس امر کی دلیل ہیں کہ وہ نظامِ حکومت منزل من اللہ تھا۔ حالانکہ درحقیقت یہ تمام باتیں اگر کسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں تو وہ محض ایک معمولی سی مگر نہایت اہم بات ہے۔ اور وہ یہ کہ خلافت مسلمانوں اور خلفاء کے مابین ایک معاہدہ ہوتا تھا اور یہ اللہ کا فرمان تھا کہ اس کے عہدوں کو جب بھی کئے جائیں پورے کئے جائیں خواہ ان کا تعلق حکومت کے معاملات سے ہو یا اس کے علاوہ دیگر معاملات سے اور خواہ افراد کے باہمی عہد و پیمان سے۔ خدا ہر صورت میں پابندیٔ عہد کا حکم دیتا ہے۔ اور جب لوگ وفائے عہد یا عہد شکنی کرتے ہیں تو خدا کی نگاہ ان کے ضمیروں پر ہوتی ہے اور وہ عہد ایفاء کرنے والوں کو نیک اجر اور عہد شکنی کرنے والوں کو شدید سزا دیتا ہے[1]۔ اس اعتبار سے اسلام اور مسیحیت میں کوئی فرق نہیں کیونکہ اسلام بھی اچھائی کا حکم دیتا ہے۔ برائی سے منع کرتا ہے۔ خیر کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ شر سے روکتا ہے[2]۔ اور چاہتا ہے کہ عوام کے معاملات عدل پر مبنی اور ظلم و جور سے مبرا ہوں۔ بعد ازیں وہ انھیں اجازت دیتا ہے کہ ان مقررہ حدود کے اندر رہ کر اپنے امور کا اہتمام و انضباط جس طرح چاہیں کریں۔ مسیحیت بھی اس پر نہ کچھ اضافہ کرتی ہے نہ کمی۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ سے اس ضمن میں بحث و جدال کیا انھیں آپ نے یہ جواب دیا تھا کہ

---

[1] صرف اتنی سی بات نہیں۔ اسلام میں خلافت سے مراد یہ ہے کہ یہ حکومت ان حدود کے اندر رہتے ہوئے کی جائے گی جو وحی کی رو سے متعین ہوئی ہیں اور کسی کو اس کا حق نہیں ہوگا کہ وہ ان حدود سے تجاوز کرے۔ اسی لئے اس کی اطاعت کو خدا کی اطاعت کہا جاتا تھا جس سے مقصود قوانینِ خداوندی کی اطاعت تھا۔

[2] مصنف نے اس مقام پر غلط مبحث پیدا کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مسیحیت ہی نہیں ہر مذہب خیر (نیکی) کا حکم دیتا ہے اور شر (برائی) سے روکتا ہے۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ خیر کہتے کسے ہیں اور شر ہوتا کیا ہے؟ دین جو ہر نبی کو خدا کی طرف سے ملتا تھا، اس میں خیر اور شر کا ہر مقام پر ایک ہی مفہوم تھا لیکن جب دین میں تحریف ہوگئی تو پھر ہر مذہب میں خیر اور شر کا مفہوم مختلف ہوگیا۔ اب خیر و شر کا حقیقی مفہوم صرف قرآن مجید کے اندر ہے کیونکہ غیر محرف دین اس کے سوا کہیں نہیں۔ مسیحیت کے متعلق مصنف کا نظریہ درست نہیں۔

"اعطوا ما لقیصر لقیصر و ما للہ للہ"

"یعنی قیصر کا حق قیصر کو ادا کرو اور خدا کا[1] خدا کو"۔ اس کا مطلب یقیناً یہ ہے کہ قیصر کو اس کے استحقاق سے بڑھ کر کچھ نہ دیا جائے۔ نیز یہ کہ قیصر اور عامۃ الناس کے باہمی مراسم ظلم و جبر اور خوف پر مبنی نہ ہوں۔

یہ بحث آپ کو ہماری کتاب کے کسی اور مقام پر نظر آئے گی کہ عہدِ عثمانیؓ میں بعض مسلمانوں نے بعض عمال کے اس قول کو کہ مالِ غنیمت و خراج "اللہ کا مال" ہے ناپسند کیا اور اس کی بجائے اسے "مسلمانوں کا مال" کہا، چنانچہ اس قول کی حمایت میں بعض افراد کو کچھ تکالیف کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اگر مسلمان اپنے ابتدائی عہد کے نظامِ حکومت کو محض نظامِ خداوندی ہی تسلیم کرتے ہوتے تو اس بات سے کہ وہ "اللہ کا مال ہے" انھیں انکار نہ ہوتا اور یہی سبب ہے کہ جب لوگوں نے یہ خیال رکھنے کی وجہ سے امیر معاویہؓ پر اعتراضات کیے تو انھوں نے معذرت کرتے ہوئے اس خیال کو ترک کر دیا کہ لوگ اور ان کی ملکیتیں اللہ کی ہیں، وہ اللہ کے بندے ہیں لہٰذا، ان کا مال اللہ کا مال ہے[2]؟

لہٰذا، ثابت ہوا کہ عہدِ نبویؐ کا نظامِ حکومت مقدس تھیاکریٹک نہ تھا۔ بلکہ وہ لوگوں کے باہمی معاملات کا ایک حصہ تھا جس میں خطا و ثواب کی گنجائش تھی اور انھیں اجازت بھی تھی کہ وہ اچھی اور بری بات کو پہچانیں اور اپنے فیصلہ کے مطابق بھلے کام پر خوشی اور برے پر ناراضی کا اظہار کریں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے عہد کا نظامِ حکومت جمہوری تھا۔ یہ بات الفاظ کی حد تک تو صحیح ہے مگر دقتِ معانی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس مقام پر ضروری ہے کہ جمہوریت کا مفہوم پوری طرح سمجھ لیا جائے۔ پھر دیکھا جائے کہ وہ نظامِ حکومت جمہوری تھا یا نہیں؟

کیا صدرِ اوّل کی اسلامی حکومت جمہوری نظام پر مشتمل تھی؟

جمہوریت کا مفہوم ہے عوامی حکومت جو عوام کے ذریعہ عوام کی خاطر کام کرے[3]۔ گویا اس طرزِ حکومت میں عوام کو حق ہے کہ وہ اپنے حکام کو آزادانہ انتخاب کے ذریعہ چن کر مقرر کریں، آزادانہ ان کے تصرفات کی نگرانی کریں تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ وہ منتخب افراد

---

[1] یہ نظریہ دینِ خداوندی کے اصول کے خلاف ہے اس لئے یہ حضرت عیسیٰؑ کا قول نہیں ہو سکتا۔ دین میں قیصر کا وجود ہی نہیں رہتا۔

[2] بات تو یہی درست ہے کہ مومن کا مال اللہ کا مال ہوتا ہے لیکن اس سے لوگوں نے جو مفہوم لے لیا تھا وہ صحیح نہیں تھا۔ (طلوعِ اسلام)

[3] جمہوریت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ عوام کو قانون سازی کا کلیتہً اختیار حاصل ہے اور ان کے اس اختیار پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہے۔ لیکن قرآن کی رو سے حکومت کو قانون سازی کا حق صرف ان حدود کے اندر رہتے ہوئے حاصل ہوتا ہے جو وحی کی رو سے متعین ہوتی ہیں اور جو غیر متبدل ہیں۔ یہ ہے بنیادی فرق دورِ حاضرہ کی جمہوریت اور اسلامی نظام میں۔

محض عوامی مصالح کو مدِنظر رکھتے ہیں اپنی ذاتی اغراض کو نہیں۔ نیز جب عوام کو ان پر اعتماد باقی نہ رہے یا ان کی حکومت پر راضی نہ رہیں تو انھیں اس حکومت کو برطرف کر دینے کا بھی حق حاصل ہوگا۔

زمانہ قدیم میں یونانیوں نے جمہوریت کا یہی مفہوم سمجھا تھا۔ اور آج اس دورِ جدید میں بھی جو قومیں نظامِ جمہوری کی قائل ہیں اس کے یہی معنی مراد لیتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ لفظ "عوام" کی تعبیر میں اختلاف رہا ہے۔ مثال کے طور پر یہ لفظ یونانیوں کے یہاں محدود مفہوم کا حامل تھا جس کی رُو سے اہلِ وطن کی ایک مختصر سی جماعت پر اس کا اطلاق ہوتا تھا جنہیں بلا شرکت غیرے جملہ حقوق حاصل ہوتے تھے۔ اور جو قانون کے سامنے مساوی حقوق رکھتے تھے، حالانکہ دوسری طرف ملک کی بڑی اکثریت ان حقوق سے محروم تھی جنھیں امورِ مملکت میں سے کوئی حصہ بھی نہیں ملتا تھا۔ "انقلابِ فرانس" کے بعد اس لفظ میں وسعت آگئی جس کی وجہ سے اہلِ وطن کی بہت بڑی تعداد سیاسی حقوق سے متمتع ہونے لگی۔ مگر اس کے باوجود جملہ افراد اس میں بھی شامل نہ تھے کیونکہ یہ معاملہ ایک خاص مقدار مال کی ملکیت یا ایک معینہ ٹیکس کی ادائیگی یا ایک خاص درجہ تعلیمی کی تحصیل تک محدود رہا۔ گزشتہ صدی کے آخر میں اسے اور وسعت نصیب ہوئی اور جملہ بالغ مردوں کو یہ حقوق دیئے گئے۔ موجودہ صدی میں اسے اور بھی وسعت حاصل ہوئی یعنی ہر بالغ مرد و زن کو یہ حقوق مل گئے۔ علاوہ ازیں جمہوریت کے، خواہ وہ محدود ہو خواہ وسیع، کچھ مقررہ نظام ہیں جن میں اس امر کی ضمانت ہوتی ہے کہ عوام اپنے حقوق سے متمتع ہوں۔ اپنے حکام کو منتخب کریں اور ان کے تصرفات کی نگرانی کرتے رہیں۔ اگر آپ جمہوریت کی ان باریکیوں کو مدِنظر رکھیں تو پھر یقیناً کہنا پڑے گا کہ مسلمانوں کی تاریخ کے صدرِ اول کا نظام جمہوریت نہ تھا۔ کیونکہ عوام کو انتخابِ حکام کا حق بایں دِقّتِ معنی حاصل نہ تھا۔ رسولِ خدا کو پیغاماتِ الٰہی کی تبلیغ اور عوام کے لئے ایک ایسے نظام کے قائم کرنے کی خاطر جو عدل و انصاف پر مبنی ہو لوگوں نے منتخب نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ رسولِ خدا کو اللہ تعالےٰ نے بھیجا تھا پھر لوگوں میں سے جس نے چاہا آپؐ کا اتباع کیا اور جس نے چاہا مخالفت کی، اگر ہم یہ کہیں کہ آپؐ کا اتباع کرنے والے صحابہ کرامؓ نے آپؐ کو اپنا حاکم منتخب کر لیا تھا تو یہ انتخاب حاکم بھی ایسا نہ تھا جیسے جمہوری نظام میں عمل میں آتا ہے کیونکہ صحابہ کرامؓ نہ آپؐ پر کڑی نگہہ رکھ سکتے تھے نہ محاسبہ کر سکتے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ جب کبھی رسولِ خدا ان سے مشورہ طلب فرماتے تو وہ آپؐ کو مشورہ دے دیتے۔ ویسے کبھی کبھار وہ بے طلب بھی مشورہ دے دیتے تھے۔ آپؐ چاہتے تو وہ مشورہ مان لیتے چاہتے تو رد کر دیتے۔ اسی طرح دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کا نظامِ حکومت بھی جمہوری نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کیونکہ حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کو جملہ مسلمانوں نے نہیں بلکہ مسلمان مہاجرین و انصار کے ایک اربابِ حل و عقد گروہ نے منتخب کیا تھا۔ اور شروع میں ان لوگوں میں اس انتخاب کے متعلق کچھ اختلاف بھی رونما ہوا تھا۔

ان عربوں سے جو رسولِ خدا کی وفات کے وقت مسلمان ہو چکے تھے اور جو مکہ طائف اور صحرا میں آباد تھے حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ

کے انتخاب میں کوئی مشورہ نہ لیا گیا تھا ــــ بلکہ ان دونوں کو صرف اہلِ مدینہ نے منتخب کیا۔ باقی سب مسلمانوں نے اس انتخاب کو تسلیم کر لیا۔ اور اطاعت پر کاربند ہے۔ لہٰذا، اگر اربابِ ارتداد میں سے کسی نے یہ شعر کہہ دیا تو کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ

اَطَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا کَانَ بَیْنَنَا

فَیَا لَعِبَادِ اللّٰہِ مَا لِاَبِیْ بَکْرٍ

ہم نے اختلافات کے باوجود جب تک رسولِ خدا ہمارے اندر رہے آپ کی اطاعت اختیار کر لی تھی۔

مگر اے بندگانِ خدا یہ تو بتاؤ کہ ان کے بعد ابوبکرؓ کو کیسے یہ حق مل گیا ہے ؟

علاوہ ازیں عوام بلکہ خود مہاجرین وانصار کے اس فریق کے پاس بھی کوئی مقرر و معین نظام نہ تھا جس کی رُو سے وہ خلفاء کی روش پر نگرانی رکھتے اور ان کے اعمال دو عادی کا محاسبہ کرتے ــــ ان کی حیثیت یہ تھی کہ وہ خلفاء کے مشورہ طلب کرنے پر مشورہ دیتے تھے خلفاء کبھی سب کو جمع کر کے مشورہ لیتے اور کبھی الگ الگ۔ مہاجرین و انصار کبھی کبھار خلیفہ کو بے طلب بھی مشورہ دیتے تھے، مگر یہ خلیفہ کی مرضی پر منحصر تھا کہ اس مشورہ کو قبول کرے یا رد کر دے۔ بدیں صورت یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قدیم وجدید زمانوں میں فقہ دستوری کی رُو سے جمہوری نظام کی دقیق تعریف کے مطابق مسلمانوں کی تاریخ کے صدرِ اوّل کا نظامِ حکومت جمہوری نہ تھا۔

اور اگر جمہوریت کا عام معنیٰ لیا جائے جس سے مراد یہ ہو کہ حکام اپنے حق میں عوام کی خوشنودی و اعتماد کے محتاج ہوں اور وہ اپنے آپ کو اس امر کا پابند رکھتے ہوں کہ عوام کے ساتھ ایسا سلوک کریں جو عدل و مساوات پر مبنی اور تحکم و جور سے مبرا ہو تو اس صورت میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کے صدرِ اوّل کا نظامِ حکومت جمہوری تھا جس کے لئے مدارج معیار اور حدود متعین نہ تھیں۔[1] اس کے کچھ آثار آپ کو عہدِ عثمانی میں مسلمانوں کو پیش آنے والے فتنوں میں دکھائی دیں گے۔ بعض دیگر حضرات کا خیال ہے کہ اسلام

کیا صدرِ اوّل کا اسلامی نظام انفرادی پادشاہت کا نظام تھا ؟

کے صدرِ اوّل کا نظامِ حکومت ایک عادل انفرادی پادشاہت کا نظام تھا یہی وجہ ہے کہ رسولِ خدا اور آپؐ کے بعد حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کی حکومت میں کوئی بھی ان کا شریکِ کار نہ تھا۔ وہ اپنے بعض اصحاب سے مشورہ لے لیا کرتے تھے جو اپنے مشوروں کا کسی کو لازماً پابند نہ کرتے تھے۔ بایں ہمہ رسولِ اکرمؐ اور حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کے مدِنظر عدل کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس انداز کا طریقِ فکر اس نظامِ حکومت کو کسی حد تک ایسے نظام سے قریب کر دیتا ہے جو عہد

---

[1] حدود اللہ یعنی قرآن کے اصول متعین و غیر متبدل تھے۔

شہنشاہی و قیصری میں اہلِ روما میں مروّج تھا۔ روما کے شہنشاہ یا قیصر حتماً وارثِ سلطنت نہ ہوتے تھے بلکہ ان کی اکثریت بذریعہ انتخاب مسندنشین حکومت ہوتی تھی۔ اور جب کوئی منتخب ہوجاتا تھا تو پھر وہ تمام عمر برسرِ اقتدار رہتا تھا۔ اِلّا یہ کہ انقلاب یا بغاوت و عہدشکنی کے ذریعہ اُن سے حکومت چھین لی جاتی۔ اس رومی نظام اور اس اسلامی نظام میں جو عہدِ نبویؐ میں یا حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کے عہد میں مروّج تھا اگر کوئی فرق تھا تو یہ کہ اس کا دار و مدار محض عدل پر تھا۔ جبکہ رومی شہنشاہ اور قیصر عدل و انصاف کی حدیں اکثر اوقات پھاند جاتے تھے۔ لہٰذا، یہ نظریہ بھی سابقہ دونوں رایوں سے زیادہ وقیع نہیں۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ رومیوں کے یہاں بھی شہنشاہ قیصر کو منتخب کرنے اور ان کے طرزِ عمل کو متعین کرنے کا اختیار دین یعنی مذہب کو حاصل تھا۔ لیکن رومی نظام اور اسلامی نظام میں جو فرق تھا وہ ایک دین اور دوسرے دین کا فرق ہے اسی طرح ایک قوم اور دوسری قوم کا فرق ہے، ایک ماحول اور دوسرے ماحول کا فرق ہے۔ چنانچہ اس دین میں جو رومی شہنشاہوں پہ بالخصوص اور قیصروں پر کسی حد تک طاری تھا وہ پاکیزگی و عظمت نہ تھی جو آسمانی ادیان سے قریب یا دور کی کوئی بھی نسبت رکھتی ہو۔ کیونکہ رومیوں کا دین شگون، فال اور علم اسرارِ غیب کی ایسی باتوں پر مبنی تھا جنہیں ہم آج پڑھ کر ہنستے اور مورد تمسخر بناتے ہیں۔ رومی عوام کی زندگی کا وہ انقلاب جس نے اسے اس کی ابتدائی سادہ زندگی سے نکال کر پیچ دار زندگی تک پہنچایا عربوں کی زندگی کے اس انقلاب سے کسی قسم کی کوئی نسبت نہیں رکھتا جس نے انھیں جاہلیت سے نکال کر اسلام کی آغوش میں ڈالا۔ رومی انقلاب مادّی تھا (بشرطیکہ یہ تعبیر صحیح ہو) جو بتدریج تمدنی ترقی سے ظہور پذیر ہوا۔ لیکن دوسری طرف عربی انقلاب معنوی تھا جو اسلام کی تاثیر کے سبب عربی روح کے تغیر سے وجود میں آیا تھا۔ گویا اس انقلاب کا رُخ اندر سے باہر کی طرف تھا، اور عربی نفس کے بدل جانے سے عربوں کی مادی زندگی میں انقلاب واقع ہوگیا تھا، اس کے برعکس روما کے انقلاب کی رَو باہر سے اندر کی جانب آئی اور اس نے رومیوں کے خارجی احوال کو منقلب کردیا جس کے نتیجہ میں رومی رُوح و ضمیر میں بھی انقلاب واقع ہوگیا۔ مزید برآں ان دونوں کے ماحول میں اتنا ہی اختلاف ہے جتنا اٹلی اور حجاز میں ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اگر رومی شاہی و قیصری نظامِ حکومت اسلام کے صدرِ اوّل کے نظامِ حکومت کے ساتھ کوئی مشابہت نہ رکھتا ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

مجھے جمہوریت کے دور کے رومی نظامِ حکومت اور اس اسلامی نظامِ حکومت میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قائم ہوا تھا تھوڑی بہت مشابہت نظر آتی ہے۔ رومی اپنے قیصروں کو جس طرح منتخب کیا کرتے تھے وہ تقریباً اسی

لہ اگر اس حقیقت کو فراموش نہ کیا جائے کہ اسلامی سربراہِ مملکت ہر حال میں حدود اللہ کا پابند ہوتا تھا تو طرزِ انتخاب کی چنداں اہمیت نہیں رہتی۔

قسم کا طریقہ ہے جس سے کام لے کر مسلمانوں نے اپنے خلفاء کا انتخاب کیا تھا۔ انصار نے جب مہاجرین سے کہا تھا کہ ایک امیر ہماری طرف سے ہو اور ایک تمہاری جانب سے تو انھوں نے کسی حد تک رومیوں ہی کا نمونہ پیش کیا تھا۔ علاوہ ازیں منتخب ہونے کے بعد قنصل کے اختیارات کی عمومیت اور وسعت خلیفہ کے اختیارات سے ملتی جلتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ قنصل کے اختیارات ان قوانین کے پابند ہوتے تھے جنھیں عوامی مجلس قانون کی منظوری کے بعد مجلس شیوخ (پارلیمنٹ) کی منظوری حاصل ہو چکی ہوتی تھی اسی طرح خلیفہ کا اقتدار و تصرف دین کی حدود میں محدود تھا اور صحابہؓ کبارؓ کی آرا کا پابند۔ نیز عامۃ المسلمین کے میلانات و رجحانات کا تابع تھا۔ لیکن ان سب مشابہتوں میں دور از کار تاویلات اور تکلف و تصنع پایا جاتا ہے۔ لیکن جب ہم حکومت کے ان مظاہر کا اضافہ کریں جو قنصل کے گرد محیط تھے اور جن سے خلفاء بالکل آزاد تھے یا ان عناصر کا ذکر کریں جو رومی جمہوریت کے حالات کا اقتضا تھے جن کی رُو سے قنصل کے اختیارات کو محدود کر کے عوام کو اس کے تحکم سے محفوظ کر لیا گیا تھا۔ مثلاً زعماء کے انتخاب کا قاعدہ جن کو عوام اس لئے منتخب کرتے تھے کہ اگر ان پر قنصل کوئی ظلم کرنا بھی چاہے تو زعماء اسے روک لیں۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر ہم ان سب فروق کا ان ظاہری اور مصنوعی مماثلتوں میں اضافہ کر لیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس قلیل المدت عربی نظامِ حکومت اور ان رومی نظامہائے حکومت کے مابین جو عہدِ ملوکیت عہدِ جمہوریت یا عہدِ قیصریت میں نفاذ پذیر تھے کوئی قوی مشابہت نہیں پائی جاتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں نے سیاسی، انتظامی اور جنگی امور میں قیصروں اور کسراؤں کے نظاموں سے بہت کچھ حاصل کیا تھا لیکن یہ اکتساب اس عہد سے جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں بہت بعد میں واقع ہوا۔ بدیں صورت ہمیں اس تشابہ سے جس کی کوئی محکم بنیاد نہیں صرف نظر کر لینا چاہیئے۔

اس طرح یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اس عہد کا اسلامی نظامِ حکومت مطلق العنان حکومت کا نظام نہ تھا۔ نہ ہی وہ یونانیوں کے طرز کی جمہوریت تھا، نہ ہی وہ شاہی یا جمہوری

دراصل اسلامی نظام حکومت ایک جدید طرز کا خالص عربی نظام تھا

یا محدود و مقید قسم کا قیصری نظام تھا جو رومیوں میں مروج رہا۔ بلکہ وہ ایک خالص[1] عربی نظام تھا جس کی عمومی حدود اسلام نے بالوضاحت بیان کر دی تھیں۔ ان حدود کے درمیان جو خلاء رہ گیا تھا اسے مسلمانوں نے پورا کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے کسی مقام پر عربوں میں نثر کے ظہور و ترقی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ قرآن نہ شعر ہے نہ نثر۔ وہ صرف قرآن ہے۔

---

[1] اسے عربی نظام کہنا بھی صحیح نہیں۔ اما تو چیزے دیگری

اس کے اپنے مخصوص اسالیب ہیں جن سے اس نے اشیاء کی تعبیر وصورت کشی کی ہے۔ اس کا اپنا الگ طرزِ بیان اور اندازِ ادا ہے۔ اس میں موسیقی کی بعض ایسی بندشیں ہیں کہ اسے سادہ لوح حضرات شاعری خیال کرنے لگتے ہیں۔ قافیہ کی قیود ایسی ہیں کہ لوگ اسے مسجع سمجھنے لگتے ہیں۔ اس میں آزادی روانی اور ہمواری ایسی ہے کہ بعض دوسرے سیدھے سادے لوگ اسے نثر تصور کرنے لگتے ہیں۔ اسی وجہ سے مشرکینِ قریش فریب کھا گئے اور کہا کہ یہ شاعری ہے۔ مگر قرآن نے ان کی شدید تکذیب کی۔ ایسا ہی جو کہ

قرآن کا انداز

ان لوگوں نے کہا یا جنھوں نے تاریخ نثر کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ خیال کیا کہ وہ عربی نثر کا پہلا مجموعہ ہے۔ بہر حال حقیقتِ واقعہ ان لوگوں کی سخت تکذیب کرتی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی نثر نگار اس کی عبارت کی نقل کرنا چاہے — جیسے کہ بعض نثر نگاروں نے ایسی کوشش کی بھی — تو وہ سوائے اس کے اور کچھ نہ کر سکے کہ ایک تمسخر انگیز و مضحکہ خیز عبارت اس کے مقابلہ میں پیش کر دے۔

یہ میں نے قرآن کے بارے میں کہا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس عہد کے نظامِ حکومت اسلامی کے بارے میں بھی کوئی ایسی ہی رائے پیش کر دوں۔ چنانچہ میری رائے یہ ہے کہ وہ نظامِ ملوکیت نہ تھا کیونکہ رسولِ خدا اور حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کے لئے اگر کوئی بات سب سے زیادہ اذیت ناک تھی تو وہ یہی تھی کہ انھیں بادشاہ خیال کیا جائے۔ وہ نظامِ جمہوری بھی نہ تھا کیونکہ ہماری معلومات کے لحاظ سے جمہوری نظاموں میں کوئی نظام بھی منتخب ہونے والے صدر کو یہ حق نہیں دیتا کہ منتخب ہونے کے بعد اسے موت کے سوا کوئی بھی مسندِ حکومت سے اتار نہ سکے۔ رومیوں کے نقطۂ نظر کے اعتبار سے دیکھیں تو وہ قیصری نظام بھی نہ تھا کیونکہ خلیفہ کو فقط اہلِ لشکر منتخب نہ کرتے تھے۔ لہٰذا، یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ خالص عربی اسلامی نظام تھا جو نہ عربوں سے پہلے کہیں عمل میں آیا نہ ان کے بعد کسی نے ان کی تقلید کی، لیکن یہ سب باتیں ہمیں اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں کرتیں کہ ہم ان اسلامی مسائل کی تحلیل اور اس کی باریکیوں کو سمجھنے کے بعد یہ دیکھیں کہ آیا یہ نظام اپنے اندر باقی رہنے کی صلاحیت رکھتا تھا یا وہ اس قابل تھا کہ جب اس کا ماحول اور حالات بدل جائیں تو وہ بھی منقلب و متغیر ہو جائے۔

اسلامی حکومت کے اجزائے ترکیبی

۱۔ دینی عنصر

سب سے پہلے اس نظام کے اجزائے ترکیبی میں سے ہم دینی عنصر کا مطالعہ کرتے ہیں یہ نظام جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں آسمانی نظام نہ تھا بلکہ یہ انسانی نظام تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ دین سے بہت بڑی حد تک متاثر تھا۔ خلیفہ اپنے ہر امر و نہی اور کسی عمل کے کرنے یا نہ کرنے میں وحی کا پابند نہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ حکمِ الٰہی کا پابند تھا

جس کی رُو سے اُسے حق قائم کرنے، عدلِ عام کرنے، بھلائی اختیار کرنے اور بُرائی سے مجتنب رہنے اور سرکشی و نافرمانی سے باز رہنے کی ہدایت کی گئی ہے[1]۔

یہی وہ وحی ہے جو مسلسل تیئیس سال تک جاری رہی اور صبح و شام مسلمان اس سے آشنا ہوتے رہے وہ قرآن کی صورت میں نازل ہوئی۔ دوسری طرف رسولِ خدا بات چیت میں اس کا ذکر کرتے۔ تیسری طرف آپؐ اسے اپنی عملی سیرت سے ایک قابلِ عمل سُنّت کی صورت میں رواج دیتے۔ اس وحی نے آپؐ کے مصاحبین خصوصی اور دیگر مسلمانوں کے نفوس میں ایک نہایت قوی حساس اور زندہ دینی ضمیر پیدا کر دیا۔ لہٰذا، یہ بات ممکن ہی نہ تھی کہ ایک مسلم، قول و عمل یا غور و فکر میں اس سے پہلو بچا سکتا بلکہ بیداری یا خواب میں بھی وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتا تھا۔ حاکم ہونے کی شکل میں رعیّت سے تعلق اور اس کے معاملے میں۔ اسی طرح رعیت ہونے کی صورت میں حاکم سے تعلق اور اس کے معاملے میں۔ نیز اپنے ہم چشموں کے ساتھ روزمرہ زندگی کے مسائل میں۔ غرض ہر گوشے میں وہ اس ضمیر سے متاثر رہتا تھا۔ اس چیز نے بہت سے لوگوں کو اس غلط فہمی میں ڈال دیا کہ اس عہد کا نظامِ حکومت منزل من اللہ ہوا کرتا تھا۔ بات اس طرح نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ کیفیت خلیفہ و رعایا کی ضمیروں میں جس قدر دینی تاثر تھا اس کے مطابق گھومتی تھی۔

۲۔ دینی ارستقراطیت

اس نظام کا دوسرا عنصر "ارستقراطیت" تھی جس کی بنیاد عُرفِ عام کی رُو سے، نسل، دولت، یا مجلسی قدر و منزلت پر استوار نہ تھی، بلکہ اس کا انحصار ایک ایسی بات پر تھا جو ان سب سے زیادہ اہم تھی۔ وہ بات تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی میں آپؐ کے ساتھ رابطہ و قرب۔ آپ کے ہر امرو نہی کی بلاتردد سمع و طاعت، علاوہ ازیں اوقاتِ صلح و جنگ میں راہِ خدا میں سرگرم رہنا ان شرائط کے باعث اسلام کے ظہور میں آتے ہی ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جسے عوام میں امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ اس طبقہ کے افراد دنیوی حقوق کے معاملے میں خود غرض نہ تھے۔ ان کے دلوں میں کوئی عاجل یا مؤقت نفع کے حصول کی خواہش پنہاں نہ تھی بلکہ وہ طبقہ اس لئے ممتاز تھا کہ رسولِ خدا اسے سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اور اس امر کا اس طبقہ کے سامنے اور عوام الناس کے سامنے اعلان کرتے تھے کہ خدا کو بھی سب سے زیادہ محبت اسی طبقہ کے ساتھ تھی کیونکہ وہ لوگ سب سے پہلے اسلام لائے تھے۔ انھیں راہِ خدا میں اذیتیں پہنچائی گئی تھیں۔ انھوں نے حفاظتِ دین کی خاطر حبشہ اور ازاں بعد مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ انھوں نے اپنے مظلوم بھائیوں کو پناہ دی اور ان کی اعانت کی تھی۔ انھوں نے راہِ خدا میں جان و مال کے ساتھ جہاد کیا

---

[1] مطلب یہ ہے کہ وہ قرآن کے اصولوں کا پابند تھا۔ ان اصولوں کے اندر رہتے ہوئے جزئیات اپنے حالات کے مطابق خود وضع کرتا تھا۔

تھا۔انھوں نے رسولِ خداؐ کا ساتھ کبھی نہ چھوڑا تھا۔آپؐ کے احکام کے سامنے سرِتسلیم خم کیا تھا،آپؐ کے فرمان تحریر کئے تھے غرضیکہ وہ طبقہ انہی لوگوں پر مشتمل تھا جن سے خدا اور رسول کو محبت تھی۔جنہیں عامۃ الناس احترام وعزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔یہ وہ طبقہ تھا جو اپنے آپ کو کسی بڑائی عظمت یا برتری کا مستحق اور اہل نہ سمجھتا تھا ــــ بلکہ اپنے آپ کو دوسرے مسلمانوں کے برابر سمجھتا تھا۔اُن کی یہ خاکساری رسولؐ خدا کی نگہ میں ان کی محبت کو اور بھی بڑھا دیتی تھی حالانکہ یہ طبقہ جن افراد پر مشتمل تھا وہ سب ممتاز گھرانوں میں پیدا نہ ہوئے تھے نہ وہ سب عالی نسب تھے۔اور نہ کسی وسیع دولت کے مالک تھے۔ان میں بعض ضرور متمول اور عالی نسب تھے مگر باقیوں میں کوئی غلام تھا جسے دین کی راہ میں شدائد کا سامنا کرنا پڑا تھا اور جسے بالآخر کسی مسلمان نے خرید کر آزاد کر دیا تھا۔کوئی ایسا درماندہ حال تھا کہ مکہ میں پناہ گزیں ہو کر کسی قریشی قبیلہ کے زیرِ حمایت اور کسی قریشی سردار کے زیر سایہ وقت گزار رہا تھا۔کوئی ایسا تھا جو کبھی مکہ میں آیا اور یہاں امن و روزگار کی صورت دیکھ کر مقیم ہو گیا۔علاوہ ازیں بعض ایسے بھی تھے جن کا نسب ممتاز اور گھرانہ معزز تھا۔لیکن وہ تنگدستی اور بے مائیگی کا شکار تھے۔وہ اپنی قوم میں محترم تھے لیکن معاش کی تنگی کے باعث جس طرح بھی بن پڑتی تھی محنت مزدوری کر رہے تھے۔غرض اس طبقہ میں ان سب قسموں کے افراد شامل تھے۔لیکن اسلام نے حقوق و فرائض کے معاملہ میں سب کو برابر کر دیا تھا۔ان کے امتیاز کا فقط ایک ہی معیار تھا وہ یہ کہ انھوں نے راہِ اسلام میں کس قدر تکالیف برداشت کیں۔مصائب کا کس پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا اور جب رسولِ اکرمؐ نے مالی و جانی مدد مانگی تو انھوں نے کس قدر جانی و مالی مدد دی انہی قربانیوں کی نسبت سے انھیں بڑائی حاصل ہوتی تھی۔

جونہی اسلام پھیلنے لگا اس طبقہ کو قدرتاً امتیاز حاصل ہوتا چلا گیا۔حتیٰ کہ مسلمانوں نے انھیں وہ حقوق دے دیئے جن کا یہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتے تھے۔کیونکہ اس طبقہ کے افراد لوگوں کو دین سکھاتے تھے۔اور بوقتِ ضرورت ہر قسم کا مشورہ دیتے تھے۔عرب قبائل اکثر اوقات رسولؐ خدا سے یہ التماس کرتے تھے کہ کسی ایسے شخص کو ان کے قبیلے میں بھیجیں جو انھیں شعور دین بخشے۔لہٰذا،آپؐ ان میں سے معلم،فقیہہ اور امام کا انتخاب کیا کرتے تھے۔ہوا یہ کہ ہجرت کئے ابھی بمشکل چند ماہ ہی گزرے تھے کہ غزوۂ بدر وقوع پذیر ہو گیا جس کی وجہ سے اسلام کی شان تمام ملکِ عرب میں بلند ہو گئی اور اس کی شوکت کا سکہ سب کے دلوں پر یوں بیٹھ گیا کہ اب وہ اسلام سے مرعوب اور خائف رہنے لگے۔تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ان اشخاص کو جو اس غزوہ میں شریک ہوئے تھے مسلمانوں میں ایک ممتاز طبقہ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔جن افراد کو اس غزوہ کے علاوہ آپؐ کے ہمراہ دوسرے معرکوں میں بھی شرکت کا موقع ملا انھیں اور بھی زیادہ امتیازی شان حاصل ہو گئی۔علاوہ ازیں ان چند اشخاص کو بھی جنہوں نے جنگِ احد میں آپؐ کے دوش بدوش پامردی و استقلال کا ثبوت دیا تھا،امتیاز حاصل تھا۔جب حال یہ ہو کہ رسولؐ خدا

نے ان کی تعریف کی۔ انھیں دوسروں کے لئے نمونہ اور امام بنایا۔ انھیں جنت کی خوشخبری دی اور اعلان کیا کہ آپؐ ان سے راضی اور خوش ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ ان کے امتیاز و احترام کی کوئی حد نہ تھی۔ ان باتوں میں کسی طرفگی یا عجوبہ کا دخل نہیں۔ یہ سب عین فطری اور طبعی امور تھے، اہم بات یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد جبکہ وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور زمین و آسمان کے مابین وحی کے پیدا کردہ قرب کے ختم ہونے کے بعد پھر وہی پہلا سا بُعد واقع ہوگیا[2] تو اصحاب رسول اللہؐ کا یہ ممتاز طبقہ اپنے باہمی تفاوت و مدارج کے باوصف مسلمانوں کے جملہ معاملات کے حل وعقد کا ذمہ دار قرار پاگیا۔

چنانچہ یہی وہ منفرد طبقہ تھا جس میں سے اُمت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ منتخب کیا گیا۔ یہی وہ تنہا طبقہ تھا جس پر خلیفہ اپنے لئے لوگوں کی سمع وطاعت حاصل کرنے کے لئے سہارا لیتا تھا اور یہی وہ واحد طبقہ تھا جس کی طرف خلیفہ مشوروں اور انتظامی معاملوں میں رجوع کرتا تھا۔ لیکن آنحضرتؐ کی وفات کے بعد بات اس حد تک محدود نہ رہی۔ ابھی آپؐ کی وفات پر چند دن کیا چند گھنٹے بھی نہ گزرے تھے کہ اسلام کو ایک نئی قسم کی "اریستقراطیت" کا سامنا کرنا پڑا جو اپنے آپ کو شدّت کے ساتھ حکومت کا مستحق سمجھتی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مسلمان مسئلہ خلافت کے بارے میں صلاح مشورے کر رہے تھے۔ چنانچہ انصار نے کہا ایک امیر ہم میں سے مقرر کیا جائے اور ایک تم (مہاجرین) میں سے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے رسولِ خدا کی ایک حدیث بیان کی کہ

قریشی اریستقراطیت

اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ[2]

"امام قریش میں سے ہوں گے"

اور پھر انصار سے کہا کہ ہم امیر ہوں گے اور تم وزیر۔ انصار نے یہ بات مان لی۔ چنانچہ حضرت سعد بن عبادہؓ کے سوا کسی نے اس پر کوئی تعرض نہ کیا۔

اس وقت سے اسلام میں ایک ایسی "اریستقراطیت" ظہور میں آگئی جس کا قوام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت خصوصی اور قرب سے تیار ہوا اور اس میں بھی حکومت صرف قریش کے قبضے میں رہی اور وزارت و مشورت انصار کو دی گئی۔ اگرچہ مشورہ کا حق ہر مسلمان کو حاصل تھا۔ گویا اس طرح صورت یہ ہوئی کہ قریش کو حکومت بھی ملی اور مشورہ کا حق بھی اور انصار نیز دیگر اہلِ عرب کے لئے صرف مشورہ رہ گیا۔ انھیں حکومت کا حق نہ رہا۔ ضروری ہے کہ اس مقام پر ہم ذرا ٹھہر کر اس

---

[1] قرآن کی موجودگی میں وہ قرب بدستور باقی رہا اور ہے۔

[2] یہ حدیث موضوع ہے اور یہ واقعہ کہ اسے حضرت ابوبکرؓ نے اپنی تائید میں پیش کیا تھا مستبعد ہے۔

ارستقراطیت" کی تحقیق کر کے معلوم کریں کہ آیا حضرت ابوبکرؓ اور ان کے مہاجر اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس کا مفہوم کیا لیا تھا اور ان کے بعد قریش نے اس کا مفہوم کیا بنالیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح نے تمام قریش کو مطلقاً بلا قید زمانہ مستحق خلافت ہرگز قرار نہیں دیا تھا۔ گمان غالب یہ ہے کہ ان کے مدِنظر وہ مہاجرین تھے جنہوں نے اسلام لانے میں سب سے سبقت کی تھی، جو دوسروں سے پہلے ایمان لائے اور جنہوں نے اپنی جان و مال کے ساتھ دعوت اسلام کو پھیلانے میں رسولِ خدا کی اس وقت مدد کی تھی جب کہ آپؐ مکہ میں سخت تنگی اور تکلیف و شدت کے دن گذار رہے تھے۔ ان مہاجرین کی اکثریت قریش پر مشتمل تھی اور جب کبھی مہاجرین کا ذکر قرآن و حدیث اور عوام کی روزمرہ کی باتوں میں انصار کے ساتھ آتا تھا تو پہلے مہاجرین کا نام آتا تھا پھر انصار کا۔ میرا خیال یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے پیش نظر قریش کا یہی ممتاز طبقہ تھا جس کے افراد کو اسلام لانے میں سبقت حاصل تھی۔ جنہوں نے رسولِ خدا کے دوش بدوش مکہ کی پُرفتن زندگی کے دوران میں اور ازاں بعد مدینہ کے پُرشوکت زمانے میں آپؐ کے ساتھ مل کر انصار کی معیت میں جہاد کیا۔

اگر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ قریش کو اس نقطۂ نظر سے سوچتے کہ وہی ایک ایسا قبیلہ ہے جس کا نسب رسولِ خدا کے نسب سے ملا ہوا ہے۔ یعنی اس کا تعلق رسولِ خدا سے رشتہ داری کا ہے۔ تو پھر اس طرزِ فکر کا اقتضاء یہ تھا کہ وہ خلافت کے لئے ایسے شخص کو ترجیح دیتے جو نبی اکرمؐ کا سب سے قریبی رشتہ دار ہوتا۔ ضروری تھا کہ رسولِ خدا کے چچا حضرت عباسؓ یا آپؐ کے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ کو خلافت کا مستحق قرار دیتے جو آپؐ کے داماد بھی تھے اور عہدِ طفلی سے اُن کی پرورش بھی آپؐ ہی نے کی تھی۔ لہٰذا، یہ بات صاف ہوگئی کہ حضرت ابوبکرؓ اور ان کے اصحاب کی "قریش" سے مراد محض مہاجرین تھے اور ان سے بھی بالخصوص وہ حضرات جو مہاجرین میں سے صاحبِ فضل اور اسلام قبول کرنے میں پیش پیش تھے۔ یہ کہنا پرلے درجے کی حماقت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور ان کے اصحابؓ نے قریش سے مراد آنحضرتؐ کی قرابت لی تھی اور اس رشتہ داری کے سبب سے انھوں نے قریش کو امامت کا امتیازی حق دیا تھا۔ کیونکہ اگر یہ بات ہوتی تو طلقائے قریش جنھیں فتح مکہ کے روز عام معافی دے کے آزاد کر دیا گیا تھا حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ اور ابوعبیدہؓ کی نگاہوں میں ان لوگوں سے زیادہ مستحق خلافت ہوتے جنہوں نے آنحضرتؐ اور آپؐ کی دعوت کی حمایت اور مدد کی تھی اور اس اعتبار سے ابوسفیان یا صفوان بن اُمیہ یا حارث بن ہشام انصار کے اُن سربرآوردہ اصحاب کے مقابلے میں خلافت کے زیادہ حقدار ہوتے جنھوں نے مدینہ کو گھر بنایا اور ایمان پر قائم رہے۔ لیکن ہوا یہ کہ قریش نے حضرت ابوبکرؓ کے قول کا وہ مطلب نہ لیا جو وہ چاہتے تھے یا جو اس وقت ان کے اصحاب اس کلمہ سے سمجھے تھے۔ لہٰذا، قریش کو یقین

ہوگیا کہ امامت بلاشرکتِ غیرے صرف خاندانِ قریش کا حق ہے اور یہ حق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ داری کے سبب سے انھیں ملا ہے۔ بلاشبہ قریش نے حضرت ابوبکرؓ کے مفہوم کو سمجھنے میں غلطی کی اور ان کی یہ تاویل دوراز کار تھی۔ اگران کی سمجھ اور ان کی تاویل صحیح ہوتی تو بنو ہاشم کا استدلال سب پر غالب ہوتا۔ لہٰذا وہ اس وقت تک مسلمانوں کی امامت کے سب سے زیادہ مستحق ہوتے جب تک کہ ان میں امامت کا بار اٹھانے کی طاقت رہتی۔

ساتھ ہی یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ اسلام نے کسی کو خاندانی یا قومی بلندی مراتب کے اعتبار سے دوسرے پر مقدم نہیں کیا لوگوں کو خدا کے نزدیک اگر فضیلت دی ہے تو باعتبار تقویٰ۔ اور اسی طرح لوگوں کو باہم ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے تو وہ بھی بروئے تقویٰ یعنی دینی جدوجہد میں بہتر کارگذاری اور کارہائے نمایاں کی انجام دہی کے اعتبار سے ہے۔

ہماری رائے کی صحت پر یہ امر دلالت کرتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ سے کہا گیا کہ کسی کو خلیفہ مقرر کر دیں تو انھوں نے فرمایا اگر حضرت ابوعبیدہؓ زندہ ہوتے تو میں انھیں خلیفہ مقرر کر دیتا اور اگر حضرت سالم مولیٰ حذیفہؓ حیات ہوتے تو انھیں خلیفہ مقرر کر دیتا۔ حالانکہ حضرت سالم مولیٰ حذیفہؓ قریشی نہ تھے۔ بلکہ عربی النسب بھی نہ تھے۔ وہ عہدِ طفلی میں اصطخر سے لائے گئے تھے اور ایک انصاری خاتون نے جو ان کی مالک تھیں انھیں آزاد کیا تھا۔ اور وہ (سالم) ابوحذیفہ کے مولیٰ بن گئے تھے عہدِ نبویؐ میں مسلمان امورِ دینی میں حضرت سالمؓ کی سبقت کے قائل تھے۔ مدینہ شریف میں نبی اکرمؐ کی ہجرت سے قبل جملہ مہاجرین بشمول حضرت عمرؓ کے امامت کے فرائض وہی انجام دیتے تھے۔ حضرت سالمؓ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں یمامہ کی جنگ ارتداد میں شہید ہوئے۔

یہ بات کوئی وزن نہیں رکھتی کہ قریش کا مولےٰ ہونے کی وجہ سے حضرت سالمؓ قریشی تھے۔ لہٰذا، اگر وہ حیات ہوتے اور حضرت عمرؓ انھیں جانشین مقرر کر دیتے تب بھی خلافت قریش سے باہر نہ جاتی۔ یہ باتیں صحیح نہیں ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ مولیٰ کے مابین خواہ کتنے ہی تعلق کیوں نہ ہوں مولیٰ کا رتبہ اتنا بلند کبھی نہیں ہوتا تھا وہ ان آزاد افراد کے طبقہ میں سمجھا جانے لگے جس نے اسے اپنا مولیٰ بنا لیا ہو۔ اور پھر اہلِ عرب کو تو حضرت سالمؓ کا نسب بھی معلوم نہ تھا۔ حتیٰ کہ جب خدا نے یہ حکم دیا کہ موالی کو ان کے آباء کی طرف منسوب کرو تو اس وقت زید کو ان کے باپ حارث کی طرف منسوب کر کے زید بن حارث کہنے لگے تھے کیونکہ اسلام نے سلسلہ متبنّیٰ ختم کر دیا تھا۔ چنانچہ حضرت سالمؓ متبنّیٰ ابی حذیفہؓ کہلا نہ سکے۔ پھر چونکہ ان کے والد کا کسی کو علم نہ تھا لہٰذا، لوگ سالم کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ حضرت سالم صالحین میں سے ہیں۔ بہر حال حضرت عمرؓ ایک شخص کو خلیفۃ المسلمین بنانا چاہتے تھے جو قریش میں سے نہ تھا بلکہ اہلِ عرب سے اگر کوئی تعلق تھا تو محض ولاء کا۔ اس کے باوجود حضرت عمرؓ کو اس میں کوئی حرج نہ معلوم ہوا۔ حق یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی یہ رائے

عین اصول اسلام کے موافق تھی۔ کیونکہ اسلام کسی کو نسب یا پیدائش کی وجہ سے کسی پر فضیلت نہیں دیتا۔ بلکہ اسلام تقویٰ۔ راہِ دین میں خدمت و جان فروشی کے اعتبار سے لوگوں کو ایک دوسرے پر فضیلت دیتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حضرت سالمؓ متقی بھی تھے۔ دین کی خدمت کرنے والے اور راہِ خدا میں جان کی بازی لگا دینے والے بھی۔

بہر حال یہ قریشی ارستقراطیت اچانک نمودار ہو گئی اور لوگوں کو اس کا سان گمان بھی نہ تھا۔ پھر یہ کہ اس ارستقراطیت کو سمجھنے میں غلطی کی گئی۔ حضرت ابوبکرؓ یہ چاہتے تھے کہ امامت اس وقت تک مہاجرین میں رہے جب تک کہ وہ اپنے اندر اس بارگراں کے متحمل ہونے کی پوری صلاحیت و قوت رکھیں۔ لیکن قریش نے اسے بدل کر اپنی خاندانی عصبیت اور منفعت اندوزی کا وسیلہ بنا لیا اور اس طرح اس چیز نے اسلام کے ایک عظیم بنیادی اصول "مساوات بین المسلمین" کو توڑ دیا[۱]۔

جونہی قریش نے یہ قدم اٹھایا اگلا قدم خود بخود اٹھ گیا جس نے مسلمانوں کی زندگی پر نہایت دُور رس اثر ڈالا۔ وہ قدم یہ تھا کہ عربوں کو ان تمام لوگوں پر فضیلت حاصل ہو گئی جو اگرچہ مسلمان ہو گئے تھے مگر صریحاً عربی النسب نہ تھے۔ یہ بات سب پر عیاں ہے کہ قریش نے خلافت کے بارے میں جس اجارہ داری کا دعوےٰ کیا تھا اس نے مسلمانوں کو بے پناہ مصائب اور لامتناہی فتنوں میں مبتلا کر دیا۔ حکومت و اقتدار نیز فضیلت و برتری کے بارے میں عربوں کی اس اجارہ داری کا نتیجہ ہے کہ موالی بنو عباس کی مدد کی وجہ سے زمامِ حکومت بنو امیہ کے ہاتھوں سے نکل کر بنو عباس کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

پہلی مشکل

الغرض صدرِ اوّل کے اسلامی نظامِ حکومت میں دو نمایاں عناصر کارفرما تھے، ایک معنوی جس کا تعلق اس دین سے تھا جو عدل و معروف کا حکم دیتا تھا اور حاکم و رعایا دونوں پر عدل و خیر کو بطور فرض عائد کرتا تھا۔ دوسری چیز یہ مخصوص قسم کی ارستقراطیت تھی جس کی بنیاد حسنِ کارکردگی، تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ میں جاں فروشی اور رسولؐ خدا کے ساتھ تعلق پر استوار تھی اور جسے قریش نے اس کی صحیح راہ سے موڑ دیا تھا۔ یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ ان دونوں عنصروں کی حیثیت ایسی نہ تھی کہ وہ امتدادِ زمانہ، انقلابِ حالات اور تواترِ حادثات کے ساتھ بہ سلامت نبرد آزما ہو سکتے۔ پہلا عنصر یعنی زندہ قوی اور بیدار دینی ضمیر وہ چیز تھی جو ان اصحاب کو حاصل تھی مگر یہ طے شدہ اور حتمی امر نہ تھا کہ ان کے بیٹے بھی اسی ضمیر کے وارث ہوں گے۔ کیونکہ جن لوگوں کے رسولِ خداؐ سے قریبی تعلقات تھے اور جنہوں نے آپ سے علم و ادب حاصل کیا تھا وہ اس پر قادر تھے کہ آپ کی سیرت سے اثر قبول کرتے اور اسے اپنے ہر عمل و قول اور فکر میں بطور نمونہ پیشِ نظر رکھتے۔ لیکن ان

---

[۱] یہ سارا خلفشار ایک وضعی روایت کی بنا پر پیدا ہوا۔ یا یوں کہئے کہ وہ روایت وضع ہی اس مقصد کے لئے کی گئی تھی۔

کے بعد آنے والی نسلیں جوان کے بیٹوں اور پوتوں پر مشتمل تھیں ان میں امکانات ہیں کہ بعض اپنے آباؤ کے نقش قدم پر چل کر ان کی تقلید کریں اور بعض نہ کریں [1] کیونکہ رسولؐ خدا کے ساتھ ان کا تعلق یا تو قلیل سی مدت کے لئے رہا یا بالکل ہی نہ رہا۔ لہٰذا، اگر ان کے ضمیر اُس بیداری قوت اور زندگی سے محروم رہے جو نبی اکرمؐ کے خواص اور پاک نہاد اصحاب مقربین کو حاصل تھیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایک اور بات جو ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں رہنی چاہیئے یہ ہے کہ امورِ حکومت صرف اس وقت تک استوار رہتے ہیں جب تک کہ حاکم و محکوم کے مابین ان اصولوں کے بارے میں جن پر حکومت کی بنیاد رکھی گئی ہو تعاون و اعتماد بحال رہے۔ لہٰذا، صرف حاکم کی بیداریٔ ضمیر عدل گستری، نیکی اور خیر پر کاربند ہونا، خدا کی خوشنودی چاہنا اور سیاسی مشکلات پر قابو پالینا ہی اس کی کامیابی کے لئے ضمانت نہیں ہیں۔ یہ بھی لازم ہے کہ عوام کے ضمیر بیدار ہوں، ان کے دل بھی عدل و ایثار کی محبت سے سرشار رہوں اور وہ بھی خوشنودی مولیٰ کے خواہاں ہوں۔

جدید نظامِ حکومت کو سب سے پہلے جس مشکل کا سامنا کرنا پڑا وہ یہی مشکل تھی۔ کیونکہ تمام عرب اصحابؓ رسولؐ نہ تھے۔ نہ ہی ان کی اکثریت صحابہ تھی جنہیں حضورؐ کی صحبت کا شرف حاصل ہوا ہو، حقیقت یہ ہے کہ عربوں میں اصحاب رسولؐ کی حیثیت وہی تھی جو سفید بیل کے جسم پر سیاہ بال کی یا سیاہ بیل کے جسم پر سفید بال کی ہوتی ہے۔ اہل عرب کا اس نئے دین پر ایمان طبقۂ صحابہ کے ایمان کے ساتھ کوئی مطابقت یا نسبت نہیں رکھتا تھا۔ کیونکہ عربوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو بطریق حسن ایمان لائے تھے اور کچھ وہ بھی تھے جو مسلمان تو ہو گئے تھے مگر ایمان نہ لائے تھے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۲۶/۱۴)

عرب کے دیہاتی باشندے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ کہہ دیجیئے کہ تم ایمان نہیں لائے تمہیں یہ کہنا چاہیئے کہ ہم جھک گئے کیونکہ ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا اور اگر تم اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کرو تو وہ تمہارے اعمال میں کچھ کمی نہ کرے گا۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا اور مہربان ہے۔

بلکہ بعض عرب تو ایسے بھی تھے کہ گو کلمۂ اسلام ان کی زبان پر تھا لیکن قلب و ضمیر کے اعتبار سے وہ اپنی جاہلیت کا ملبہ قائم تھے۔ خدا انہی میں سے بعض کے بارے میں کہتا ہے :۔

---

[1] اگر صحیح نظام میں تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رہے تو یہ خصوصیات ہر آنے والی نسل میں بالعموم قائم رہتی ہیں

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ..... ۰ (پ ۱۰)

عرب کے دیہاتی باشندے کفر و نفاق میں سب سے بڑھ کر متشدد ہیں۔ اور سب سے زیادہ انہی سے اس امر کی توقع ہے کہ وہ اللہ کے نازل کردہ حدود و ضوابط کو نہ جانیں .....

دوسری شکل چنانچہ حاکم و محکوم کے مابین کوئی توازن موجود نہ تھا۔ اسی طرح رعیت کی بہت بڑی اکثریت اور خلیفہ کے مابین صحیح تعاون کار فرمانہ تھا بلکہ یہ تعاون اور توازن صرف خلیفہ اور صحابہ کرامؓ کے اس ممتاز طبقہ کے مابین تھا۔ اسی تعاون و توازن کی بدولت حضرت ابوبکرؓ نے عربوں کے فتنۂ ارتداد کو فرو کیا اور انھیں ازسرِ نو دائرۂ اسلام میں واپس لائے[1] اور اس کے بعد اُن کا رُخ فتوحات کی طرف پھیر دیا۔ دوسری بات جسے ہمیں نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے اور جس سے آگاہ ہو کر ان بزرگوں کو جو انسان کے بارے میں انتہائی حسنِ ظن اور مبالغہ سے کام لیتے ہیں سیخ پا نہیں ہونا چاہیئے، یہ ہے کہ یہ زندۂ و بیدار دینی ضمیر بھی بعض اوقات آزمائش سے دوچار ہو جاتی ہے اور بہت سے حوادث و آفات کی شکار بن جاتی ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے نفس اور دل و ضمیر کو بڑے اخلاص کے ساتھ بھلائی خیر، عمل اور احسان کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ پھر بعض پُرفتن امور ایسے پیش آجاتے ہیں اور اس طرح حد سے زیادہ مسلسل اصرار کے ساتھ وہ اس کا پیچھا کرتے ہیں کہ بالآخر وہ تاویل کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ایک تاویل سے دوسری تاویل، ایک توجیہہ سے دوسری توجیہہ، اور ایک لپیٹ سے دوسری لپیٹ میں اس طرح منتقل ہوتا رہتا ہے کہ ایک دن وہ دیکھتا ہے کہ اس کی موجودہ حالت اور روزِ اوّل کے اخلاص کے درمیان بہت بڑا فاصلہ حائل ہو گیا ہے۔ اسی سبب سے قرآن مجید، نبی اکرمؐ خلفاء راشدینؓ اور صالحین عظام نے بتاکید و اصرار لوگوں کو دنیا اور دنیوی متاعِ غرور سے ڈرایا ہے اور اسبابِ فتنہ و آزمائش سے خبردار کیا ہے۔ وہ برائیاں بیان کی ہیں جو نیکیوں کو برباد کر دیتی ہیں۔ اور بعض نیتوں اور اعمال کی نشاندہی کی گئی ہے جو نیکیوں کو اس طرح کھا جاتے ہیں جس طرح ایندھن کو آگ۔ لہٰذا، اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ بہت سے صالحین اور خود صحابۂ کرامؓ کو وسائلِ فتنہ اور متاعِ غرور کا سامنا کرنا پڑا اور ان پر کچھ ایسے احوال دعادت آن پڑے جو ان کے پہلے زمانہ سے، جب کہ اسلام تر و تازہ تھا اور صبح شام انھیں حضورؐ کی صحبت میسر ہوتی تھی بہت زیادہ بدل چکا تھا۔ اس پہلے زمانہ کا تو یہ عالم تھا کہ اللہ کے ذکر سے ان کے دل کانپ اٹھتے تھے، اور جب ان پر آیات اللہ کی تلاوت ہوتی تھی تو ان کا ایمان بڑھ جاتا تھا اور وہ اپنے رب پر توکل رکھتے تھے۔

---

[1] وہ ایک بغاوت تھی جسے فرو کیا گیا تھا۔ انہوں نے اسلام چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار نہیں کر لیا تھا۔

ہمیں نظر آئے گا کہ یہاں فتنے، آزمائشیں بکثرت ہیں اور متاعِ غرور کی طرف مائل کرنے والے اسباب پرکشش اور طاقتور ہیں؛ اور اولوالعزم حضرات ہی جم کر ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ہمیشہ اور ہر جگہ اولوالعزم حضرات کی قلت رہی ہے۔ میں مبالغہ و تکلف سے کام نہیں لینا چاہتا نہ کسی کا دل دکھانا چاہتا ہوں، نہ کسی کو ناراض کرنے کا خواہاں لیکن بایں ہمہ جب میں دیکھتا ہوں کہ بہت سے وہ صحابۂ کرامؓ جنہوں نے راہ اسلام میں بے شمار قربانیاں دیں اور نمایاں کام انجام دیئے، جن کی وجہ سے نبی اکرمؐ نے خوش ہو کر انھیں جنت کی خوشخبری یا ضمانت دی۔ جب امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ انھیں نئے حالات و حادثات کا سامنا کرنا پڑا۔ نیز وسیع اقطاع کی حکومت اور بے حساب دولت کے ذریعہ انہیں آزمائش کی بھٹی میں تاؤ دیا گیا تو ان کے باہمی تعلقات بگڑ گئے۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ ایک دوسرے کو قتل کیا۔ اور انسانی حد تک جس قدر ممکن تھا ایک دوسرے سے بدظن ہو گئے[1]۔ اندریں حالات ان لوگوں کے متعلق ہمارا موقف کیا ہونا چاہیئے؟ ہم ان کے ہر فعل سے ہم نوا نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس طرح ہم صرف اپنی عقل کا ہی گلا نہیں گھونٹیں گے بلکہ ہم ان اسلامی بنیادی اصولوں کو بھی ختم کر دیں گے جو عدل و احسان کا حکم دیتے ہیں اور منکر و فحشا و بغی سے روکتے ہیں۔ ان میں سے کسی کے بارے میں اپنے خیال کے مطابق یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکتے کہ اس نے غلطی کی۔ اولاً تو اس لئے کہ انھیں رسولِ اکرمؐ سے قریبی تعلق تھا۔ دوم اس لئے کہ نبی اکرمؐ نے انھیں جنت اور رضائے الٰہی کی بشارت دی تھی۔ علاوہ ازیں یہ کہ وہ لوگ خدا و رسول کے حق میں نیک گمان رکھتے تھے۔ انھیں خدا و رسول کے وعدوں پر اعتماد تھا اور اس جنت پر بھی یقین تھا جس کی انھیں بشارت دی گئی تھی۔ ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ ان کے بارے میں وہ رویہ اختیار کریں جو ان کے ہمعصر حمایتیوں یا دشمنوں نے اختیار کیا تھا، اور اس طرح ان میں سے بعض کے حق میں خیر اور بعض کے خلاف

ہمارا طرزِ عمل

شر کا حکم لگا دیں۔ کیونکہ ان کے ہمعصر حمایتی اور دشمن پیش آمدہ فتنہ میں ان کے ساتھی اور شریک کار تھے لہٰذا، وہ حسب تعلقات کسی سے راضی تھے اور کسی سے ناراض۔ لیکن ہم نہ تو ان کے ہمعصر ہیں اور نہ ان کے باہمی اختلافات میں ان کے شریکِ کار۔ ہمارے لئے یہ بھی عقلمندی نہیں کہ ہم ان کے معاملہ میں جذبات کے ہاتھوں بے اختیار ہو جائیں۔ ہمارے لئے صحیح راستہ یہ ہے کہ ان کے اعمال و اقوال کا اس اعتبار سے جائزہ لیں کہ ان کا عوامی زندگی اور واقعاتِ تاریخ کے ساتھ کیا تعلق تھا اور صرف اسی نقطۂ نظر سے ہم ان کے غلط یا صحیح ہونے کا فیصلہ کریں۔ ہمیں ان کے دینی معاملہ میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ دین کا فیصلہ خدا سے تعلق رکھتا ہے ہمارے

---

[1] یہ ہماری تاریخ کا بیان ہے جو کئی سو سال بعد، خاص مصلحتوں کے پیشِ نظر مرتب (یا بالفاظ صحیح، وضع) کی گئی تھی۔

ہمارے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ ان کے ہمعصر حامیوں اور مخالفوں کی طرح ان میں سے بعض کو مومن اور بعض کو کافر اور بعض کو بین بین کہیں۔ یا بعض کو جنتی اور بعض کو جہنمی بتائیں۔ ہمارا یہ منصب نہیں کہ ان امور میں مداخلت کریں۔ یہ معاملہ تو صرف خدائے وحدہٗ لاشریک سے متعلق ہے۔ ہم تو بس اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ ان کے اعمال واقوال اور سیرت میں یہ دیکھیں کہ کون سی چیزیں حق و عدل اور صواب سے مطابقت رکھتی ہیں اور کون سی اس کے خلاف تھیں۔ اور یہ بھی بجائے خود بہت بڑی بات ہے۔ لیکن جس سے مفر نا ممکن ہو اسے لاچار کرنا ہی پڑتا ہے۔

الغرض جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا اسلام کے اس صدرِ اول کے دو عناصر میں سے ایک عنصر جو زندہ و بیدار دینی ضمیر تھا خود اسے ان غلطیوں اور لغزشوں سے دوچار ہونا پڑا۔ بالفرض اگر جملہ صحابۂ رسولؐ ان خطاؤں سے محفوظ و مصئون رہتے اور فتنہ و فساد سے دوچار نہ ہوتے، ان کے معاملات اس نہج پر چلتے رہتے جو اس عصمت اور امن کے لئے موزوں تھے تو بھی لابدی تھا کہ ان کے بیٹوں اور پوتوں کو مختلف قسم کے فتنہ و فساد اور آزمائش و امتحان کا سامنا کرنا پڑتا۔

لہٰذا، اس عہد میں مسلمانوں کے لئے ناگزیر تھا کہ حتی الامکان وہ اپنے معاملات کو صرف احتساب ضمیر کے سپرد نہ کرتے یا معاملہ کو خلیفہ اور خدا کے درمیان سمجھ کر نہ چھوڑ دیتے۔ ان کے لئے ناگزیر تھا کہ حتی الامکان وہ ایک ایسا متعین نظام اور مسطور قانون وضع کر لیتے جو اختیاراتِ حکومت کو اجمالاً و تفصیلاً بیان کرتا۔ جو خلفاء کو بالوضاحت آگاہ کرتا کہ ان پر کیا کچھ کرنا لازم ہے اور کیا کچھ نہ کرنا۔ اور ان کے لئے کس ضمن میں نرم روی اختیار کرنا ضروری تھا۔ مزید برآں اس (قانون) کا فرض تھا کہ عوام کو بالتفصیل ان کے حقوق و فرائض سے آشنا کرتا اور وہ طریقے بتاتا کہ کس طرح خلیفہ کا انتخاب ہو اور پھر بعد انتخاب کیونکر اس پر کڑی نگاہ رکھی جائے اور اگر وہ بے راہ رو ہو تو اسے کس طرح سزا دی جائے۔

بہر حال مسلمانوں کو اس وقت شدید ضرورت تھی کہ وہ قرآن و سنت کی روشنی میں ایسا معین دستور مرتب کر لیتے جو حدود و معاملات کو واضح کر دیتا اور جس کی مدد سے وہ افتراق و انتشار سے محفوظ رہ سکتے۔ اگر وہ اس قسم کا کوئی قانون بنا چکے ہوتے تو اس فتنہ و فساد سے مصئون رہتے جس سے انھیں عہد حضرت عثمانؓ میں دوچار ہونا پڑا۔ مثال کے طور پر یہ ایک معاملہ ہے جس کا لوگ کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکے۔ وہ اس بارے میں حیران و پریشان تھے۔ کوئی راضی تھا کوئی ناراض۔ اور وہ یہ کہ حضرت عثمانؓ پر یہ اعتراض کیا گیا کہ وہ بیت المال کا روپیہ اپنے اقرباء پر خرچ کرتے ہیں تو انھوں نے جواب دیا حضرت عمرؓ خوشنودیٔ خدا کے خیال سے اپنے اعزہ کو محروم رکھتے تھے اور میں خوشنودیٔ خدا کی خاطر اپنے اعزہ کو دیتا ہوں۔ اور پھر حضرت عمرؓ جیسا ہم میں سے بھی کون؟" گویا جب حضرت عمرؓ اپنے اقرباء کو اموالِ مسلمین سے محروم رکھتے تھے تو وہ کارِ خیر کر رہے تھے اور جب حضرت عثمانؓ اموالِ مسلمین کو صلۂ رحمی میں خرچ کر رہے تھے تو وہ بھی کارِ خیر کر رہے تھے کیونکہ

خدائے تعالیٰ نے صلۂ رحمی کا حکم دیا ہے۔ یہ توجیہہ ان اصحاب کے نزدیک تو صحیح ہوسکتی ہے جو فقہی مسائل کی تاویل کرنا چاہتے ہیں لیکن عوام الناس کی مصلحتیں اس تاویل کی متحمل نہیں ہوسکتیں، کیونکہ عوام کے مال کی دو شکلیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو وہ قوم کی ملکیت ہے لہٰذا، امام کے لئے جائز نہیں کہ وہ عوام کی اجازت کے بغیر ان میں تصرّف کرے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ وہ امام کی ملکیت ہو۔ ایسی صورت میں عوام کے لئے جائز نہیں کہ جب خلیفہ اس میں تصرّف کرے تو آڑے آئیں اور اعتراضات کریں۔ بہر حال یہ بات صحیح نہیں کہ ایک امام تو ان اموال کو عامّۃ المسلمین کے لئے محفوظ رکھ کر قربِ خداوندی کا امیدوار ہو اور دوسرا اسی مال کے ذریعہ صلۂ رحمی کرکے قربِ الٰہی کا طالب ہو۔ ظاہر ہے کہ ہم اس بارے میں حضرت عمرؓ کا ساتھ دیں گے کیونکہ ان کی روش ہی حق و انصاف کے مطابق اور ائمہ کی شان احتیاط و عفت کے لائق ہے۔ مزید برآں عوام کے حقوق و معاملات کے سمجھنے کا یہی وہ طریقہ ہے جسے ہم آج بھی مناسب سمجھتے ہیں۔ ایک مثال اور بھی ہے جو مورخین نے بیان کی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اس مثال پر اپنی خوشنودی کا اظہار کریں یا حیرانی کا؟ اور وہ یہ کہ جب حضرت عثمانؓ کا محاصرہ شدید ہوگیا تو انھوں نے اپنے مخالفین سے کہا "اگر تمہیں قرآن مجید سے سند ملتی ہے کہ میرے پاؤں میں بیڑی ڈال دو تو پھر تم ضرور ایسا کرو۔" کیا انھوں نے مخالفین کو خوش کرنے کے لئے یہ بات کہی تھی اور اپنے حق میں قرآن کے خدائی فیصلہ کو تسلیم کیا تھا؟ اگر یہ صورت ہے تو پھر وہ حکم کہاں ہے جو مسلمانوں کو یہ اجازت دے کہ امام کو پابہ زنجیر کریں؟ یا پھر حضرت عثمان نے یہ بات بطور چیلنج کہی تھی؟ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قرآن میں کوئی صریح آیت نہیں جو مسلمانوں کو یہ اجازت دے کہ اگر وہ امام کو غلطی پر دیکھیں یا شاہراہ سے عمداً منحرف پائیں تو اس کے پاؤں میں بیڑی ڈال دیں۔ کیونکہ قرآن ان امور سے کوئی تعرض نہیں کرتا؟[1] گویا حضرت عثمانؓ جانتے تھے کہ مخالفین ان کے خلاف از روئے قرآن کوئی کارروائی نہیں کرسکتے لہٰذا، وہ جو کچھ کرتے تھے اس کا انہیں حق حاصل تھا اور انھوں نے کوئی گناہ، یا جرم نہیں کیا اگر مسلمانوں کے پاس کوئی مرتب تحریری قانون ہوتا تو عہدِ عثمانؓ کے مسلمانوں کو علم ہوتا کہ از روئے قانون ان کی کیا ذمّہ داریاں اور فرائض ہیں۔ اور بغیر اختلاف و تفرقہ کے انھیں معلوم ہوجاتا کہ وہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ اس وقت مسلمانوں کو ایک تحریری نظام کی کس قدر ضرورت تھی اس کی واضح ترمثال اس روایت سے ظاہر ہوتی ہے کہ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے حضرت علیؓ سے اس شرط پر بیعت کرنا چاہی کہ وہ قرآن، سنّت اور سیرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی پابندی کریں گے اور ادھر اُدھر نہ ہوں گے تو حضرت علیؓ نے یہ عہد دینے سے انکار کردیا۔ اور کہا کہ میں یہ عہد نہیں دے سکتا بلکہ جہاں تک ممکن ہوگا میں اپنی عقل کی مدد سے اجتہاد

---

[1] قرآن میں ان تمام امور کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔

کروں گا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے اوپر ایسی پابندی کیوں عائد کرلیں جس سے عہدہ برا ہونے کی کوئی صورت ہی نہ ہو۔ وہ لوگ کہ قرآن مجید تو مدوّن و مرتب اور لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھا۔ لیکن اس میں انتظامِ حکومت اور روزمرہ کے سیاسی واقعات کے بارے میں تفصیلات موجود نہ تھیں۔ سُنّتِ نبوی مجموعی طور پر معروف و معلوم تھی لیکن ان میں بعض احادیث ایسی تھیں جن کا علم موجود لوگوں کو نہ تھا۔ غیر حاضر لوگ ہی انھیں جانتے تھے۔ اس کا ایک حصّہ ان صحابۂ کرامؓ کے ساتھ ہی چلا گیا تھا جو فتنۂ ارتداد و معرکہ ہائے فتوحات میں کام آئے۔ یہی حال حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کی سیرت کا تھا۔ اس کا کچھ حصّہ سب کو معلوم تھا۔ کچھ حصّہ زینتِ طاقِ نسیاں ہو چکا تھا۔ لہٰذا حضرت علیؓ کو پورا پورا حق پہنچتا تھا کہ وہ بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر اور رعیت کی بہتری اور مسلمانوں کی بہبودی کے خیال سے بوقتِ ضرورت حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کے طرزِ عمل سے اختلاف کرتے۔ لیکن ان سے پہلے جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے یہی شرائط حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش کیں تو انھوں نے کہا "ہاں مجھے یہ منظور ہے"۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ قرآن، سُنّتِ نبویؐ اور سیرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے نفاذ کی پوری پوری کوشش کریں گے۔ اور یہ ٹھیک ہے کہ حضرت عثمانؓ نے کتاب و سُنّت اور سیرت ابوبکرؓ کے مطابق عمل پیرا ہونے کی بخلوصِ خاطر کوشش کی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت علیؓ کی رائے صائب تھی مگر حضرت عثمانؓ بھی حقیقت سے دُور نہ ہوئے تھے۔ لیکن غور طلب امور وہ احوال ہیں جو حضرت عثمانؓ کی حکومت کے چند سال بعد ہی رونما ہوگئے۔ مثال کے طور پر حضرت عثمانؓ نے اموالِ مسلمین کے بارے میں جو روش اختیار کی تھی وہ حضرت عمرؓ کے طرزِ عمل سے مختلف تھی۔ جن لوگوں نے سیرت فاروقِ اعظمؓ کے التزام کا عہد لے کر بیعت کی تھی انہوں نے دیکھا کہ حضرت عثمانؓ مختلف روش پر گامزن ہیں اور انھوں نے اپنا کیا ہوا عہد پوری طرح ایفا نہیں کیا۔ حضرت عثمانؓ اپنی جگہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ کسی قسم کا انحراف نہیں کر رہے۔ کیونکہ سیرت حضرت فاروقؓ کی روح اور اس کا بنیادی عنصر تقرب الی اللہ اور خوشنودیٔ خدا تھا ـــــ اور وہ (حضرت عثمانؓ) بھی جو صلہ رحمی کر رہے ہیں اس سے مقصود تقرب الی اللہ اور خوشنودی مولیٰ ہی ہے۔ گویا حضرت عثمانؓ تقربِ الٰہی کے اسی طرح طالب تھے جس طرح حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ۔ وہ اختلافِ وسائل کو جرم نہیں سمجھتے تھے۔ اگر مسلمانوں کے پاس اس عہد میں کوئی مدوّن و مرتب نظامِ حکومت ہوتا جس میں جملہ امور و حدود کی بخوبی وضاحت[1] ہوتی تو حضرت علیؓ اس دستور کی پابندی قبول کرنے سے انکار نہ کرتے۔ نہ حضرت عثمانؓ کو بیعت لینے کے بعد توجیہہ و تاویل کی ضرورت پڑتی۔ نہ

---

[1] اس قسم کا تفصیلی مرتب و مدوّن دستور تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی نہیں تھا جسے خود مصنف مثالی دور قرار دیتے ہیں۔ انھیں معلوم تھا کہ قرآن کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے مطابق نظم و نسق مملکت کو کس طرح سرانجام دینا چاہیے۔

قوم دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک تو وہ سخت گیر اور محتاط فریق جو حضرت عثمانؓ کو ملامت کرتا تھا۔ دوسرا وہ فریق جو ہر معاملہ کی تاویل کر کے وجہ جواز پیدا کر لیتا تھا۔

ہاں آپ کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ حضرت عمرؓ ۲۳ھ میں شہید ہو گئے۔ یعنی ابھی ہجرت اور حکومت کی بنیاد پڑے ہوئے چوتھائی صدی بھی نہ گذری تھی۔ پھر یہ مختصر سی مدت بھی ایسی پُر سکون و اطمینان بخش نہ گذری کہ جس میں تمام معاملات ایک حال پر جاری رہے ہوں اور فراغت نصیب رہی ہو۔ ان میں سے ابتدائی دس برس تو اہلِ عرب کو اسلام کی دعوت دینے میں گذر گئے۔ پھر سال ڈیڑھ سال کا عرصہ عرب کے مرتد قبائل کو واپس اسلام کی طرف لانے میں صرف ہو گیا۔ بقیہ مدت عربوں کو اسلام پھیلانے کے لئے اقطاعِ عالم کی طرف بھیجتے رہنے میں خرچ ہو گئی۔ فارس میں جنگیں ہوئیں، رومیوں کو شام و مصر سے نکالا گیا، شہر آباد کئے گئے۔ لشکروں کو منظم و مرتب کیا گیا۔ جنگ و امن میں سیاست کے اوّلیں دستور وضع کئے گئے۔ اندرونِ عرب اور بیرونِ عرب میں اسلامی حکومت کے بند و بست اور انتظام کے طریقے مرتب کئے گئے۔ لہٰذا، یہ کہنا مبنی بر عدل و انصاف نہ ہوگا کہ اس دور میں مسلمانوں نے کوتاہی کی یا پیچھے رہے یا جو کچھ وہ کر سکتے تھے اسے کئے بغیر چھوڑ گئے۔

مزید برآں یہ بھی مدنظر رکھنا چاہیئے کہ حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ اس دیہاتی عربی ماحول میں جسے حکومت کی تنظیم اور انتظامی امور سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا، ہر پیش آنے والے سیاسی و انتظامی معاملے میں جدت پسندی سے کام لیتے اور نیا راستہ نکالتے تھے۔ اور پھر اسی حد پر معاملہ ختم نہ کرتے تھے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ ایک ایسی قوم کو نظام میں چلا رہے تھے جو نظام میں چلنے کی عادی نہ تھی۔ وہ ایک ایسی قوم کو تہذیب و تمدن سکھا رہے تھے جو پہلے ان سے واقف نہ تھی۔ اگر یہ ساری چیزیں پیشِ نظر رہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کے بارے میں یہ کہنا کتنی زیادتی ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے لئے نظامِ سیاست مرتب کرنے کے فریضے میں کوتاہی کی۔ حضرت عمرؓ تو اس ضمن میں انتہائی ممکن حد تک اجتہاد سے کام لیتے تھے جو نہی انھیں کسی تہذیب یافتہ قوم کے کسی دستور کا علم ہوتا وہ اس کے بارے میں انتہائی غور و فکر سے کام لیتے اور اس کا ایسا نچوڑ حاصل کرتے جو اسلام اور عربی مزاج نیز اس نئی حکومت کے موافق ہوتا جو اس قدر تیزی سے نشوونما پا رہی تھی کہ مفکرین کا تفکر اور مدبرین کا تدبر اس کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔

رہا اس نظامِ سیاسی کا دوسرا عنصر تو وہ صحابۂ کرامؓ کی ممتاز و مستقر اہلیت تھی جسے طبعاً زوال پذیر ہو جانا تھا کیونکہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی میعاد ختم ہونے والی تھی۔ اور ازاں بعد نئی نسل منصۂ شہود پر آنے والی تھی جسے وہ امتیازی مقام حاصل نہ تھا جو اس جماعتِ صحابہؓ کو حاصل تھا۔ لہٰذا، یہ طبعی امر تھا کہ ان آنے والی نسلوں کے لئے ایسا دستور وضع کر دیا جاتا

جو انھیں بتاتا کہ انتخاب خلیفہ کس طرح ہو اور کن اصول و ضوابط کے تحت وہ خلفاء کی نگرانی محاسبہ اور بوقتِ ضرورت ان کے خلاف تعزیری کارروائی عمل میں لائیں۔ اگر کوئی ایسا دستور مرتب کیا جا چکا ہوتا تو شہادتِ عثمانؓ کے بعد تاریخ نے مسلمانوں کا جو رنگ دیکھا وہ نہ ہوتا۔ نہ مسلمانوں میں سُنّتِ نبویؐ اور سُنّتِ شیخینؓ کی اندھا دھند حمایت و حفاظت کرنے والا فرقہ خوارج ظہور پذیر ہوتا۔ نہ وہ فرقہ پیدا ہوتا جو اس خیال کا زبردست حامی تھا کہ امامت آلِ بیتِ نبیؐ میں رہنی چاہیئے۔ نہ وہ گروہ ظہور میں آتا جس نے خلافت کو ملوکیت اور قیصریت و کسرویت میں تبدیل کر دینا چاہا اور نہ وہ جماعت سامنے آتی جو بغیر کسی معین نظام و ضابطہ کے یہ چاہتی تھی کہ نظامِ حکومت مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے عمل میں آئے لیکن ہم عنصرِ اوّل کے تجزیہ کے بعد جس نتیجہ پر پہنچے تھے وہی کچھ عنصرِ ثانی کے بارے میں بھی کہنا چاہتے ہیں۔ ہوا یہ کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور ان کے اصحاب کو نہ موقع ملا نہ فراغت کی گھڑیاں میسر آئیں۔ نہ ان کے زمانہ تک وسائل تمدن و تہذیب اور دیگر اسباب ترقی اس قابل ہوئے تھے کہ وہ ایک مکمل نظام مرتب کرنے پر قادر ہوتے۔ ہاں یہ راہ اُن افراد پر کھلی تھی جو اُن کے بعد آئے جنھیں سہولت آرام اور فراغت نصیب تھی مگر اس کے باوجود انہوں نے انصرامِ حکومت کے لئے دستور وضع نہ کیا اور نہ کوئی ایسا ضابطہ بنایا جو سیاسی اور اجتماعی عدل کے معاملہ میں رعیت کی رہنمائی کرتا۔ اس طرح انہوں نے بھی اس معاملہ میں غفلت برتی اور ذاتی حکومت، ملوکیت و استبداد کو ترجیح دی۔

بایں ہمہ یہ لوگ بھی قصوروار نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ دنیا دستور سازی سے کب آگاہ ہوئی ہے ہمیں یہ حقیقت ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ واضح خطوط، ظاہر حدود اور معین شکل میں تحریری سیاسی نظام و دستور کا وجود ایک نئی ایجاد ہے جس سے دُنیا کا تعارف بہت ہی بعد کے زمانوں میں ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ قدیم یونانی شہروں میں تحریری سیاسی دستور موجود تھا۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ اہلِ روما بھی مقرر و معین نظام سیاسی رکھتے تھے۔ لیکن یہ بھی میرے علم میں ہے کہ مشرق و مغرب کی ملوکیت نے ان دساتیر کو مٹا کر لوگوں کی نگاہوں سے یکسر پوشیدہ کر دیا تھا حتیٰ کہ عالمِ انسانیت انہیں بڑی حد تک بھلا چکی تھی، اور اب یہ نیا زمانہ اس ترقی اور انقلاب کے بعد اسے بتدریج تھوڑا تھوڑا ظاہر کر رہا ہے۔

ضروری ہے کہ ہم ذرا اس معاملہ پر بھی نگاہ ڈال لیں جس کی طرف میں نے اثنائے گفتگو میں کسی مقام پر اشارہ کیا ہے۔ وہ

نگرانی حکام کی تنظیم اور حضرت عمرؓ کی طرفہ حکمتِ عملی

یہ کہ حضرت عمرؓ ہر سال حج کے موقع پر اپنے عمال (صوبائی گورنروں، علاقہ کے افسروں) اور ملکی باشندوں سے ملاقات کیا کرتے تھے۔ عمال سے رعیت کے احوال دریافت کرتے اور رعیت سے عمال کے۔ حضرت عمرؓ نے یہ ایک مستقل دستور بنا رکھا تھا چنانچہ وہ پہلے سال کو چھوڑ کر ہر سال پابندی کے ساتھ حج کی قیادت فرماتے۔ اگر حضرت عمرؓ کچھ عرصہ اور زندہ

رہتے تو ان کی شدید ذکاوت و ذہانت، پختہ بصیرت، عاقبت اندیشی اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے پیشِ نظر عین ممکن تھا کہ ملک کے باشندوں اور عاملین پر مشتمل حاجیوں کا سالانہ اجتماع ترقی کر کے کسی منظم محکمہ کی شکل اختیار کر لیتا جو اگر ایک پارلیمانی نظام نہ ہوتا جیسے قدماء نے بیان کیا تھا یا جس کو اہلِ عصرِ حاضر نے استنباط کیا ہے تو بہر حال اس سے قریب اور مشابہ ضرور ہوتا۔ حضرت عمرؓ اس اجتماعِ حج ہی پر اکتفا نہ کرتے تھے، بلکہ مدینہ اور اس کے مضافات میں، نیز حج کے موقع پر وہ امورِ عامہ کا کام امکان بھر بذاتِ خود سنبھالتے تھے، مزید برآں دُور کے علاقوں کی نگرانی وہ اپنے مقرر کردہ نقیبوں اور کارندوں کے ذریعہ کرتے تھے جنھیں وہ وقتاً فوقتاً عمّال کے حالات سے آگاہی حاصل کرنے کی خاطر بھیجتے رہتے تھے۔ پھر کچھ حالات ان معاملات اور مقدمات سے بھی معلوم ہوتے تھے جو عوام یا عمال کی طرف سے آپ کے سامنے پیش ہوتے رہتے تھے۔ وہ اپنے آخری ایام میں صوبہ جات کے تفتیشی دوروں کے متعلق بھی سوچ رہے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ اگر زندگی ہوئی تو ہر بڑے شہر میں دو دو ماہ قیام کروں گا اور بچشم خود دیکھوں گا کہ عمال کیا کر رہے ہیں اور رعیت ان کے اعمال سے خوش ہے یا نہیں لیکن موت نے جلدی کی اور انھیں اس پروگرام پر عمل پیرا نہ ہونے دیا۔ اور جونہی آپ اس دُنیا سے رحلت فرما کر اپنے دو رفیقوں سے جا ملے، مسلمانوں کی سیاست کا طریقہ ہی بدل گیا جو آنحضرت اور حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کے طریقہ سے بالکل الگ تھا۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ حضرت عمرؓ کی سیاسی حکمتِ عملی پر بحث کرتے ہوئے ہم ان کی اس سیاست پر بھی نظر ڈال لیں جس سے انھوں نے صحابہ کرامؓ کے اس ممتاز طبقہ سے کام لیا تھا۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا ہے

حضرت عمرؓ کی حکمتِ عملی کا دوسرا پہلو ذاتی اثر و رسوخ پر قدغن ہے

حضرت عمرؓ نے انھیں مدینہ میں روک رکھا تھا۔ اور انھیں اطرافِ ملک میں پھیلنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ کچھ اُن کے نقصان کا خوف تھا، کچھ ان کی جانب سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اور حق یہ ہے کہ ان کی حکمتِ عملی بجا اور درست تھی۔ کیوں نہ ہم چیزوں کو ان کے صحیح ناموں سے پکاریں یا کیوں نہ ہم ان کا اپنی آج کی زبان میں ترجمہ کر دیں۔ اور کہیں کہ حضرت عمرؓ نے صحابہ کرامؓ کے اس طبقۂ ممتاز کو کچھ تو ان کی حفاظت کی خاطر اور کچھ مسلمانوں کی بہتری کے خیال سے مدینہ میں روکے رکھا جسے ہم اپنی آج کی زبان میں اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھانا کہتے ہیں۔ جب تک اس طبقۂ ممتاز کو حضرت عمرؓ نے پابند مدینہ رکھا، نہ صرف مسلمانوں کے معاملات بلکہ خود اس طبقہ کے حالات بھی درست رہے۔ مگر جب حضرت عثمانؓ خلیفہ بنے اور انھوں نے یہ پابندی ہٹالی تو فوراً ہی تمام ملک فتنہ و فساد کی لپیٹ میں آگیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ طبقہ فساد کا خواہشمند تھا یا اُس نے عمداً فساد کرایا۔ بلکہ فساد کا باعث یہ ہوا کہ ایک طرف تو اس طبقہ کے افراد کو دولت اور مددگار و حمایتی بکثرت میسر آگئے دوسرے یہ کہ لوگ ان کی وجہ سے آزمائش میں پڑ گئے۔ چنانچہ اس طبقہ کے ہر

بڑے رکن کے پاس بہت سے موالی، مددگار اور پیروکار جمع ہو گئے تھے۔ حضرت عمرؓ اموالِ مسلمین میں سے کسی زید یا بکر کو صلۂ رحمی یا مہربانی یا تالیفِ خاطر کے لئے کچھ نہیں دیتے تھے۔ انھوں نے اس طبقہ اور دیگر مسلمانوں کا وظیفہ مقرر کر رکھا تھا اور ہر ایک کو حکمِ خداوندی کے مطابق محنت و اکتساب کی اجازت دے رکھی تھی۔ عمرؓ اس پابندی کے علاوہ جو ابھی ہم نے بیان کی کسی پر روک اور پابندی نہ لگاتے تھے۔ لیکن جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے اس طبقہ کے لئے صرف مملکت کے مختلف علاقوں میں جانے کی راہیں ہی نہیں کھول دیں بلکہ انھیں بیت المال سے گراں قدر رقوم بھی عطا کیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک روز انھوں نے حضرت زبیرؓ کو چھ لاکھ اور حضرت طلحہؓ کو دو لاکھ درہم عطا کئے اور جب اس قسم کے افراد کی دولت میں اس طرح اضافہ ہو گیا اور انھیں یہ بھی اجازت حاصل ہو گئی کہ وہ صوبہ جات میں جاگیریں خرید لیں، صوبائی شہروں میں مکان تعمیر کرائیں۔ حجاز میں محلات بنوائیں موالی و خدام اور متبعین کو ہر جگہ کثیر تعداد میں جمع کر لیں تو ظاہر ہے کہ اس سے فتنے کے ایسے دروازے ان کے لئے کھل گئے جن میں داخل نہ ہونا ان کے بس کا روگ نہ رہا۔ بعض افراد خود کو بچانے میں کامیاب بھی ہو گئے۔ مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاصؓ شریکِ فتنہ نہ ہوئے۔ بلکہ جب دوسرے لوگ اس کی لپیٹ میں آئے تو حضرت سعدؓ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ شریکِ فتنہ نہ ہوئے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنھوں نے حضرت علیؓ کے سامنے اپنی جانب سے حضرت عثمانؓ کو خلیفہ منتخب کرنے پر اظہارِ ندامت کیا تھا ـــــ اور جنھوں نے دار الہجرت میں مقیم رہتے ہوئے دور دراز تک اپنی تجارت کا سلسلہ پھیلا رکھا تھا۔ وہ اپنی آمدنی کا اکثر حصہ خیرات کرتے تھے جیسے نبی اکرمؐ اور حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کے عہد میں کرتے رہے تھے۔ حضرت علیؓ بھی کنارہ کش رہے۔ ان کا تجارت کرنا یا صوبہ جات میں جاگیریں حاصل کرنا یا مکانات بنوانا ہمارے علم میں نہیں۔ وہ مدینہ ہی میں جہاں رسولِ اکرمؐ نے انھیں بسایا تھا مقیم رہے۔ ان کی کچھ زمین ینبوع میں تھی۔ لہٰذا، کبھی کبھی وہاں جایا کرتے تھے۔ لیکن جیسا کہ لوگ کہتے ہیں حضرت علیؓ کا معاملہ کچھ مختلف تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس طرح ایک طرف تو اس طبقہ ممتاز کو بچائے رکھا۔ دوسری طرف مسلمانوں کو ان کے اثر و رسوخ سے بھی محفوظ رکھا نہ لوگوں کے دین میں خلل آنے دیا نہ اُن کو فتنہ و فساد میں مبتلا ہونے دیا۔ انھوں نے آنحضرت کے مقرب صحابہؓ کی ایک مجلس بنائی جسے اُن کی (عمرؓ) مجلسِ شوریٰ کہا جا سکتا ہے۔ اگر وہ کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو اُن سے کچھ بعید نہ تھا کہ ان صحابۂ کرامؓ کو ان کی اس حیثیت پر رضامند کر لیتے اور بدیں صورت وہ اصحابِ حل و عقد بن جاتے جن کا منصب یہ ہوتا کہ وہ حکومت کے عہدوں پر فائز ہوئے بغیر خلفاء کو مشورہ دیتے رہتے۔

یہ تھی ایک بات ـــــ دوسری بات جو انھوں نے کی وہ یہ تھی کہ جب حضرت عمرؓ کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تو انھوں نے رسول اللہؐ کا اتباع کرتے ہوئے کسی ایک شخص کو اپنا جانشین مقرر نہ کیا۔ اور حضرت ابوبکرؓ کا اتباع کرتے ہوئے یہ

نظام شوریٰ

چاہا کہ مسلمانوں کی خیرخواہی کریں اور انھیں اپنے مشورہ سے آگاہ کریں، لہٰذا، انھوں نے "اصحاب شوریٰ" کا انتخاب کیا جن میں ایسے لوگ تھے جن سے رسولؐ خدا راضی تھے۔ جنھیں مہاجرین کی قیادت اور قریش کی زعامت حاصل تھی۔ جن سے مسلمان خوش تھے اور جن پر مسلمانوں کو اعتماد تھا ــــ اس طرح "مجلس شوریٰ" مرتب کی مگر یہ امر "ارکان شوریٰ" پر چھوڑ دیا کہ جس کو چاہیں اپنے میں سے خلیفہ منتخب کرلیں۔

آگے چل کر ہم معلوم کریں گے کہ یہ نظام شوریٰ جس طرح حضرت عمرؓ نے مرتب کیا تھا ناکافی اور غیر تسلی بخش تھا لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ حضرت عمرؓ ہی وہ شخصیت ہیں جنھوں نے شوریٰ کے مسئلہ کی طرف توجہ دی اور اسی کو انتخاب خلفاء کے لئے بنیاد قرار دیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ حضرت عمرؓ نے یہ "نظام شوریٰ" مجروح ہونیکے بعد وضع کیا جب وہ دنیا سے رخصت ہوکر آخرت میں قدم رکھنے والے تھے اور اس درد وکرب میں مبتلا تھے جس میں کوئی زخم خوردہٴ خنجر وسنان مبتلا ہوسکتا ہے۔ حضرت عمرؓ اس زخم خوردگی کے عالم میں ایک ایسے شخص کی طرح تڑپ رہے تھے جو موت سے ہم آغوش ہورہا ہو اور جو حضرت عمرؓ جیسا زندہ و بیدار اور نازک و لطیف ضمیر رکھتا ہو۔ وہ ضمیر جو اپنی چھوٹی بڑی خطاؤں کو یاد کرکے ڈر رہا ہو۔ جو اپنے نفس کے ساتھ خدا کے محاسبہ کا خیال کرکے کانپ رہا ہو۔ علاوہ ازیں حضرت عمرؓ کو اور کئی خیال پریشان کررہے تھے۔ کچھ ذاتی معاملے تھے۔ کچھ کنبے کا فکر تھا کہ مبادا انھیں بھی اسی بارگراں کا متحمل ہونا پڑے جس کا بار خود انھوں نے اٹھایا تھا۔ اپنے بارے میں یہ فکر بھی کھا رہا تھا کہ خدا کے حضور پیش ہونے پر اگر ان کے ذمہ اموال المسلمین میں سے کوئی شئے نکل آئی تو کیا ہوگا۔ ان ساری باتوں کے بعد اپنی قبر کا معاملہ بھی انہیں بے قرار کررہا تھا۔ کیونکہ وہ رسولؐ خدا اور ابوبکرؓ کے ساتھ دفن ہونے کے شدید آرزومند تھے۔ لیکن یہ بات صرف حضرت عائشہؓ کی اجازت ہی سے ممکن تھی، کیونکہ وہ مکان جس میں وہ قبریں تھیں حضرت عائشہ کی ملکیت تھا۔ حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ انہیں قبل ازمرگ یہ اطمینان ہوجائے کہ اجازت حاصل ہوگئی ہے اور یہ بھی طے پاگیا ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ ان کی (عمرؓ) وفات کے بعد حضرت عائشہؓ سے عرض کرکے انھیں ان کے گھر میں دفن کردیں گے۔ ان گوناگوں معاملات کے ساتھ ساتھ اور اس درد وکرب کی کیفیت میں انھوں نے "نظام شوریٰ" پر بھی غور وفکر کیا اور مسلمانوں کے لئے حتی الوسع پوری احتیاط سے کام لیا۔

حضرت عمرؓ کی وفات اور نئے خلیفہ کو منتخب کرلینے کے بعد مسلمانوں کے لئے موقع تھا کہ اس نظام شوریٰ کے بارے میں غور وفکر کرکے اسے ٹھوس اور پائیدار بنیادوں پر استوار کردیتے۔ اس سے ایک تو وہ تفرقہ سے محفوظ رہتے اور دوسرے اگر کسی خلیفہ کو حادثات اتنی مہلت نہ دیتے کہ وہ حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرح مسلمانوں سے کوئی عہد لیں یا مشورہ دیں تو اس صورت میں وہ نظام انھیں مامون رکھتا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انھوں نے اس مسئلہ پر کسی قسم کا غور و تدبر نہ کیا۔

حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوگئے۔ اور انھوں نے مسندِ خلافت پر جلوہ افروز ہوتے ہی لوگوں کے وظائف میں اضافہ کیا۔ حضرت عمرؓ کی لگائی ہوئی پابندیوں کو آسان کردیا انھیں اطرافِ ملک میں پھیل جانے کی اجازت دے دی۔ یہ بھی اجازت دے دی کہ اموال و انصار میں جس قدر چاہیں اضافہ کرلیں۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ بحث جسے آپ طویل خیال کر رہے ہوں گے لیکن میں اسے انتہائی مختصر خیال کر رہا ہوں اس قدر راستہ ہموار کرچکی ہے کہ اب ہم حضرت عثمانؓ کی کہانی جو ہمارا موضوع ہے شروع کردیں ان فتنوں کا تذکرہ کریں جو ان کے عہدِ خلافت میں برپا ہوئے وہ جھگڑے بیان کریں جو ان کی ذات سے متعلق ہوئے، ہمارا خیال ہے کہ یہ بحث جسے آپ طویل اور میں مختصر سمجھتا ہوں آپ پر یہ واضح کرسکے گی کہ وہ حادثات جو وقوع پذیر ہوئے اور ان کے جو نتائج مترتب ہوئے وہ ان حضرات کی طاقت و ہمت سے زیادہ عظیم و وسیع تھے جو ان حادثات میں نزدیک یا دور سے شریک ہوئے تھے۔ لہٰذا، یہ مناسب نہیں کہ ہم ایک جماعت یا دوسری کو ملامت کریں۔ ہمیں چاہیئے کہ ان حالات و ظروف کو ملامت کریں بشرطیکہ احوال و ظروف کو ملامت کرنا ممکن ہو یا شیوۂ عقلمندی ہو۔

(۲)

باب چہارم

حضرت عثمانؓ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بننے سے پہلے

دوسرے صحابۂ کرامؓ کی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بھی ایام جاہلیت کے تقریباً تمام حالات تاریخ کی نذر ہو گئے۔ اسلام نے صحابۂ کرامؓ کو صرف ان کے نفوس و قلوب و عقول کے اعتبار سے ہی نیا جنم نہیں دیا بلکہ انھیں تاریخی اعتبار سے بھی از سر نو پیدا کیا، اس نے انہیں اسلام سے پہلے کی زندگی سے اس طرح منقطع کر دیا گویا وہ پیدا ہی اس وقت ہوئے جب وہ اسلام لائے۔ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کی ولادت واقعۂ فیل سے چھ برس بعد ہوئی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی ولادت طائف میں ہوئی تھی۔ بہر حال حضرت عثمانؓ کے ابتدائی حالات میں سے جو کچھ محفوظ رہ گیا ہے وہ صرف اتنا ہی ہے اور وہ بھی غیر مستند راویوں کی روایت کی رو سے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کی شہادت کے بعد ان کی عمر کے بارے میں اختلاف رائے تھا بعض لوگ سمجھتے تھے کہ بوقت شہادت ان کی عمر پچھتر برس تھی۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ اس وقت ان کی عمر نوے یا اٹھاسی یا چھیاسی برس کی تھی، کچھ اور لوگ بیاسی یا تراسی برس کی عمر کو ترجیح دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ حضرت عثمانؓ کی صحیح تاریخ ولادت سے واقف ہوتے تو ان کی عمر کے بارے میں اتنا اختلاف نہ ہوتا۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک راوی آپ کی عمر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کی عمر سے ملانے کے لئے یہ بھی نہ کہتا کہ حضرت عثمانؓ کی عمر شہادت کے وقت تریسٹھ برس کی تھی اور خدا نے ان تینوں کو ایک عمر میں اپنے جوار رحمت میں داخل کرنا پسند فرمایا۔ (گو حضرت عمرؓ کے بارے میں بھی اس سلسلہ میں قدرے اختلاف ہے)۔

حضرت عثمانؓ کا نسب

راویوں کو حضرت عثمانؓ کے عہد جاہلیت کے اصولوں میں سے فقط ان کا نسب ہی معلوم ہے۔ جو یہ ہے عثمانؓ بن عفان بن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی۔ اس طرح ان کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے رسول اللہؐ کے ساتھ عبد مناف پر آ کر مل جاتا ہے۔ لیکن والدہ کی جانب سے یہ نسبتی تعلق اور بھی قریب ہو جاتا ہے۔ ان کی والدہ اروی بنت کریز تھیں۔ اور اروی کی ماں بیضاء عبد المطلب بن ہاشم کی دختر تھیں۔ اس اعتبار سے

اروی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔

آگے چل کر بنو اُمیہ نے حضرت علیؓ اور ان کے ہاشمی ساتھیوں کو یہی رشتہ یاد دلایا تھا اور اسی قرابت کا سہارا لے کر حضرت علیؓ کو ملامت کی تھی کہ انھوں نے (حضرت عثمانؓ یعنی) اپنی پھوپھی اور چچازاد بھائی کو بے مدد چھوڑ دیا۔ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ کے پھوپھی زاد بھائی تھے جیساکہ بیان کیا جاچکا ہے۔ چچازاد اس لئے کہ حضرت عثمانؓ کا نسب بنو عبدالمطلب کے ساتھ عبد مناف سے مل جاتا ہے۔ بنو ہاشم کے مورث ہاشم اور بنو اُمیہ کے مورث عبد شمس دونوں عبد مناف کے بیٹے تھے۔ عفان اپنے والد اور بنو امیہ و بنو عبد شمس بلکہ قریش کی اکثریت کے دستور کے مطابق تجارت پیشہ تھے۔ اور بہ غرض تجارت شام کی جانب سفر کیا کرتے تھے۔ اپنے ایک تجارتی سفر ہی میں وہ فوت ہوگئے۔ اور اپنے بیٹے (حضرت عثمانؓ) کے لئے اچھی خاصی دولت چھوڑ گئے۔ حضرت عثمانؓ نے بھی اپنے والد بلکہ اپنی قوم کے طریقہ کے مطابق تجارت کرنا شروع کر دی اور بڑی دولت کمائی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اسلام

ایک روز جب وہ شام سے واپس آئے تو انھوں نے اپنے گھر والوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نئے پیغام کا چرچا سُنا، جسے محدثین اور سیرت نگاروں نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی خالہ سعدیٰ نے جو کاہنہ تھیں انھیں نبی اکرمؐ کے بارے میں خبر دی اور آپ کی تائید کا شوق دلایا۔ بعض کا کہنا ہے کہ انھیں حضور اکرمؐ کی اطلاع اس وقت ملی جب وہ حضرت طلحہ بن عبیداللہ کے ہمراہ شام سے لوٹ رہے تھے۔ وہ نیم خوابی و نیم بیداری کے عالم میں تھے کہ انھوں نے ایک منادی کا اعلان سُنا کہ "احمدؐ" نے مکہ میں ظہور فرمایا ہے۔ جب وہ مکہ میں پہنچے تو انھیں ظہورِ اسلام کی خبر دی گئی جس نے ان کے دل کو کسی حد تک متاثر کر لیا۔ لیکن وہ بات جس پر سب راوی متفق ہیں یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ حضرت ابوبکرؓ سے ملے اور اس موضوع پر ان میں باتیں ہوتی رہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے انھیں دعوتِ اسلام دی اور حضرت عثمانؓ کا دل اس طرف مائل ہوگیا۔ حضرت ابوبکرؓ انھیں لے کر نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپؐ نے انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور نصیحت و تلقین فرمائی۔ چنانچہ انھوں نے یہ دعوت قبول کر لی اور جب وہ حضورؐ کے پاس سے رخصت ہوئے تو اسلام قبول کر چکے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت طلحہؓ بھی ان کے ساتھ ہی اسی نشست میں اسلام لائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ دونوں حضرت زبیر بن العوامؓ کے بعد ہی مسلمان ہوگئے تھے۔ بہرحال حضرت عثمانؓ کا شمار سب سے پہلے اسلام لانے والے چودہ افراد میں ہوتا ہے۔ وہ اس وقت مسلمان ہو چکے تھے جب نبی اکرمؐ نے ہنوز اپنی دعوت کے لئے دارالارقم کو مستقر نہیں بنایا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دامادی

بعد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبتی تعلق بھی قائم ہوگیا۔ یعنی انھوں نے آپ کی صاحبزادی

حضرت رقیہؓ سے شادی کر لی اور اس نسبت کے بعد تو وہ رسولِ خدا کے خاص مقرب اور عزیز اصحاب میں شمار ہونے لگے۔
اسلام قبول کرنے کی وجہ سے دوسرے مسلمانوں کی طرح انھیں بھی تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے چچا حکم بن ابی العاص نے جب ان کے قبولِ اسلام کی خبر سنی تو ان پر بہت تشدد کیا۔ رسّی سے باندھ دیا اور قسم کھائی کہ جب تک وہ اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ نہ آئیں گے انھیں نہ کھولے گا۔ لیکن جب.... دیکھا کہ حضرت عثمانؓ اپنے دین میں راسخ ہو چکے ہیں تو آخر انھیں چھوڑ دیا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی والدہ نے بھی بڑی سختی کے ساتھ ان سے مُنہ موڑ لیا تھا مگر جب اس سے کوئی فائدہ نظر نہ آیا تو آخر انھوں نے بھی خفگی چھوڑ دی۔ جب نبی اکرمؐ نے ہجرت حبشہ کی اجازت دی تو حضرت عثمانؓ

ہجرت

معہ اپنی اہلیہ محترمہ کے وہاں ہجرت کر گئے۔ پھر وہاں سے مکہ شریف واپس آئے تو اہلیہ محترمہ بھی ہمراہ تھیں۔ دوبارہ پھر حبشہ کی طرف ہجرت کی تو بھی حضرت رقیہؓ ساتھ تھیں۔ پھر جب نبی اکرمؐ نے مدینہ کو دارالاسلام بنایا تو حضرت عثمانؓ بھی مدینہ میں ہجرت کر آئے۔ جب آپ صحابہ کرامؓ کے ساتھ بدر کے معرکے میں گئے تو حضرت عثمانؓ مدینہ ہی میں رہے۔ کیونکہ حضرت رقیہؓ بیمار تھیں اور آپؐ نے انھیں ان کی تیمار داری پر مقرر فرمایا تھا۔ خدا نے جنگِ بدر میں مسلمانوں کو فتح عطا کی تو رسول اللہ نے حضرت عثمانؓ کو بھی مجاہدین میں شمار کرتے ہوئے مالِ غنیمت میں انھیں برابر کا شریک فرمایا۔ جب حضرت رقیہؓ فوت ہو گئیں تو حضرت عثمانؓ نے ان کی وفات نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ منقطع ہو جانے پر شدید رنج وغم کا اظہار کیا۔ لیکن آپؐ نے حضرت رقیہؓ کی ہمشیرہ حضرت اُمّ کلثومؓ کے ساتھ ان کی شادی کر دی۔ لیکن وہ بھی تھوڑی مدت ان کے ساتھ رہ کر وفات پا گئیں۔

سیرت نگاروں کی روایت کے مطابق آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ ہمارے یہاں کوئی اور بیٹی ہوتی تو ہم اسے بھی حضرت عثمانؓ سے بیاہ دیتے۔ حضرت رقیہؓ کے بطن سے حضرت عثمانؓ کے ایک فرزند عبداللہ پیدا ہوئے تھے۔ جو چھ برس کے ہو کر فوت ہو گئے۔ گویا رسولؐ خدا کی صاحبزادی کے توسط سے حضرت عثمانؓ کی نسل چلتے چلتے رہ گئی۔ اگر ان کے یہ فرزند عبداللہ زندہ رہتے تو ان کی اور ان کے باپ کی ایک عجیب ہی شان ہوتی جو حضرت فاطمہؓ کے صاحبزادوں حضرت حسنؓ و حضرت حسینؓ سے کچھ کمتر نہ ہوتی۔

حضرت عثمانؓ نبی اکرمؐ کے دوش بدوش جنگِ احد میں شریک ہوئے۔ مگر اُس وقت بھی جماعت کے ساتھ جم کر مقابلہ نہ کر سکے جو رسولؐ اکرم کے جلو میں پامردی کے ساتھ ڈٹی رہی تھی۔ وہ ہزیمت خوردگان کے ہمراہ فرار ہو گئے[1] لیکن خداوند عزّوجل نے

---

[1] یہ تاریخ کا بیان ہوگا۔ قرآن کریم نے کسی کا نام نہیں لیا۔

اس آیت کریمہ کے ذریعے ان کا یہ قصور معاف کر دیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا کَسَبُوْا وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ۝ (۳: ۱۵۵)

بلاشبہ وہ لوگ جنہوں نے دونوں لشکروں کے مقابلہ کے وقت اپنے منہ موڑ لئے ان کے بعض اعمال کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم پھسلا دیئے تھے۔ خدا نے ان سے درگزر کیا ہے۔ بیشک خدا بہت بخشش والا اور بردبار ہے۔

حضرت عثمانؓ کی نمایاں شخصیت

بعد ازاں حضرت عثمانؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دیگر صحابہ کبارؓ کی طرح تمام غزوات میں شریک ہوئے مزید برآں وہ راہِ خدا میں بڑی فیاضی و سخاوت اور کشادہ دستی سے کام لیتے تھے انھوں نے اس ضمن میں وہ کچھ کر دکھایا جو اس زمانہ کے دوسرے دولت مند مسلمانوں سے نہ ہو سکا۔ ہزاروں کے صرف سے انہوں نے چاہ رومہ خرید کر تمام مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا، وہ خود بھی اس میں سے بغیر کسی خصوصیت کے عام مسلمانوں کی طرح پانی بھرتے تھے۔ اس پر رسولِ خدا نے وعدہ کیا تھا کہ انہیں جنت میں اس سے بہتر کنواں عطا ہو گا۔ جب مسجد نبوی میں لوگوں کی کثرت کی وجہ سے جگہ تنگ ہوئی تو وہ قطعۂ زمین بھی حضرت عثمانؓ نے ہی خریدا تھا جس کے ذریعہ سرکارِ دو عالمؐ نے مسجد نبوی کی توسیع فرمائی تھی۔ آپؐ نے حضرت عثمانؓ سے وعدہ کیا کہ انھیں جنت میں اس قطعۂ ارضی سے بہتر قطعہ ملے گا۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب بہت زیادہ تنگی کا احساس ہوا تو آپؐ نے مسلمانوں کو راہِ خدا میں انفاق کی دعوت دی۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے تمام لشکر کے ساز و سامان کی تیاری اپنے ذمے لے لی۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے گھوڑے اور اونٹ مہیا کر کے اہلِ لشکر کی سواری کی جملہ ضروریات بھی پوری کیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک ہزار دینار لا کر آغوشِ رسولؐ میں ڈال دیئے تھے۔ جن کے ذریعہ آپؐ نے لشکر کا ساز و سامان تیار کیا۔ اس موقع پر آپؐ نے خدا سے دعا کی کہ حضرت عثمانؓ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں۔ ساتھ ہی حضرت عثمانؓ سے، جنت کا وعدہ بھی فرمایا۔

خدمتِ خلق کے معاملے میں حضرت عثمانؓ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ وہ مسلمانوں کے لئے نہایت نرم و شفیق، صلۂ رحمی کا سب سے زیادہ خیال رکھنے والے، جذبۂ سخاوت و قربانی سے سرشار اور پیکرِ حلم تھے۔ حضرت عثمانؓ کی وہ امتیازی صفت جسے محدثین اور سیرت نگاروں نے آنحضرتؐ سے روایت کیا ہے ان کی کمال حیاداری تھی۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ فرشتے بھی عثمانؓ سے حیا کرتے ہیں۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرامؓ سے جس حال میں بھی ہوتے بے تکلف مل لیا کرتے تھے، مگر جب حضرت عثمانؓ کو

باریابی بخشتے تو سنبھل بیٹھتے ۔ اور فرماتے کہ جس شخص سے فرشتے حیاء کرتے ہیں ہم کیوں نہ کریں ۔ آپؐ اس احتیاط کا سبب بھی بتایا کرتے تھے کہ اگر ہم ایسا نہ کریں تو حضرت عثمانؓ شرما کر اپنی ضرورت بتائے بغیر جلدی سے واپس چلے جائیں گے ۔ صلح حدیبیہ کے موقع پہ رسولِ خدا نے قریش کے پاس انھیں کو سفیر بنا کر بھیجا تھا اس وجہ سے کہ اولاً انھیں بنی امیہ اور قریش میں بڑی وقعت حاصل تھی ، ثانیاً اپنی نرم خوئی ، خوش خلقی اور وسعتِ قلبی کے لحاظ سے بھی وہ اس کام کے لئے موزوں شخصیت تھے ۔ لیکن جب خبر آئی کہ وہ قریش کی سازش کا شکار ہو گئے ہیں تو رسول اکرمؐ نے ان کی اعانت کے لئے تمام صحابہ کرامؓ سے بیعت لی ، اس موقع پہ خدا نے وحی نازل فرمائی ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (فتح)

بے شک جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ گویا خدا سے بیعت کر رہے ہیں ۔ ان کے ہاتھوں پہ اللہ کا ہاتھ ہے اور جو عہد توڑے گا اس کا وبال خود اسی پہ پڑے گا ۔ اور جو خدا کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو پورا کرے گا اسے خدا بہت بڑا اجر دیگا ۔

رہے حضرت عثمانؓ تو آنحضورؐ نے اپنے ہی ایک ہاتھ سے حضرت عثمانؓ کی جانب سے بیعت کی ۔ اس واقعہ سے متعلق محدثین و اصحاب سیر نے بہت سی احادیث نقل کی ہیں جن میں بعض واضح طور پر صحیح ہیں اور بعض صاف طور پہ وضعی ہیں اور بعض ایسی ہیں جن میں تھوڑے بہت شک کی گنجائش موجود ہے ۔ تاہم مجموعی طور پہ تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب اور آپؐ کے مقربین خصوصی صحابہ میں شامل تھے ۔ آپؐ نے انھیں متعدد بار جنت کی خوشخبری دی تھی اور بتایا تھا کہ خدا ان سے راضی ہے ۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ عہد نبوی میں مسلمان ابوبکر ، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کو سب سے مقدم سمجھتے تھے ، اور باقی صحابۂ رسولؐ میں کسی پر فضیلت نہ دیتے تھے ۔ گویا یہ اصحابؓ ثلاثہ (بشرطیکہ یہ حدیث صحیح ہو) خود عہدِ رسولؐ میں بھی تمام صحابہؓ میں سر برآوردہ تھے ۔ بہر حال قدماء نے جن دس اشخاص کے اسماء نقل کئے ہیں کہ انھیں رسولِ خدا نے جنت کی بشارت دی تھی وہ یہ ہیں " حضرت ابوبکرؓ ۔ حضرت عمرؓ ۔ حضرت عثمانؓ ۔ حضرت علیؓ ۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ ۔ حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ ۔ حضرت زبیر بن العوامؓ ۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ اور حضرت سعید بن زید بن نفیل ۔ مطلب یہ ہے کہ ان دس میں ایک حضرت عثمانؓ بھی تھے ۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں جسے معلوم نہ ہو کہ وہ سابقون الاوّلون میں سے تھے ۔ انہیں دوبارہ حضور اکرمؐ کی داماد ی کا شرف حاصل ہوا تھا اور انھوں نے راہ خدا میں جانی و مالی جہاد کیا تھا ۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی اور حضرت ابوبکرؓ کی بیعت ہونے لگی تو حضرت عثمانؓ ان لوگوں میں

سے تھے جنھوں نے دوڑ کر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی اور اظہارِ خلوص و خیر اندیشی کیا۔ حضرت عمرؓ کے خلیفہ بنائے جانے کے بارے میں حضرت ابوبکرؓ کی وصیت حضرت عثمانؓ نے ہی املا کی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ بولتے رہے حضرت عثمانؓ لکھتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ یہ وصیت لکھوا رہے تھے تو انھیں غشی کا دورہ پڑا۔ اس وقت ان کی زبان پر یہ الفاظ تھے: "میں تمہارے لئے خلیفہ بنائے جاتا ہوں ......"، تو حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوبکرؓ کا جملہ مکمل کرنے کے لئے آگے "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو" کے الفاظ لکھ دیئے۔ جب حضرت ابوبکرؓ کو ہوش آیا تو انھوں نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ جو لکھا ہے سنائیں۔ حضرت عثمانؓ نے پڑھ دیا۔ جب حضرت عمرؓ کا نام ان کے منہ سے نکلا تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا اللہ اکبر۔ اور حضرت عثمانؓ کو اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر کی دعا دی۔ اور کہا "آپ کو خدشہ ہوا کہ مبادا میں ہوش میں نہ آؤں اور وہ بات لکھ دی جو میرے دل میں تھی اور آپ بلاشبہ اس کے اہل ہیں"۔ چنانچہ جب حضرت عمرؓ کی بیعت کی گئی تو حضرت عثمانؓ سب سے اوّل بیعت کرنے والوں میں سے تھے۔ وہ حضرت عمرؓ کے تمام عہدِ خلافت میں ان کے خیر خواہ و مشیر رہے۔ حتیٰ کہ جب حضرت عمرؓ بیمار ہوا اور انھوں نے مسلمانوں کو اپنے پاس وصیت کے لئے بلایا۔ وہ مسلمانوں کو کسی عہد کا پابند نہیں کرنا چاہتے تھے مگر یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ انھیں کوئی مشورہ ہی نہ دیں۔ لہٰذا، انھوں نے مسلمانوں کے لئے ایک مجلسِ شوریٰ قائم کر دی جس کا ان چھ اصحاب کو رکن مقرر کیا جن سے رسولؐ خدا تادمِ آخر راضی تھے لیکن انھوں نے اپنے چچازاد بھائی حضرت سعید بن زید بن نفیلؓ کو رکن نہ بنایا حالانکہ وہ ان دس میں سے تھے جنھیں رسول اللہؐ نے جنت کی بشارت دی تھی، اس لئے کہ انھیں یہ گوارا نہ ہوا کہ بنی عدی میں دو بار خلافت آجائے۔ انھیں خطرہ تھا کہ اگر انھوں نے حضرت سعیدؓ کو رکنِ "شوریٰ" بنا دیا تو بعض ارکانِ شوریٰ ان کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ کچھ تو اس سبب سے کہ رسولؐ خدا ان سے راضی تھے۔ کچھ اس وجہ سے کہ وہ حضرت عمرؓ کے اقربا میں سے تھے۔ البتہ انھوں نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہؓ کو شوریٰ کا رکن مقرر کر دیا تھا۔ مگر یہ شرط لگا دی تھی کہ انھیں خلیفہ نہ بنایا جائے گا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انھیں آلِ خطاب ہی میں سے دو آدمیوں کا ایک دوسرے کے بعد خلیفہ بننا پسند نہ تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انھیں اپنے فرزند (حضرت عبداللہؓ) میں بارِ خلافت اٹھانے کی ہمت نظر نہ آتی تھی۔

میرا خیال ہے کہ اگر حضرت ابوبکرؓ کی عمر وفا کرتی اور ان کے سامنے حضرت عمرؓ کی طرح فتوحات ہوتیں۔ مملکت کے علاقہ میں وسعت ہوتی اور کاروبارِ سلطنت پھیلتا۔ انواع و اقسام کی پُرپیچ مصلحتیں اور ضروریات نئی نئی صورتوں میں نمودار ہوتیں، نت نئی مشکلات سے سابقہ پڑتا جن میں سے بعض کا تعلق سیاسی معاملات سے، بعض کا انتظامِ سلطنت سے اور بعض کا تعلق ان دینی حقائق کی حفاظت سے تھا جو روز افزوں شدت اختیار کرنے والے انقلاب کی وجہ سے مسلمانوں کو درپیش تھیں۔ تو میرا خیال یہی

ذرا تصور کی دنیا میں آیئے

ہے کہ اگر حضرت ابوبکرؓ ان حالات سے گزرتے جن سے حضرت عمرؓ دوچار ہوئے تو عین ممکن تھا کہ وہ بھی حضرت عمرؓ کی روش اختیار کرتے ہوئے کسی ایک جانشین کو نامزد کرنے میں حضرت عمرؓ کی طرح لیس و پیش کرتے اور عین ممکن تھا کہ وہ بھی انتخابِ خلیفہ کے لئے ایسا ہی نظام بنا دیتے جو حضرت عمرؓ کی "مجلس شوریٰ" سے کم و بیش مشابہ ہوتا۔ جب حضرت ابوبکرؓ کی وفات ہوئی تو مسلمانوں کی کیفیت تقریباً وہی تھی جو رسولؐ خدا کی وفات کے وقت تھی۔ انھوں نے مرتد ہونے والے عربوں کو دوبارہ حلقہ بگوش اسلام کیا اور پھر عربوں کی قوت کا رُخ بیرونی ممالک کی فتوحات کی طرف کر دیا، چنانچہ فتوحات شروع ہوگئیں۔ لیکن بڑے پیمانہ پر نہیں، حتیٰ کہ حضرت ابوبکرؓ فوت ہوگئے۔ پھر عہد فاروقی میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مسلمان ہر پہلو سے ایک نئی زندگی میں داخل ہوئے تھے۔ وہ سیلاب کی طرح نئے علاقے فتح کرتے چلے جا رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے رومیوں کو جزیرۂ عرب، شام اور مصر سے نکال باہر کیا۔ ایران میں ایرانیوں کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اس کا بہت بڑا حصہ زیرنگیں کرلیا۔ صورتِ حال یہ پیدا ہوگئی کہ وہ دور تک بڑھ جانے کی وجہ سے فتوحات کو مزید بڑھانے پر مجبور رہے تھے تاکہ انھیں اپنے سے ایک قابلِ اطمینان فاصلہ تک دور ہٹا دیں بلکہ قسطنطنیہ پہنچ کر رومن حکومت کا اسی طرح خاتمہ کردیں جس طرح ملک فارس کا کرچکے تھے۔ پھر بلادِ ایران کا آخری حد تک بڑھ کر اسے پوری طرح مغلوب کرلینا چاہتے تھے تاکہ مشرق میں حدودِ سلطنت اس آخری حد تک پھیلا دیں جہاں تک ان کے لشکر پہنچ سکیں۔ اس چیز نے انھیں مجبور کیا کہ وہ ایک ایسا ٹھوس اور پائیدار جنگی نظام قائم کریں جو فتوحات کی وسعت اور پھیلاؤ کا ساتھ دے سکے۔ لہٰذا، ضروری ہوا کہ وہ اپنے پیہم فتوحات کے لئے مستقل ذریعہ و آلہ پیدا کریں۔ یہ ذریعہ وہ لشکر تھے جو اس آخری حد پر جاکر رکتے تھے جس کا انھیں حکم دیا جاتا تھا۔ یہ لشکر اس عجیب و غریب مادہ یعنی عرب کے بدوؤں سے تشکیل پاتا جو ابھی تک منظم اور گھمسان کی جنگ کے عادی نہ تھے۔ لیکن حملہ آور غارت گری میں خوب ماہر تھے۔ وہ ان غیر معروف علاقوں میں تربیت یافتہ افواج کا مقابلہ کرنا نہیں جانتے تھے۔ نہ انھیں یہ خبر تھی کہ وہاں انھیں کیا کیا سختیاں جھیلنا ہوں گی۔ اور کن کن مصائب سے دوچار ہونا ہوگا۔

ہم فتوحاتِ اسلامی کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ عربوں کے پاس یہ قوت و سرعت اور بڑھتے چلے جانے کی طاقت کہاں سے آگئی تھی جب سمجھ میں کچھ نہیں آتا تو تحلیل و تجزیہ کی مدد سے دل کو تسلی دے لیتے ہیں اور اس عظیم قوت کا سبب اس وعدے کو قرار دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کے ذریعہ مسلمانوں سے کیا تھا۔ نیز وہ قوتِ ایمانی جو مسلمانوں کے قلوب میں جاگزیں تھی جس نے انھیں خدا پر بھروسہ کرکے شدائد کے سامنے سینہ سپر کردیا تھا۔ اور انھیں یہ یقین دلا رکھا تھا کہ خدا کا وعدہ سچا ہے اور وہ خواہ کسی ملک میں بھی ہوں خدا کی مدد شاملِ حال ہوتی ہے۔ بیشک یہ سب کچھ صحیح ہے کہ مسلمان فتح ممالک کی طرف اسی قوی ایمان کی بدولت ٹوٹ پڑے تھے جو شدائد کو زیر کرکے مشکلات

پر قابو پالیتا ہے اور ہر مشکل کو حل کرلیتا ہے۔ تاہم ہر شے کے کچھ اسباب و وسائل ہوتے ہیں۔ اور ان اسباب و وسائل کے لئے ضروری ہے کہ پوری جدوجہد، مکمل تدبیر، بڑی دوراندیشی اور عقلمندی سے کام لے کر اولاً ان سب منتشر دلوں کو یکجا کیا جائے اور ثانیاً ان کا رُخ بیرونی ممالک کی یورشوں کی طرف پھیر دیا جائے۔ نیز یہ کہ وہ منظم اور حیرت انگیز طاقتیں انھیں کے برابر کی منظم طاقتوں سے ٹکرائیں۔

بہر حال اس قوی عظیم اور منظم لشکر کا تیار کرنا جسے حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے عالم قدیم کے آخری سروں تک پھیلا دیا تھا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ کام بھی سہل نہ تھا کہ ان معرکوں اور سالہا سال کی فتح مندی کے بعد اتنے بڑے لشکروں کو ان کے مستقر پر روک رکھا جائے کیونکہ ہم عربوں کی یورشوں اور جنگوں کی قدیم عادت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ان کی جنگ حصولِ فتح اور مال غنیمت کے لئے ہوتی تھی۔ فتح حاصل کرکے، مالِ غنیمت سمیٹ کر وہ اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے تھے تاکہ مالِ غنیمت اور امن کی آسائشوں سے پوری طرح متمتع ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ جب وہ چڑھائی کرتے تھے تو اس وقت آگا پیچھا کچھ نہ دیکھتے تھے۔ بایں ہمہ یہ بھی مدنظر رہے کہ ان جنگوں کو زمانۂ جاہلیت کی جنگوں یا غزواتِ نبویؐ سے بلکہ عہد ارتداد کی جنگوں سے بھی کوئی مماثلت نہ تھی۔ یہی وہ نئی چیز ہے جو بہت زیادہ جدوجہد کی محتاج تھی جس کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ لیکن حضرت عمرؓ، ان کے ساتھیوں اور سپہ سالاروں نے بڑی ہمت اور جرأت اور مستعدی و چستی اور احتیاط و عزم کے ساتھ بلاتردد اپنی کوششیں صرف کیں اور خدا نے ان کی تمنائیں برلانے کی انھیں توفیق بھی عطا فرمائی۔ ہمارے تصور کے لئے یہی کافی ہے کہ انھوں نے نئے نئے شہر بسائے۔ ان شہروں میں لشکر متعین کئے ہر ایک لشکر کی نوبت اور باری مقرر کی۔ پھر ذرا یہ بھی خیال کیجئے کہ یہ لشکر ان صحرانشینوں پر مشتمل تھے جو سب کے سب یا جن کی اکثریت تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھی۔ الغرض اگر ہم ان جملہ کوائف کو پیش نظر رکھیں تو بعض ایسی اہم مشکلات کا اندازہ کرسکتے ہیں جن سے حضرت عمرؓ اور ان کے ساتھی بخوبی عہدہ برآ ہوئے۔

اسی طرح تاریخ میں جب ہم "تدوین دواوین" (رجسٹروں میں اندراج) کا ذکر پڑھتے ہیں تو حیرت و عجلت سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہم تھوڑی دیر توقف کریں اور "تدوین دواوین" کے معاملہ پر غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ

تدوین دواوین اور نظام عسکری

چھوٹا سا کلمہ نہایت باریکی سے جنگ میں شرکت کرنے والوں کی مردم شماری، ان کے قبیلوں اور ان کے پتوں کے بیان کا نام تھا نیز ان کے ایسے اعزہ کے ناموں پر مشتمل تھا جن کی وہ کفالت کرتے تھے اور جن کی ذمہ داری ان کی طرف سے حکومت پر عائد ہوتی تھی۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ ایک اہم جدت تھی جو ایک ایسی قوم میں رونما ہوئی جو اس سے قبل نوشت و خواند اور

حساب وشمار سے یکسر ناآشنا تھی یہ کوئی ایسی معمولی سی بات نہیں کہ لوگ اس پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے گزر جائیں مگر ہم ان جیوش کے ہمراہ میدان میں اور پھر عساکرِ روم وفارس کے خلاف عظیم معرکہ آرائیوں کے بعد اُن شہروں کا معائنہ کریں جہاں ان کو ٹھہرایا گیا اور ازاں بعد اس شاندار انتظام پر غور کریں جو حضرت عمرؓ نے ان اصحاب کے مشورہ سے ان مختلف شہروں میں ٹھہرائے ہوئے لشکریوں کی باری کے لئے مقرر کیا تھا اس طرح کہ کوئی مجاہد کسی جنگ میں شامل ہونے کے باعث اپنے اہل وعیال سے چھ ماہ[1] سے زیادہ جُدا نہ رہے اور اس میعادِ مقررہ سے زیادہ عرصہ کے لئے جنگ آزماؤں کے روکنے سے خود حکومت اس طرح محترز ہو جیسے وہ کسی گناہ کا ارتکاب کر رہی ہے تو اس وقت صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ خلیفہ اور ان کے ساتھیوں نے جنگی نظام کی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کس قدر مسلسل مادی ومعنوی محنت ومشقت سے کام لیا تھا۔

پھر یہ فقط نظامِ جنگ ہی کی مشکلات نہ تھیں جن کی طرف خلیفہ اور ان کے اعوان ومشیران کی توجہ مبذول رہتی تھی بلکہ ساتھ ہی ساتھ انتظامی مشکلات بھی تھیں جو جنگی مشکلات سے کسی طرح کم اہم اور دون حیثیت نہ تھیں۔ مثلاً ایک علاقہ فتح ہوا جو تہذیب وتمدن کے اعتبار سے بہت ترقی یافتہ تھا۔ اس کا اپنا مالوف نظام تھا جو علاقائی اور ملکی اختلافات کی وجہ سے ایک خصوصیت کا حامل تھا۔ ظاہر ہے کہ بعد از فتح اس علاقہ کا نظم ونسق اسی طرح قائم کرنا ضروری تھا جیسے فتح سے قبل تھا کیونکہ فتوحات اسلامی شکست وریخت کی بجائے امن وتعمیر کی فتوحات تھیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ عربوں کے لئے ممکن نہ تھا کہ فوری طور پر ماہرِ نظم ونسق ہو جاتے اور زمامِ حکومت اس چابکدستی کے ساتھ سنبھال لیتے کہ محکوموں کے فتنوں سے بھی جو ان کے (عربوں کے) پسِ پشت رونما ہو سکتے تھے خود کو بچاتے اور محکوموں کو ان کے جان ومال اور وسائل پیداوار کے حفظ وسلامتی کا یقین دلاتے اور ان محکوموں کو اس حال میں رکھتے کہ امن قائم کرنے نیز آگے جنگ جاری رکھنے اور فتوحات کو وسیع کرنے میں ان کی راہ نہ روکتے لہٰذا وہ مجبور تھے کہ ہر علاقہ میں وہی نظم وضبط بحال رکھیں جو بوقت فتح وہاں نافذ پذیر تھا اور پھر اس کی نہایت ہوشیاری سے ایسی نگرانی کرتے رہیں جو انھیں ہر قسم کے مکر وفریب، اس علاقہ کی بغاوت اور حملۂ ناگہانی سے محفوظ رکھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ کوئی آسان کام نہ تھا۔

ان مشکلات کے علاوہ کچھ مشکلات اور بھی تھیں جن کا خود بلادِ عرب سے تعلق تھا۔ حکومت کے لئے ضروری تھا کہ ایسی حکمتِ عملی سے کام لیتی کہ اس صحرا نشین آبادی میں جو اطاعت وفرمانبرداری کی عادی ہی نہ تھی ایسے عالم میں ضبط قائم رہتا جب کہ حکومت کو اسی آبادی سے نوجوان اور قوی ہمت مرد بھرتی کرکے انھیں دور دراز کے علاقوں میں بھیجنا ہوتا تھا جہاں سے ممکن ہے وہ زندہ لوٹ سکیں یا نہ لوٹ سکیں۔ ہم بڑے آرام سے آج کسی نئی قوم کے متعلق خبر پڑھ لیتے ہیں کہ اس نے اپنے ملکی ظروف کے ماتحت عمومی لام بندی یا جبری بھرتی کا اعلان کر دیا، ہم اس پر حیرت وپسندیدگی کے ملے جلے جذبہ

[1] ۔ آیۂ ایلاء (۲/۲۲۶) سے مستنبط یہ عرصہ چار ماہ کا تھا۔

کا اظہار کرتے ہیں لیکن ہم اس عمومی لام بندی اور اس کی مشکلات کی باریکیوں پر غور نہیں کرتے۔ ہم یہ اندازہ ہی نہیں کرتے کہ اس عمومی لام بندی کا جو آج اقوام جدید میں کارفرما ہے ایک محکم و متعین نظام ہے جو اچانک پیدا نہیں ہوا بلکہ اسے دقیق تجربات اور طویل امتحانات نے جنم دیا ہے۔ لہٰذا، ایک ایسی صحرانشین قوم کے لئے اس ضبط و نسق کا قائم رکھنا بڑا مشکل تھا جس کا بڑی جنگوں اور منظم لام بندی سے کبھی سابقہ ہی نہ پڑا ہو۔ اور جسے ان امور سے کسی سابقہ تجربہ اور علم کے بغیر پہلی بار سامنا کرنا پڑا ہو۔

یہ ہے ان مشکلات کا معمولی سا خاکہ جن سے حضرت عمرؓ کو دوچار ہونا پڑا۔ اور جن سے حضرت ابوبکرؓ بھی اگر وہ کچھ اور مدت زندہ رہتے تو ضرور دوچار ہوتے۔ لہٰذا، طبعی طور پر حضرت عمرؓ کے جانشین خلفاء کا ان سے دوچار ہونا لابدی تھا۔ اندریں حالات اگر حضرت عمرؓ اپنی خلافت کے زمانہ میں مشقت عظمیٰ میں مبتلا رہے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتے رہے اور پوری سنجیدگی اور سرگرمی کے ساتھ مصروف عمل رہے کہ نہ خود سوتے نہ دوسروں کو سونے دیتے تھے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں اور اگر وہ اپنے اصحاب و معاصرین میں سے کسی ایسے شخص کو تلاش نہ کرسکے یا قابل اطمینان نہ سمجھ سکے جس میں ان مشکلات سے بلکہ ان سے بھی زیادہ پُرپیچ اور کٹھن معاملات سے دوچار ہونے کی صلاحیت ہوتی اور جسے وہ اپنا خلیفہ بناتے تو اس میں بھی کوئی حیرت و تعجب کی بات نہیں۔

پھر ایک مشکل یہ بھی تھی کہ یہ تمام الجھنیں صرف نظم و نسق یا سیاست اور جنگ ہی سے متعلق نہ تھیں بلکہ یہ مشکل اس دینی میراث کی وجہ سے پیچیدہ شکل اختیار کرگئی تھی جس کی نگہداشت اور حفاظت خلیفہ کا فرض تھا۔ نیز یہ بھی ضروری تھا کہ اس کی روش بھی وہی ہوتی جو حکم ربی کے تحت رسول خدا کی تھی۔ اگر معاملہ محض فتح۔ ضبط و نسق اور سیاست ہی تک محدود ہوتا تو عربوں نے بھی وہی راہ اختیار کی ہوتی جو بدویت سے تمدن، ضعف سے قوت اور عجز و درماندگی سے تسلط و غلبہ کی جانب گامزن ہونے والی ہر قوم نے کی۔ لیکن یہ معاملہ ایک ایسی فتح کا تھا جس کے لئے اسلام کی معینہ حدود کی پابندی ضروری تھی اور جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہمہ گیر عدل کو بروئے کار لاکر مفتوحین کو فاتحین اور فاتحین کو مفتوحین کی سطح پر لا کھڑا کیا کیا جائے۔ لہٰذا، وہ تصور جسے اسلام نے پیش کیا اور جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ نے سمجھا مطلب حاصل کرنا اور ٹیکس جمع کرنا نہیں تھا بلکہ اس کی غرض و غایت عوام کی اصلاح اور ان کی صحیح رہنمائی تھی۔ اندریں صورت خلیفہ کے لئے لازمی تھا کہ وہ اپنی سیاسی انتظامی اور جنگی ذمہ داریوں میں ایک اور ذمہ داری کا اضافہ کرے جو ان تمام ذمہ داریوں سے زیادہ مشکل اور دقت طلب تھی اور وہ تھی دینی حمایت و حفاظت کی ذمہ داری تاکہ محکوم اپنے مکر و فریب سے اور حاکم ناجائز فائدہ اٹھاکر اسے کمزور نہ کردے۔ نیز اسے ان لوگوں کی سستی اور بے پروائی سے بچایا جائے جو اس کی حفاظت پر

مامور ہوں اور جن کا فرض یہ ہو کہ وہ حفاظت و حمایت دین کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہ کریں خواہ وہ ملامت کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو۔

ان کے علاوہ ایک اور میراث بھی تھی جس کے بارے میں سوچنا حضرت عمرؓ کے لئے لازم تھا۔ تاکہ مصالح عامہ اور حقائق دین کے درمیان ہم آہنگی و مناسبت پیدا کی جائے تو وہ میراث یہ جدید ارستقراطیت (ARISTOCRACY) تھی جو اولاً صحابۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ممتاز طبقہ کی صورت میں اور ثانیاً فتح مند سپہ سالاروں کی شکل میں جلوہ گر ہوئی۔ ایسی ارستقراطیت جو ایک گروہ کو دین کی طرف سے حاصل ہوئی اور ایک گروہ کو دنیا کی طرف سے حاصل ہوئی اور ایک تیسرے فریق کو وہ دین و دنیا دونوں طرف سے حاصل ہوئی۔

بطور مثال ایک صحابی کو لیجئے جنھیں اسلام لانے میں سبقت، دو ہجرتیں کرنے اور رسولِ خدا کے ساتھ تمام جنگوں میں شرکت پھر مدینہ کی اقامت کے باعث دینی ارستقراطیت حاصل تھی۔ پھر ایک قریشی یا عام عرب کو لیجئے جو بعد میں اسلام لایا لیکن اس نے جنگیں فتح کرنے میں نہایت جاں فروشی کا ثبوت دیا اور فاتحین میں ممتاز حیثیت حاصل کر لی یہ دنیوی ارستقراطیت کا مالک ہے پھر وہ ایک صحابی ہے جس نے اسلام لانے میں سبقت کی۔ خدا اور رسول کی خاطر ہجرت اختیار کی۔ پھر رسول اکرمؐ کے ہمراہ تمام جنگوں میں شرکت کی۔ پھر آپؐ کے بعد بھی دوسری جنگوں کو فتح کرنے میں امتیاز حاصل کیا۔ انھیں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی ارستقراطیت حاصل تھی۔ چنانچہ خلیفہ کے لئے لابدی تھا کہ اپنا جانشین مقرر کرتے وقت ان مختلف مصالح کے مابین مناسبت پیدا کرتا اور اُن پُرپیچ مسائل کا کوئی ایسا حل تلاش کرتا جو مصالح دینی و دنیوی کے پیش نظر بھی موزوں ہوتا اور رائے عامہ بھی اسے اپنے لئے پسند کرتی۔ لہٰذا، اگر حضرت عمرؓ نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا یا جب ان سے جانشین مقرر کرنے کا مطالبہ کیا گیا تو وہ متردد ہوئے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہ تھی بلکہ اگر وہ اس کے برعکس عمل کرتے تو یقیناً تعجب ہوتا۔ حضرت عمرؓ نے اس مسئلہ کی خاطر تنگی و تکلیف کے دنوں میں امکانی کوشش کی۔ لیکن موت نے انھیں مہلت نہ دی کہ وہ اس مسئلہ پر زیادہ دیر سوچ سکتے اور ان بلند مرتبہ اور سربرآوردہ صحابہ کرامؓ سے مشورہ لے سکتے جو ان کے ارد گرد موجود تھے۔

نظام شوریٰ اور اس پر تنقید

بہر حال حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے "شوریٰ" کا جو نظام قائم کیا تھا وہ نقائص سے خالی نہ تھا بلکہ ممکن ہے کہ اس میں شدید نقائص رہ گئے ہوں۔ سب سے پہلے جو بات ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ اس مجلس کی تنگی اور محدودیت ہے۔ انھوں نے اس مجلس کے کل سات رکن مقرر کئے جن میں سے ایک رکن (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) کو فقط مشورہ دینے کی اجازت تھی۔ خلافت کی امیدواری کے وہ

مجاز نہ تھے۔ گویا وہ واحد مشیر تھے جن کے پیش نظر کسی قسم کی کوئی غرض نہ تھی۔ چنانچہ ان مشیروں نے جمع ہوتے ہی اس بہت بڑی آفت کو بھانپ لیا جو ان کی مجلس کو کسی اور ہی راہ پہ لگا دے گی اور وہ آفت یہ تھی کہ ان مشیروں میں سے ہر ایک امیدوارِ خلافت تھا۔ لہٰذا، ہر ایک کو ایسا غیر معمولی بارگراں کا متحمل ہونا تھا جس کا لوگوں کو شاید ہی کبھی تجربہ ہوا ہو۔ اس لئے نہیں کہ ایک محض حکومت کی خاطر اپنے آپ کو ترجیح دے رہا تھا بلکہ اس لئے کہ ہر ایک اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے خیال سے ایسا کر رہا تھا۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ بہ خلوصِ خاطر یہ سمجھتا تھا کہ وہ بارِ خلافت کو اٹھانے اور اس کی کماحقہٗ حفاظت کرنے کا سب سے زیادہ اہل ہے۔ چنانچہ جن لوگوں پہ ان مشیروں کی پاسبانی کا فرض عائد کیا گیا تھا انھیں یہ دیکھ کر انتہائی قلق ہوا کہ مشیر بغیر کسی نقطۂ اتفاق کے باہم جھگڑ رہے تھے۔ اور بغیر کسی موافقت کے ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ ان پاسبانوں کے سربراہ حضرت ابوطلحہؓ کہہ اٹھے کہ مجھے یہ خدشہ ہرگز نہیں تھا کہ ان میں رسہ کشی ہوگی۔ خدشہ یہ تھا کہ ان میں سے ہر ایک اس بارگراں کو ایک دوسرے پہ ڈالنے کی کوشش کرے گا۔

حضرت ابوطلحہؓ اپنی سادگی و پاکیزگیٔ قلب کی بنا پر حضرت عمرؓ سے اس خیال میں متفق تھے کہ خلافت ایک بارگراں ہے جس کو اٹھانے کی حرص نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ دین و دنیا کی عافیت کے خیال سے آدمی کو اس سے دور ہی رہنا چاہیئے۔ لیکن مشیروں کی رائے یہ نہ تھی۔ ان کی رائے یہ تھی کہ خلافت ایک ایسا فرض ہے جس کا بار اٹھانے کے لئے خواہ وہ بار کتنا ہی ثقیل کیوں نہ ہو ایک دوسرے سے مسابقت کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اگر ان کے بارے میں گمان نیک رہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ نہ رہیں تو اس سے انہیں قربِ الٰہی حاصل ہوگا اور اگر ان کے بارے میں لوگوں کی آراء مبنی بر صداقت ہوں گی اور کوئی وجہ نہیں کہ نہ ہوں تو اس سے انھیں عوام کی خدمت کرنے کا موقع ملے گا۔ اس آفت سے جو مشیر سب سے پہلے خبردار ہوا اور جس نے اس کے مداوا کی کوشش کی وہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ تھے۔ چنانچہ انھوں نے تجویز پیش کی کہ ان میں سے ایک رکن اپنے آپ کو حقِ خلافت سے دستبردار کر لے اور پھر خلیفۃ المسلمین کے انتخاب کا اختیار اسی کو دے دیا جائے۔ یہ سن کر سب چُپ ہو گئے۔ یا کم از کم چار چپ ہو گئے۔ یعنی حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت سعدؓ، اور حضرت زبیرؓ۔ حضرت طلحہؓ نہ خاموش تھے نہ گویا کیونکہ وہ "شوریٰ" کے اجلاس میں موجود ہی نہ تھے۔ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے دیکھا کہ سب خاموش ہو گئے ہیں اور کوئی بھی بخوشی حقِ خلافت سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تو وہ خود دستبردار ہو گئے تاکہ خدا کی خوشنودی اور مومنین کی خیر خواہی کے طور پہ وہ ان پانچ میں سے کسی کو خلیفۃ المسلمین منتخب کر دیں۔ لیکن ان چاروں کا حضرت عبدالرحمٰنؓ کی اس تجویز سے متفق ہونا بھی آسان نہ تھا۔ حضرت علیؓ کو یہ خدشہ تھا کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ، حضرت عثمانؓ کی طرفداری کریں گے کیونکہ ان میں باہم نسبتی تعلق تھا۔ دوسرے تینوں کو یہ اندیشہ تھا کہ وہ بہ سببِ قرابت سعدؓ کی پاسداری کریں گے

لیکن بالآخر سب اس بات پر باہم متفق ہو گئے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ مسلمانوں کی فلاح و بہتری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں گے اور کسی ذاتی غرض و مصلحت قرابت یا نسبتی تعلق کا لحاظ نہ کریں گے۔ لہٰذا، یہ قرار پایا کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ ان میں سے جس کو بھی منتخب کریں گے اسے باقی سب خلیفہ تسلیم کرلیں گے۔

اگر حضرت عمرؓ نے "مجلس شوریٰ" کو وسعت دی ہوتی اور اس میں حضرت عبداللہ (بن عمرؓ) جیسے افراد کو بتعدادِ کثیر شامل کیا ہوتا جو شریک مجلس تو ہوتے لیکن امیدوار خلافت نہ ہوتے تو عین ممکن تھا کہ مجلس شوریٰ کو ایسی بے اعتباری اور اختلاف کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ مجھے کچھ یقین سا ہے کہ اگر حضرت عمرؓ مجلسِ شوریٰ کی تشکیل اس طرح کرتے کہ وہ امیدوارانِ خلافت ہی پر مشتمل نہ ہوتی کہ اُن میں سے جو چنا جائے وہ خلیفہ ہو جائے بلکہ وہ صرف ایسے مشیروں پر مشتمل ہوتی کہ جن کے سامنے ان چھ کے اسماء پیش کئے جاتے اور وہ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیتے تو یہ زیادہ بہترین عمل ہوتا۔ ایک اور نقطہ کی جانب نہ حضرت عمرؓ کی نگاہ گئی نہ ان کے بعد آنے والے مسلمانوں کی اور وہ یہ کہ انصار رضوان اللہ علیہم بھی مجلسِ شوریٰ کی رکنیت کے مستحق تھے۔ انھیں بھی یہ حق پہنچتا تھا کہ اپنی رائے کا اظہار کریں اور کسی اُمیدوار کے انتخاب میں شریک ہوں۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ جب تک مسلمان متفق رہتے خلافت قریش ہی کے پاس رہتی لیکن اس قاعدہ کے سمجھنے سے ہم قاصر ہیں کہ امام کے انتخاب کا حق بھی صرف قریش ہی کو ہوگا کیونکہ امام محض قریش ہی کا نہ تھا بلکہ وہ سب مسلمانوں کا امام تھا۔ لہٰذا، اس شرط کے ساتھ کہ امام قریش ہی میں سے ہوگا[1] انتخاب میں حصہ لینے کا حق سب مسلمانوں کو حاصل تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ کی اس وصیت کی وجہ سے اس زمانہ اور اس کے بعد کے زمانہ میں یہ بات مسلمانوں کے دل میں بیٹھ گئی کہ انتخاب کا حق بھی محض ارباب حل و عقد ہی کو حاصل ہے' یہ بات ہمارے علم میں نہیں کہ عہدِ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما میں بست و کشاد کے جملہ حقوق صرف قریش ہی کے پاس رہے ہوں۔ کیونکہ حضرت ابوبکرؓ نے انصار سے یہ کہہ کر کہ ہم امیر ہیں اور تم وزیر' انھیں ارباب حل و عقد میں شامل کیا تھا۔ کیونکہ ہمارے خیال کے مطابق حل و عقد وزراء کا کام ہے۔ بدیں صورت لازم تھا کہ انصار "مجلس شوریٰ" میں شریک ہوتے اور انتخاب امام میں حصہ لیتے۔ بلکہ اس کا طبعی نتیجہ یہ بھی تھا کہ مجلسِ شوریٰ میں قریش و انصار کے علاوہ عرب کے دیگر سربرآوردہ افراد سپہ سالارانِ عرب اور عمال و حکام شامل ہوتے۔ اگر "مجلس شوریٰ" اس نہج پر تشکیل پاتی تو عین ممکن تھا کہ وہ مسلمانوں کو بہت سے مفسدات کا شکار ہونے سے بچا لیتی۔

ایک اور شکل جو "مجلس شوریٰ" کی اس تشکیل میں نظر آتی ہے وہ ہے مشیروں کے اختیارات کی مہلت جس کے لئے حضرت عمرؓ

---

[1] اس قسم کی شرط مساواتِ قرآنی کے خلاف ہے

نے صرف تین دن مقرر کئے تھے اور جملہ مسلمانوں نے بھی اس محدود مہلت کو قبول کر لیا تھا، چنانچہ لازمی امر تھا کہ وہ آپس میں سے ہی کسی کو منتخب کر کے اسے خلیفہ مقرر کرتے اور یہ کہ مقامی مسلمان اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے۔ اور ازاں بعد صوبہ جات میں اس کی بیعت کے لئے تحریر کر دیتے یا اس سے زیادہ دقیق الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ خود خلیفہ ہی صوبجات کی طرف لکھ بھیجتا کہ میری بیعت کی جائے اور ساتھ ہی خلافت کے ان اختیارات سے کام لیتے ہوئے جو بیعت کرنے والوں نے اس کے سپرد کئے تھے ماتحت علاقوں میں اپنی جانب سے امر و نہی کا نفاذ بھی کر دیتا۔

مطلب یہ ہوا کہ اس نظام کی رُو سے صرف اہلِ مدینہ کو یہ مقام حاصل تھا کہ جب وہ کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے تو تمام ماتحت علاقوں کے مسلمانوں پر بھی اس کی بیعت واجب ہو جاتی تھی۔ یہ اس لئے کہ مدینہ جلیل القدر مہاجرین و انصار اور ارباب حل و عقد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا مستقر تھا۔ دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ امیر کے انتخاب میں زیادہ تاخیر پراگندہ خاطری و ابتری کا باعث بن سکتی تھی۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے صاحب عقل و بصیرت صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمرؓ کے حکم یا ان کی اجازت سے مختلف شہروں اور جنگ کے میدانوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اور یقیناً وہ اس قابل تھے کہ اگر ان سے مشورہ لیا جاتا تو وہ خیر خواہی سے مشورے دیتے۔

یہ عجلت جو بہ تقاضائے مصلحت اختیار کی گئی تھی کچھ ایسی تشویشناک نہ تھی۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عمرؓ نے اس مصلحت کے متعلق بخوبی پورا پورا اندازہ لگا لیا تھا۔ دراصل جہاں سے یہ چیز خطرناک شکل اختیار کر گئی وہ یہ تھی کہ "مجلس شوریٰ" عارضی تھی جو خلیفہ کے انتخاب ہونے اور اختیارات سنبھالنے کے ساتھ ہی ٹوٹ گئی۔ اگر حضرت عمرؓ "مجلس شوریٰ" کو وسعت دے دیتے اور اسے مستقل نظام کی صورت بنا دیتے تاکہ وہ ایک طرف تو خلیفہ کے اعمال کا جائزہ لیتی رہتی اور دوسری طرف وہی حسبِ ضرورت مسلمانوں کے لئے نئے خلیفہ کا انتخاب بھی کرتی رہتی تو اس طرح مسلمانوں کے ہاتھوں پارلیمانی نظام کی پہل ہو گئی ہوتی اور وہ اس سبقت کے مستحق بھی تھے، آپ نے حضرت عمرؓ کے طریق کار کو دیکھ لیا ہے کہ کس طرح وہ اس نظام کی طرف تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ لیکن میں آپنے وہی الفاظ پھر دُہراتا ہوں جو ابھی ابھی اوپر لکھ چکا ہوں کہ حضرت عمرؓ کو اس نظام کے بارے میں غور و فکر کرنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ اگر وہ کچھ مدت اور زندہ رہتے تو بہت ممکن تھا کہ وہ یک سوئی سے اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتے اور اس بارے میں دوسروں سے مشورہ لیتے اور بالآخر ایک ایسے نظام تک پہنچ جاتے جو ہمارے بیان کردہ نظام سے مشابہ ہوتا۔ اس صورت میں وہ عظیم حادثات رونما نہ ہوتے نہ وہ نازک مشکل پیش آتی جو حضرت عثمانؓ اور ان کے مخالف باغیوں کے درمیان پیدا ہوئی اور وہ تھا یہ سوال کہ آیا مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب کسی خلیفہ کی روش سے ناخوش ہوں تو اسے مسند خلافت سے الگ کر دیں، بلکہ یہ بھی کہ آیا خود خلیفہ کو یہ حق

حاصل ہے کہ اگر رعیت اسے تنگ کردے تو وہ خلافت سے دستبردار ہوجائے؟

بہرحال ہوا یہی کہ مشیروں نے اپنے اختیارات حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے حوالے کردیئے اور خود جاکر اپنے گھروں میں بیٹھ گئے۔ حضرت صہیبؓ حضرت عمرؓ کے حکم کے مطابق نماز پڑھاتے رہے۔ حضرت ابوطلحہؓ اور ان کے ساتھی حضرت عبدالرحمٰنؓ کے دروازے پر تین دن کی مہلت کے ختم ہونے کا انتظار کرتے رہے کہ وہ (حضرت عبدالرحمٰنؓ) اس دوران میں خلیفۃ المسلمین کا انتخاب کرلیں۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے مسلمانوں کی خاطر غور وفکر اور استخارہ ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ وہ کبھی لوگوں کے پاس جاکر اور کبھی ان کو اپنے پاس بلا کر مسلسل مشورے کرتے رہے یہ مشورے مردوں ہی تک محدود نہ تھے بلکہ انہوں نے بافضیلت عورتوں سے بھی جن میں اُمہات المومنین پیش پیش تھیں مشورے کئے۔ آخر جب تین دن گزرنے کو آئے تو انھوں نے حضرات علی اور عثمان رضی اللہ عنہما کو اپنے یہاں بلایا اور یکے بعد دیگرے ہر ایک سے تخلیہ میں بات کی حضرت علیؓ سے پوچھا کہ اگر آپ کو منتخب نہ کروں تو آپ کس کے انتخاب کا مشورہ دیں گے۔ حضرت علیؓ نے کہا۔ "حضرت عثمانؓ کا"۔ اسی طرح جب حضرت عثمانؓ سے تخلیہ میں بات کی اور یہی سوال ان سے کیا تو انھوں نے جواب دیا۔ "حضرت علیؓ کا"۔ اگرچہ اس میں کچھ شک کا احتمال ہے کیونکہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کی ان دونوں کے ساتھ جو گفتگو ہوئی اس میں کوئی تیسرا موجود نہیں تھا۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے حضرت علیؓ و حضرت عثمانؓ سے باری باری تخلیہ میں گفتگو ضرور کی تھی۔ اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ منبرِ رسولؐ پر چڑھ کر اس جگہ بیٹھے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ رسولِ کریمؐ کی نشست سے ایک درجہ نیچے اتر آئے تھے۔ حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کی نشست سے ایک درجہ اور نیچے آگئے تھے پھر جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے کہا "اگر خلیفہ ایک سیڑھی نیچے اترتا گیا تو معاملہ رُکے گا کہاں" پھر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ پر بیٹھ گئے۔[۱]

خلافت کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب

ہاں تو حضرت عبدالرحمٰنؓ منبرِ رسولؐ پر چڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف فرما ہونے کی جگہ پر بیٹھ گئے۔ اس وقت انھوں نے وہی عمامہ باندھ رکھا تھا جو انھیں آنحضرتؐ نے ایک مہم کے دوران میں عطا فرمایا تھا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بہت دیر تک خاموش رہے اور دُعا مانگی جسے لوگوں نے نہیں سُنا۔ پھر حضرت علیؓ سے کہا "ذرا میرے پاس تشریف لائیے۔ حضرت علیؓ تیزی سے اُٹھ کے ان کے پاس گئے حضرت عبدالرحمٰنؓ نے حضرت علیؓ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "کیا آپ مجھے یہ عہد دیتے ہیں کہ آپ کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ اور ابوبکرؓ و عمرؓ کے طریقہ پر کاربند رہیں گے؟" حضرت علیؓ

نے کہا "میں عہد نہیں دیتا مگر اپنی امکانی کوشش ضرور کروں گا۔" حضرت عبدالرحمٰنؓ نے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور حضرت عثمانؓ سے کہا "یہاں تشریف لائیے۔" چنانچہ حضرت عثمانؓ آگے بڑھ کر منبر کے پاس کھڑے ہو گئے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے ہاتھ بڑھا کر حضرت عثمانؓ کا ہاتھ پکڑا اور کہا "کیا آپ مجھے یہ عہد دیتے ہیں کہ آپ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے طریق عمل پر کاربند رہیں گے؟" حضرت عثمانؓ نے کہا "ہاں" حضرت عبدالرحمٰنؓ نے کہا "اے خدا تو ہمارے اس معاہدہ پر گواہ رہنا۔ اے خدا گواہ رہنا۔ اے خدا گواہ رہنا" ..... اس کے بعد لوگوں نے اٹھ کر حضرت عثمانؓ کی بیعت کرنی شروع کر دی۔ حضرت علیؓ نے بھی دوسروں کے ساتھ بلا تردد بیعت کر لی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے تردد کیا تھا، اس پر حضرت عبدالرحمٰنؓ نے کہا "اے علیؓ لوگوں کو اپنے اوپر اعتراض کرنے کا موقع نہ دو۔" اور پھر یہ آیت تلاوت کی۔

فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (۴۸ : ۱۰)

اور جو عہد توڑے گا اس کا وبال خود اسی پر پڑے گا۔ اور جو خدا کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو پورا کرے گا اسے خدا عنقریب بہت بڑا اجر دے گا۔

یہ سن کر حضرت علیؓ بڑھے اور بیعت کر لی۔ لیکن میں وثوق سے یہ کہوں گا کہ حضرت علیؓ نے پس و پیش نہیں کیا۔ اور نہ اس عہد کے یاد دلانے کی انہیں ضرورت پیش آئی ہو گی۔ کیونکہ حضرت علیؓ ایسے وعدہ وفا اور کریم النفس تھے کہ انہیں ایسی تنبیہ کی حاجت ہی نہ تھی۔ ان کی تمام سیرت سر تا سر اس پر شاہد ہے۔

مؤرخین کی موثق ترین روایت کے بموجب ذی الحجہ ۲۳ھ کے آخری دن کا سورج ابھی غروب نہ ہوا تھا کہ حضرت عثمانؓ خلیفہ منتخب ہو چکے تھے۔ اور محرم ۲۴ھ میں انہوں نے زمام خلافت سنبھال لی۔

(۰)

باب پنجم

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا آغاز

حضرت عثمانؓ کو اپنی خلافت کے پہلے ہی دن جس حادثہ سے دوچار ہونا پڑا وہ حضرت عبیداللہ بن عمرؓ کا واقعہ ہے حضرت عبیداللہؓ نے ہرمزان، جفینہ اور بنت ابی لؤلؤہ کو قتل کر دیا تھا۔ یہ واقعہ مسلمانوں کے لئے ایک نہایت کڑی آزمائش تھی۔ ابو لؤلؤہ وہی شخص ہے جس نے حضرت عمرؓ کو شہید کیا۔ حضرت عمرؓ نماز پڑھانے کے لئے بڑھے کہ اُس نے آپ کے دو شاخا خنجر گھونپ دیا۔

خلافت ملتے ہی پہلی آزمائش

لوگوں نے اسے گھیر لیا لیکن قبل اس کے کہ کچھ سوال و جواب ہوتا اس نے خودکشی کر لی۔ ایک شخص کا بیان ہے کہ وہ ابو لؤلؤہ ہرمزان سے ملا تھا۔ ہرمزان مسلمان ہو چکا تھا۔ جفینہ عیسائی تھا۔ وہ تینوں بڑی رازدارانہ سرگوشیاں کر رہے تھے اور یہی خنجر اُن کے ہاتھوں میں تھا۔ جسے وہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ جب وہ شخص ان کے قریب پہنچا تو وہ کھڑے ہوگئے اور خنجر ان کے ہاتھ سے گر پڑا۔ بہر حال جب حضرت عمرؓ وفات پا گئے تو حضرت عبیداللہ بن عمرؓ تلوار لہراتے ہوئے آئے اور ہرمزان کو قتل کر دیا۔ راویوں کا قول ہے کہ جب ہرمزان کو تلوار لگی تو اُس نے کہا "لاالٰہ الا اللہ"۔ اس کے بعد حضرت عبیداللہ جفینہ کے پاس گئے اور اُسے بھی قتل کر دیا۔ راویوں کا بیان ہے کہ جب اسے احساسِ مرگ ہوا تو اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے صلیب کا نشان بنایا۔ پھر حضرت عبیداللہؓ ابو لؤلؤۃ کے گھر پہنچے اور وہاں اس کی بیٹی کو قتل کر دیا۔ یہ بات صہیبؓ تک پہنچی جو مسلمانوں کو نماز پڑھانے پر مامور تھے۔ انھوں نے مسلمانوں میں سے کسی کو بھیجا کہ جا کے حضرت عبیداللہؓ کو روک دیں۔ چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے پہنچ کر انھیں قابو میں کر لیا۔ اور اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک کہ ان کے ہاتھ سے تلوار نہ چھین لی۔ اس کے بعد حضرت عبیداللہؓ کو قید میں رکھا گیا تاآنکہ خلیفہ اس مقدمہ کا فیصلہ نہ کرے۔

بہر حال ابھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت مکمل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ انھوں نے حاضرین سے حضرت عبیداللہؓ کے بارے میں مشورہ کیا جنھوں نے اپنا انتقام بغیر کسی واضح ثبوت کے خود ہی لے لیا تھا۔ حکومت کی اجازت کے بغیر انھوں نے

ایک مسلمان اور دو ذمیوں کو بغیر حکومت کے فیصلے کے ناحق قتل کر ڈالا تھا۔ چنانچہ بعض اہلِ بصیرت و فقہ بزرگوں نے جن میں حضرت علیؓ بھی شامل تھے قصاص کا مشورہ دیا۔ کیونکہ حضرت عبیداللہؓ نے جیسا کہ آپ نے دیکھا خدا کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کیا تھا۔ مگر بہت سے مسلمان یہ کہہ رہے تھے کہ کل تو عمرؓ مارے گئے اور آج ہم اُن کے فرزند کو قتل کریں؟ اس ضمن میں کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضرت عثمانؓ سے کہا تھا کہ خدائے تعالیٰ نے آپ کو اس قضیہ سے بچا لیا کیونکہ یہ حادثہ اس وقت رونما ہوا ہے جب کہ آپ نے پوری زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں نہیں لی تھی۔

اس مقدمہ کا حضرت عثمانؓ نے جو فیصلہ کیا تھا اس میں مورخین نے اختلاف کیا ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے قصاص کا فیصلہ کیا تھا۔ اور حضرت عبیداللہؓ کو پسر ہرمزان کے حوالے کر دیا تھا کہ وہ اس سے اپنے باپ کا انتقام لے لے۔ اکثر مورخین یہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ ہرمزان اور عبیداللہ کے ماتحتوں دوسرے مقتولین کا والی میں ہوں۔ میں اسے معاف کرتا ہوں۔ اور دیت کی رقم بیت المال میں جمع کراتا ہوں۔ مؤخرالذکر فیصلہ حضرت عثمانؓ کی سیرت کے عین مطابق ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے عہدِ خلافت کا افتتاح ایک قریشی نوجوان اور وہ بھی حضرت عمرؓ کے فرزند کے خون سے کریں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ ایک مسلمان اور دو ذمیوں کا خون رائیگاں جائے۔ لہٰذا، انھوں نے راہ عافیت اختیار کی یعنی دیت کی رقم اپنی جیب سے بیت المال میں داخل کر دی۔ اور حضرت عبیداللہ بن عمرؓ کی جان بخش دی۔ اگر اس قضیہ کو خالص سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ فیصلہ صحیح اور موزوں تھا۔ کیونکہ مسلمانوں میں سے جس نے یہ کہا تھا کہ کل حضرت عمرؓ مارے گئے اور آج ہم ان کے فرزند کو کیونکر قتل کر دیں، وہ غلطی پر نہ تھا۔ اگر حضرت عثمانؓ حضرت عبیداللہ بن عمرؓ سے قصاص لئے جانے کا فیصلہ کر دیتے تو اس سے بنی عدی اور خصوصاً آلِ خطاب کے دلوں کو ضرور اپنا دشمن بنا لیتے۔ اور اگر اس طرح معاف کر دیتے کہ مقتولین کا خون بہا بھی ادا نہ ہوتا تو اس سے بدنظمی اور انارکی کا کبھی نہ بند ہونے والا دروازہ کھل جاتا۔

لیکن یہ صرف ایک سیاسی قضیہ ہی نہ تھا بلکہ اوّلاً یہ دینی قضیہ تھا اور سیاسی بعد میں۔ امام کو معافی کا حق صرف اسی شکل میں حاصل ہے کہ اس کی معافی سے دین کی حدود میں کوئی تعطل نہ پیدا ہوتا ہو۔ اس طرح یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ بہت سے متشدد مسلمان حضرت عثمانؓ کے اس فیصلہ سے کیوں راضی نہ تھے۔ چنانچہ بعض انصاری حضرت عبیداللہؓ کو ہمیشہ قتل ہرمزان کی یاد دلاتے اور اس کے قصاص سے ڈراتے رہتے تھے۔ زیاد بن لبید البیاضی شاعر جب بھی حضرت عبیداللہؓ سے ملتا تو انھیں یہ اشعار سناتا: ؎

اَلَا یَا عُبَیْدَ اللہِ مَالَکَ مَهْرَبٌ
وَلَا مَلْجَأٌ مِنِ ابْنِ اَرْوَی وَلَا خَفَرْ

اَصَبْتَ دَمًا وَاللہِ فِیْ غَیْرِ حِلِّہٖ
حَرَامًا وَقَتْلُ الْهُرْمُزَانِ لَہٗ خَطَرْ

عَلٰی غَیْرِ شَیْءٍ غَیْرَ اَنْ قَالَ قَائِلٌ
اَتَتَّهِمُوْنَ الْهُرْمُزَانَ عَلٰی عُمَرْ؟

فَقَالَ سَفِیْهٌ، وَالْحَوَادِثُ جَمَّةٌ
نَعَمْ، اَتَّهِمُہٗ، قَدْ اَشَارَ وَقَدْ اَمَرْ

وَکَانَ سِلَاحُ الْعَبْدِ فِیْ جَوْفِ بَیْتِہٖ
یُقَلِّبُہٗ وَالْاَمْرُ بِالْاَمْرِ یُعْتَبَرْ

(ترجمہ) اے عبید اللہ تیرے لئے ابن اَروی (ہرمزان) کے بدلہ سے بھاگ نکلنے کے لئے نہ کوئی بچنے کی جگہ ہے نہ حفاظت کا مقام۔ نہ کوئی پناہ دینے والا ہے۔ بخدا تو نے ناحق خون کیا ہے، اور ہرمزان کا قتل بہر حال خطرناک ہے۔ بلا کسی سبب اور ظاہر ثبوت کے صرف کہنے والے کے کہنے پر تم نے اسے قتل کر ڈالا، کیا تم ہرمزان پر حضرت عمرؓ کے قتل کی تہمت لگاتے ہو؟ ــــ حادثات تو بے پناہ ہوتے ہیں ــــ بیوقوف کہتا ہے کہ ہاں، میں اس پر تہمت لگاتا ہوں، اس نے قتل کا ایماء کیا تھا اور قتل کا حکم دیا تھا۔ قاتل غلام کا ہتھیار اس کے گھر میں تھا جسے یہ الٹ پلٹ رہا تھا، اور ایک بات سے دوسری کو قیاس کیا جاتا ہے۔"

جب زیاد کی یہ حرکتیں بڑھ گئیں تو حضرت عبید اللہؓ نے حضرت عثمانؓ سے اس کی شکایت کی، چنانچہ انھوں نے خود زیاد کو اس حرکت سے منع کیا لیکن وہ باز نہ آیا، بلکہ خود حضرت عثمانؓ کے متعلق یہ اشعار کہے: ؎

أَبَا عَمْرٍو وَعُبَیْدُ اللہِ رَهْنٌ فَلَا تَشْکُکْ بِقَتْلِ الْهُرْمُزَانِ
فَإِنَّکَ اِنْ غَفَرْتَ الْجُرْمَ عَنْہُ وَأَسْبَابُ الْخَطَا فَرَسَا رِهَانِ

لِتَعْفُوَ اِذْ عَفَوْتَ بِغَیْرِ حَقٍّ
فَمَا لَکَ بِالَّذِیْ تَخْلِیْ یَدَانِ

(ترجمہ) ابو عمر (کنیت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی)۔ اس میں شک نہ کرو کہ عبید اللہ ہرمزان کے قتل کے عوض رہن

ہے۔ تم نے اگرچہ اس کے جرم کو بخش دیا ہے لیکن جرم کے اسباب اس کا تعاقب کر رہے ہیں، تم نے ناحق جو معافی دی ہے اس کے تم مجاز نہ تھے۔

اس پر حضرت عثمانؓ غصہ ہوئے اور انھوں نے زیاد کو بلا کر سختی سے منع کیا چنانچہ وہ باز آگیا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ بھی اسی خیال کے تھے اور اگر وہ اپنی خلافت کے دوران میں حضرت عبیداللہؓ کو پا لیتے تو ان سے ضرور انتقام لے لیتے۔ لیکن حضرت عبیداللہؓ خونِ عثمانؓ کا انتقام لینے والوں کے ہمراہ نکل گئے تھے اور امیر معاویہؓ کی جانب سے لڑتے ہوئے صفین کی جنگ میں مارے گئے۔ جن لوگوں کو حضرت عبیداللہؓ کی جان بخشی پر غصہ آرہا تھا ان کے مدنظر ایک تو صریح قرآنی حکم تھا اور دوسرے یہ خیال تھا کہ حضرت عبیداللہؓ کو فقط اس لئے چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خلیفہ کا بیٹا تھا حالانکہ اس نے ایک عجمی نومسلم اور دو ذمیوں کو قتل کیا تھا۔ چنانچہ ان کے نزدیک اس عفو کے سبب سے گویا مسلمانوں کے مابین تفریق و امتیاز روا رکھا گیا۔ کیونکہ حضرت عبیداللہؓ عرب تھے اور ہرمزان عجمی۔ حالانکہ خدا نے مسلمانوں میں کسی تفریق کو قائم نہیں رکھا۔ اس نے سب کے خون مال اور ناموس کی ضمانت دی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ کسی کے آبا و اجداد کیا تھے یا کوئی کس نسل سے تھا ــــ تو گویا اس عفو کی رو سے کچھ اس قسم کا احساس ہوتا تھا جیسے ذمی کا خون رائگاں گیا ہو۔ حالانکہ دین نے اس کی حرمت اور اس کے حقوق کی حفاظت کا اقرار کیا ہے۔ غرض وہ ڈرتے تھے کہ اگر معاملات کو اس نہج پر چلنے دیا گیا کہ خلفاء کے فرزندوں اور عظمائے مہاجرین و انصار کے بیٹوں کو خود اپنی ہی مرضی سے انتقام لینے کا حق حاصل ہو اور وہ اپنی من مانی کارروائیاں اسی طرح کرتے پھریں کہ نہ اپنا معاملہ حکومت کے سامنے رکھیں نہ منتقم علیہ کے خلاف کوئی دلیل محکم پیش کریں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صورتِ حال بگڑ جائے گی۔ عدل ناپید ہو جائے گا۔ نزاع کا دور دورہ ہوگا۔ احکام دین پامال ہو جائیں گے۔

ہم پھر اصل بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ کو امیر المسلمین ہونے کی حیثیت سے معاف کر دینے کا حق حاصل تھا ــــ ساتھ ہی ہم یہ بھی اضافہ کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے معافی دے کر نہ کسی حکمِ خداوندی کو معطل کیا اور نہ ہرمزان اور اس کے دونوں ساتھیوں کے خون کو رائیگاں چھوڑا۔ بلکہ انھوں نے اپنی جیب سے خوں بہا بیت المال میں جمع کرا دیا۔ ظاہر ہے کہ بیت المال ہی ان کا تنہا وارث تھا۔ تاہم اس قسم کی معافی اپنے اندر ان لوگوں کے دل میں شبہ پیدا کرنے کا سامان ضرور رکھتی تھی جو دین کے معاملہ میں کٹر اور متشدد تھے۔ کیونکہ حضرت عبیداللہ کو تو ان کے جرم کی کوئی سزا نہ ملی تھی۔ الٹا حضرت عثمانؓ نے اپنی جیب سے دیت ادا کر کے حضرت عبیداللہؓ کو جرمانہ کے بوجھ سے بھی سبکدوش کر دیا تھا۔ اگر حضرت عثمانؓ حضرت عبیداللہؓ کی جان بخشی کر کے خون بہا کی ادائیگی ان پر اور ان کے

قبیلہ پر لازم کر دیتے تو پھر بلاشبہ حد بحال رہتی اور کوئی شخص ان کے فیصلہ کو ناپسندیدگی کی نگہ سے نہ دیکھتا۔ اور اگر آلِ خطاب پر کرم کرتے ہوئے انھوں نے دیت کی رقم اپنی گرہ سے ادا کر دی تھی تو حضرت عبید اللہؓ کو برائے تعزیر و تادیب قید کر دیتے حتّٰی کہ خدا سے وہ اپنے گناہ کی معافی مانگتے اور اپنے جرم پر نادم ہوتے۔ اور اس امر پر اظہارِ افسوس کرتے کہ انھوں نے جاہلیت کے جوشِ غیرت میں مبتلا ہو کر حکومت کی توہین کی۔ اگر حضرت عثمانؓ یہ طریقہ اختیار کرتے تو اُن کے لئے اس الجھن سے مفر کی گنجائش نکل آتی۔ اور حضرت عبید اللہ جیسے نوجوانانِ قریش کو معلوم ہو جاتا کہ مسلمانوں اور ذمیوں کا خون خدا اور حکومت کے نزدیک اتنا محترم ہے کہ جو بھی اس خون سے ہاتھ رنگے گا اسے ضرور سزا ملے گی۔ خواہ وہ سزا سخت ہو یا نرم درگذر سے ہرگز کام نہ لیا جائے گا۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے تو حضرت عبید اللہؓ کو امن و فارغ البالی اور لذاتِ زندگی سے بلا خوف و خطر تمتع کے مواقع بہم پہنچائے رکھے[1]

بہرحال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سیاست کا آغاز اس واقعہ سے ہوا جو رحم۔ نرمی اور عافیت پسندی کا مرقع ہے جس میں ہر اس چیز سے گریز ہے جو دلوں کو دکھائے بالخصوص عربوں کے دل، پھر اس میں سے بھی، خاص طور پر مہاجرین و فرزندانِ مہاجرین کے اس ممتاز طبقے کے دل۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اس حکمتِ عملی کو بعض لوگوں نے تو پسند کیا اور بعض نے ناپسند کیا ـــــ الغرض حضرت عثمانؓ کی خلافت کا آغاز شک و شبہ اور اختلاف کے اس ملے جلے واقعہ سے ہوا۔ اگر حضرت عثمانؓ کی جگہ حضرت عمرؓ ہوتے اور ان کے پاس کوئی قریشی نوجوان لایا جاتا تو وہ اس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ وہ کس خاندان کا فرد اور کس باپ کا بیٹا ہے یقیناً سنجیدگی سے کوئی ایسا فیصلہ کرتے جس میں حدود اللہ کے نفاذ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف شامل نہ ہوتا۔ بلاشبہ حضرت عثمانؓ کے اس فیصلہ نے پہلے ہی قدم پر اپنی خلافت اور حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ایک نمایاں فرق ظاہر کر دیا جس کا امتیازی نشان نرمی اور مہربانی تھا۔

بایں ہمہ لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام نہیں لیا، اور وہ جلد بازی کرتے بھی کیسے وہ تو خود اس بارے میں حضرت عمرؓ کی قابلِ احترام شخصیت کی وجہ سے مختلف الخیال تھے اور ان کا خیال تھا کہ ان کے اہل و عیال کی رعایت بھی ملحوظ رکھی جائے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم نے بھی حکم دیا تھا کہ شبہات کی صورت میں حدود کے نفاذ سے بچاؤ

---

[1] ہم ان واقعات پر تبصرہ یا تنقید انہی اطلاعات کی بنا پر کر سکتے ہیں جو ہمیں تاریخ بہم پہنچاتی ہے۔ اور ہماری تاریخ جس حد تک قابلِ اعتماد ہے اس کا کسے علم نہیں۔ کم از کم صحابہ کبارؓ پر تنقید کرتے ہوئے ہمیں قرآن کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔

کی شکل نکالی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے بھی حضرت علیہ اللہؓ کو اسی شبہ پہ معافی دے دی ہو کہ انھوں نے اپنے والد کے صدمہ کی وجہ سے مغلوب الغضب ہو کر یہ حرکت کر دی تھی، اللہ تعالیٰ نے بھی مسلمانوں کے لئے طاقت ہوتے ہوئے معاف کرنے کو پسند فرمایا ہے اور اس پر ان سے جزائے خیر کا وعدہ کیا ہے۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت عثمانؓ نے خلیفہ بنتے ہی سلطنت کے صوبہ جات میں چٹھیاں روانہ کیں جن میں سے کچھ گورنروں کے نام تھیں، کچھ کمانڈروں کے نام اور کچھ عامۃ الناس کے نام۔ یہ چٹھیاں زیادہ نہیں تو کم از کم حضرت عثمانؓ کی اس سیاسی حکمتِ عملی کی تصویر ضرور پیش کرتی ہیں۔ جسے وہ اپنے ابتدائی عہد میں مسلمانوں کے درمیان رائج کرنا چاہتے تھے اور جس پر وہ خود بھی کاربند تھے۔ یہ مکاتیب ضرور اس قابل ہیں کہ انھیں یہاں درج کیا جائے اور ان پر تھوڑی دیر ٹھہر کر غور کیا جائے تاکہ ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ حضرت عثمانؓ کس حد تک اپنے مقرر کردہ لائحہ عمل پر پورے اترے۔

مکاتیب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

طبری کی روایت کے مطابق حضرت عثمانؓ نے ۲۴ھ کے اوائل میں اپنے عمّال کو اس مضمون کے خط لکھے "امابعد! خدا نے ائمہ کو رعیت کا محافظ و نگراں بننے کا حکم دیا ہے یہ حکم نہیں دیا کہ وہ زکوٰۃ و صدقات (ٹیکس) اکٹھا کرنے والے بن جائیں، امت مسلمہ کے پیشرو ائمہ محصل نہیں تھے بلکہ رعیت کے محافظ و نگراں تھے۔ لیکن اب کچھ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ حکام محافظ و نگراں بننے کی بجائے صرف محصل بن کر رہ جائیں گے۔ اگر انھوں نے یہ راہ اختیار کی تو پھر حیاء امانت اور وفا کا رشتہ منقطع ہو جائے گا۔ یاد رکھو! سب سے زیادہ منصفانہ اور مبنی بر عدل طرزِ عمل یہ ہے کہ تم مسلمانوں کے احوال و واجبات کا خیال رکھو۔ جو ان کا حق ہے وہ انھیں دو اور جو ان پر واجب ہے وہ لو۔ اس کے بعد اہلِ ذمہ کی نگہداشت کرو۔ جو ان کا حق ہے وہ انھیں دو اور جو ان کے ذمہ واجب الادا ہے اس کی ادائیگی کا انھیں پابند بناؤ۔ پھر دشمن کا معاملہ بھی ہے جن سے تم نوبت بہ نوبت دوچار ہوتے رہتے ہو۔ ان پر غلبہ حاصل کرو اور وفائے عہد پہ پابند رہو۔"

یہ مختصر سا خط جو حضرت عثمانؓ نے لکھا یا لکھوایا یہ ظاہر کرتا ہے کہ انھوں نے اس میں کسی تکلف باریک بینی، اور خیال آرائی سے کام لئے بغیر عمل پر زور دیا ہے' اس میں عمّال کو چار باتوں کا حکم دیا ہے۔ پہلی چیز یہ کہ وہ محصل کی بجائے محافظ و نگراں بن کر رہیں۔ یعنی حکومت سے ان کا مقصد محکوموں کے ساتھ خوش معاملگی ہو نہ کہ حکومت کو دولتمند کرنا اور حکام کی خواہش زر اندوزی کو پورا کرنا —— اس پہلو پہ حضرت عثمانؓ نے بہت زیادہ زور دیا ہے اور باربار نگراں و محصل کے الفاظ دہرائے ہیں جو ان کے اصرار پہ دلالت کرتا ہے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حضرت عثمانؓ اسلام کا بنیادی مقصد واضح کرنا چاہتے تھے جو عربوں کو شاہراہ فتوحات پہ ڈالتے وقت اسلام کے پیش نظر تھا۔ وہ بنیادی مقصد سب

پہلے اصلاح تھا۔کیونکہ اسلامی فتح جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے تسلط و غلبہ کے لئے فتح نہ تھی بلکہ وہ نگرانی، مہربانی اور اصلاح کی خاطر فتح تھی۔

حضرت عثمانؓ اعتراف کرتے ہیں کہ اس امت کے اولین امام، محافظ و نگہبان تھے۔ محصل نہ تھے۔ یہ ائمہ کون تھے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما۔ پھر وہ اس خطرہ کا اظہار کرتے ہیں کہ مبادا ائمہ محافظ و نگراں ہونے کی بجائے محصل بن کر رہ جائیں۔ جس کی وجہ سے حیاء کا سلسلہ منقطع ہو جائے اور اس کی جگہ ڈھٹائی پیدا ہو جائے جو حق کو ضائع کر کے باطل و معصیت پر کاربند کر دے۔ امانت داری کا رشتہ منقطع ہو جائے اور اس کی جگہ فریب کاری اور خیانت پاؤں جمالے جس سے ائمہ اور محافظوں کے جملہ حقوق برباد ہو جائیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ باہم ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گے اور بدظنی کا شکار ہو جائیں گے۔ نیز ان کے باہمی معاملات صاف گوئی اور اخلاص کی بجائے فریب دہی و ریاکاری پر مبنی ہو کر رہ جائیں گے۔ اگر وفا کا رشتہ منقطع ہو جائے گا تو غداری جگہ لے لے گی۔ جو لوگوں کو لامتناہی شر میں ڈال دے گی، ان میں بھیانک دکھ و خود پسندی پیدا کر دے گی جس کی وجہ سے کوئی کسی کی حرمت کا پاس نہ کرے گا۔ نہ ایک دوسرے کے وقار کو ملحوظ رکھے گا۔ بیشک حضرت عثمانؓ کا یہ طریق کار وہی ہے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا طریقہ تھا۔

دوسری چیز ان ہدایات کی تفصیل ہے جو حضرت عثمانؓ نے اپنے عمال کے نام جاری فرمائیں۔ یعنی نگہداشت عدل۔ ان معاملات میں بھی جو باہم مسلمانوں سے تعلق رکھتے ہوں اور ان میں بھی جو مسلمانوں اور ان کے ائمہ و حکام کے مابین ہوں۔ لہٰذا، یہ جائز نہیں کہ حکومت کی خوشنودی کے خیال سے مسلمانوں پر زیادتی کی جائے اور نہ یہ جائز قرار دیا کہ عامۃ المسلمین کی خاطر حکومت پر ظلم ہو۔ ضروری تھا کہ مسلمانوں پر جو کچھ واجب ہو ان سے لے لیا جائے جو ان کا حق ہو انھیں واپس کر دیا جائے کیونکہ حکومت کا مطلب ظلم نہیں۔ نہ یہ کہ زکوٰۃ و خراج کی وصولی میں ضرورت سے زیادہ سختی کی جائے۔ نہ یہ کہ لوگوں پر ان کے کسی معاملہ میں بھی جبر و تسلط روا رکھا جائے۔ بلکہ ایک عادلانہ طریقہ ہو جس کی رو سے نہ حاکم کو ضرر پہنچے نہ محکوم کو۔

تیسری چیز حقیقتاً بعینہٖ دوسری چیز ہے۔ لیکن اس کا خصوصی تعلق ان معاہدات سے ہے جو اہلِ ذمہ سے کئے گئے تھے۔ کیونکہ اہلِ ذمہ بھی عدل کے اتنے ہی مستحق تھے جتنے مسلمان۔ ان کے بھی وہی حقوق تھے جو مسلمانوں کے تھے۔ اور جب تک وہ نیک نیتی، اخلاص اور وفائے عہد سے کام لیتے ان پر بھی وہی فرائض عائد ہوتے تھے جن کے مسلمان ذمہ دار تھے، لہٰذا یہ اجازت نہ تھی کہ ان سے واجبی رقم سے زیادہ وصول کر کے ان پر ظلم کیا جائے اور نہ یہ اجازت تھی کہ انھیں ان کے حق سے زیادہ رعایت دے کر مسلمانوں پر ظلم کیا جائے۔

چوتھی بات کا تعلق دشمنوں سے تھا۔ جن کا عمال کو اپنے اپنے صوبہ جات میں سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ائمہ کی ہدایات و نصائح میں یہ ہدایت و نصیحت نہایت درجہ حکیمانہ و اعلیٰ ہے۔ اور یہ حضرت عثمانؓ کی اختراع نہ تھی کیونکہ حضرت عثمانؓ اختراع اور جدت طرازی کو پسند نہ کرتے تھے۔ اس ہدایت میں انہوں نے وحی الٰہی کی اتباع کی تھی جیسا کہ قرآن مجید کی سورۂ برأت اور دوسرے مقامات میں مذکور ہے' بہر حال حضرت عثمانؓ نے اپنے عمال کو فتوحات اور دشمن پر غلبہ کا حکم تو دیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ وفائے عہد کا رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ کیونکہ عہد شکنی کا حق دشمن کے معاملہ میں بھی نہ تھا۔ ان کا فرض تھا کہ وہ دعوت اسلام پیش کرتے۔ دعوت قبول ہو جاتی تو فبہا، ورنہ صلح کی پیشکش کرتے۔ اگر یہ پیشکش منظور ہو تو پھر بات ختم ہو جاتی ہے بصورت دیگر اعلان کر دیا جائے کہ ہم اور تم دونوں ایک دوسرے کے خلاف کارروائی کرنے میں آزاد ہیں۔

بہر حال یہ سیاسی حکمت عملی جسے حضرت عثمانؓ نے اپنے عمال کے لئے متعین کیا تھا۔ حقیقتاً وہی سیاست تھی جو خود قرآن مجید لے کر آیا تھا اور حضرت عثمانؓ کے پیش رو ائمہ بھی اس پر عمل پیرا رہے تھے۔

دوسرا مکتوب | اسی طرح حضرت عثمانؓ نے اپنے خراج وصول کرنے والے عاملوں کے نام ایک مکتوب جاری کیا جس میں لکھا تھا۔
أما بعد۔ خدا نے مخلوقات کی تخلیق حق کے ساتھ کی ہے اور وہ صرف حق ہی قبول فرماتا ہے۔ حق وصول کرو۔ اور حق کے بدلے میں حق ادا کرو۔ ہر معاملہ میں امانت داری ملحوظ رکھو اور ہمیشہ اس پر کاربند رہو۔ تم امانت میں خیانت کرنے کی ابتداء نہ کرنا۔ ورنہ اس عمل کے باعث تمہارے بعد آنے والے خائنوں کے جرم میں بھی تم برابر کے حصہ دار ہو گے۔ وفا بہت بڑی چیز ہے اپنے عہد پر قائم رہو، یتیم اور ذمیوں پر ظلم و زیادتی نہ کرو، کیونکہ جو ان پر ظلم کرتا ہے خدا اس کا دشمن ہو جاتا ہے"۔

یہ خط اپنے دلآویز اختصار کی وجہ سے ممتاز ہے انہی چیزوں پہ زور دے رہا ہے اور انہی باتوں کی طرف رغبت دلا رہا ہے جو پہلے خط میں درج تھیں، لیکن اس خط میں جو تاکید اور زور پایا جاتا ہے وہ پہلے خط میں نہیں۔ خدا نے مخلوقات کی تخلیق حق کے ساتھ کی ہے اور وہ حق کے سوا کچھ بھی قبول نہیں کرتا۔ لہٰذا، ائمہ کو چاہیئے کہ وہ خدا کی محبوب چیزوں کے سوا دوسری باتوں کے ذریعہ سے اس کا قرب نہ چاہیں۔ اس لئے ان پر واجب ہے کہ وہ حق وصول کریں۔ نہ اس میں کمی کریں نہ زیادتی۔ حق ادا کرنے میں بھی زیادتی سے کام نہ لیں۔ اور نہ انحراف برتیں۔ جب وہ حق کو اس صورت میں واجب کر لیں تو پھر ان کا اولین فرض جسے ملحوظ رکھنا ان کے لئے ضروری ہو گا یہ ہے کہ لوگوں سے محاصل کی وصولی اور رفاہ عامہ پر خرچ کرنے کے معاملہ میں امانت سے کام لیں۔ جو کچھ بچے اسے دیانت داری کے ساتھ خلیفہ کی تحویل میں دے دیں تاکہ خلیفہ اسے پوری مملکت کی رفاہ و بہبود کے لئے خرچ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عثمانؓ عمال خراج کو متنبہ کر رہے ہیں کہ وہ امانت

سے انحراف کرنے کی ابتداء نہ کریں ورنہ وہ اپنے اس انحراف کے سبب نہ صرف اپنا بلکہ اپنے بعد آنے والے خیانتیوں کے گناہوں کا بار بھی اٹھائیں گے۔ امانت کے بعد حضرت عثمانؓ نے وفائے عہد کا حکم دیا ہے۔ اس بارے میں بھی وہی تاکید وشدت ہے جو امانت کے ضمن میں بیان ہوئی ہے۔ اس کے بعد یتیموں اور ذمیوں پر ظلم کرنے سے منع کیا ہے۔ اور خدا کے عتاب سے متنبہ کیا ہے۔ کیونکہ خدا ذمیوں اور یتیموں پر ظلم کرنے والوں کا دشمن ہے۔

یہ حکمت عملی بھی وہی ہے جس کی تعلیم قرآن مجید میں دی گئی ہے اور جس پر رسول اللہؐ اور آپؐ کے بعد حضرات ابوبکرؓ وعمرؓ عمل پیرا رہے تھے۔ غرضیکہ حضرت عثمانؓ نے اس مکتوب میں اپنے پہلے مکتوب کی طرح اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف کو انھوں نے یہی عہد دیا تھا کہ وہ کتاب اللہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کی پیروی کریں گے۔

تیسرا مکتوب

حضرت عثمانؓ نے سرحدی علاقوں کے سالاران جنگ کے نام جو چٹھیاں لکھیں ان کا مضمون یہ تھا۔
"اما بعد۔ واضح ہو کہ تم مسلمانوں کے محافظ اور پاسبان ہو۔ حضرت عمرؓ نے تمہارے متعلق جو قانون وضع کئے ہیں وہ ہم سے چھپ کر نہیں بلکہ ہمارے مشورے سے مرتب کئے تھے۔ لہٰذا، میرے پاس تمہاری طرف سے کسی قسم کے تغیر وتبدل کی خبر نہ آئے ورنہ خدا تمہارے احوال کو دگرگون کر دے گا اور تمہاری جگہ کسی اور قوم کو منتخب کرے گا۔ تم اپنے مستقبل کا جائزہ لو۔ میں اپنے فرائض وواجبات کا پابند ہوں جو خدا کی طرف سے مجھ پر عائد ہوتے ہیں۔"

اس مکتوب کے مندرجات پر غور فرمائیے اس میں جس شدت وحزم سے کام لیا گیا ہے۔ یقیناً سالاران جنگ کی طرف بھیجی جانے والی تحریر کا ایسا ہی اسلوب ہونا چاہیئے۔ یہاں بالخصوص حضرت عثمانؓ کے اس طرزِ عمل پر غور فرمائیے کہ وہ کس طرح حضرت عمرؓ کی سیرت پر پابند ہیں اس لئے کہ حضرت عمرؓ نے یہ نظام عامۃ المسلمین مہاجرین اور انصار ہی کے مشورے سے مرتب کیا تھا۔ خود حضرت عثمانؓ اس نظام کی ترتیب میں شامل تھے اور شریک صلاح ومشورہ تھے۔ چنانچہ سالارانِ جنگ کو تاکید ہے کہ حضرت عمرؓ کے مرتب کردہ آئین میں کوئی تغیر وتبدل نہ کیا جائے۔ نیز عدمِ تعمیل کی صورت میں انھیں برطرفی و تعزیر کی دھمکی دی ہے۔ کیونکہ وہ خدا کی جانب سے عائد کردہ فرائض کی نگہداشت اور عمل درآمد پر مجبور تھے۔ گویا حضرت عثمانؓ انتظامی امور اور سیاسی وجنگی حکمت عملی میں سیرتِ عمرؓ کے پابند تھے۔ اسی طرح وہ حضرت عمرؓ کی اس حکمت عملی پر بھی کاربند تھے جس کی رُو سے وہ عامۃ المسلمین کو اچھائی کا حکم دیتے، بُرائی سے منع کرتے سنت موسومہ پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت دیتے اور بدعت وتصنع سے اجتناب کی تلقین کرتے تھے۔ اس امر پر ان کا وہ مکتوب دلالت کرتا ہے جو انھوں نے صوبائی بڑے شہروں اور علاقوں میں پڑھ کر سنائے جانے کے لئے جاری کیا تھا جس کا مضمون درج ذیل ہے:-

چوتھا مکتوب

اما بعد! "واضح ہو کہ تم لوگوں نے جو ترقی کی ہے وہ اسلام کے اقتداو اتباع کی وجہ سے کی ہے۔ لہٰذا، واجب ہے کہ دنیا کی حرص و ہوس تمہیں تمہارے مقصد سے غافل نہ کرے۔ کیونکہ جب تم میں تین امور جمع ہو جائیں گے تو امت میں بدعت سرایت کر جائے گی۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں۔ دولت و نعمت کی فراوانی۔ لونڈیوں کے بطن سے تمہاری اولاد کا بلوغ اور بدوؤں اور عجمیوں کی قرآن خوانی ــــ کیونکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ کفر عجمیت (ابہام، عدم فصاحت، غیر عربیت) میں پنہاں ہے۔ لہٰذا، جب لوگوں پر کوئی معاملہ مبہم اور گنجلک ہو جائے گا تو وہ تکلف و جدت طرازی اختیار کر لیں گے۔"

بہرحال اس مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ سنت موروثہ کی پابندی کے معاملہ میں حضرت عمرؓ سے کسی طرح بھی پیچھے نہ تھے۔ اور نہ وہ بدعت و تصنع کے بارے میں حضرت عمرؓ سے کمتر خائف تھے۔ کیونکہ وہ انھیں متوجہ کرتے ہیں کہ اگر انھوں نے فتوحات حاصل کی ہیں اور اتنی بڑی سلطنت کے مالک ہو گئے ہیں تو یہ صرف اصول اسلام کے اقتداء و اتباع کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا وہ انھیں مطلع کر رہے ہیں کہ کہیں دُنیا کی حرص و ہوا انھیں ان کے مقاصد سے غافل نہ کر دے نیز انھیں وہ تین چیزوں سے ڈراتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کہیں نعمت و دولت کی فراوانی اور روز افزوں آسائش و آسودگی انھیں بدمست نہ کر دے۔ دوسرے یہ کہ لونڈیوں کے بطن سے ان کی جو اولاد ہو گی وہ بالغ ہو کر ان کے اعمال کو پراگندہ نہ کر دے کیونکہ یہ نئی پود جس کی رگوں میں خالص عربی خون نہ ہو گا بلکہ اجنبی ماؤں کے خون کی آمیزش ہو گی۔ طبعی طور پر اقتداء و اتباع پر بدعت و جدت کو ترجیح دے گی۔ تیسرے یہ کہ دین میں وہ کچھ داخل کر دیا جائے گا جس کا دین سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ نیز سہل و آسان علم میں اس جہل و تصنع کی آمیزش ہو جائے گی جو بدوؤں اور عجمیوں کے اسلام لانے اور قرآن پڑھنے کی وجہ سے پیدا ہو گا۔ کیونکہ وہ لوگ نص قرآن کو اس کی صحیح شکل میں سمجھنے سے قاصر ہوں گے۔ لہٰذا، ان کے لئے تصنع و اختراع کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ اس خط میں جس طرح حضرت عثمانؓ نے ان آفات کا نقشہ کھینچا ہے جن سے فتوحات کے بعد مسلمانوں کو دوچار ہونا پڑا اس کی نظیر کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی، واقعتہً ہوا بھی ایسا ہی۔ عیش و عشرت کی فراوانی کے سبب مسلمان بدمستی، غرور و تکبر اور طمع کا شکار ہو گئے۔ اور تصنع و جدت طرازی کا دور دورہ ہو گیا۔ بڑے بڑے حادثے رونما ہوئے۔ ایک نئی نسل پیدا ہو گئی۔ ایسے لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے جنہوں نے قرآن کو اپنی حقیقی شکل میں نہ سمجھا لہٰذا، ایک طرف غفلت اپنی حدود سے تجاوز کر گئی اور دوسری طرف تشدد۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقت ان غفلت شعاروں اور تشدد پسندوں کے درمیان پہنچ کر تقریباً گم ہو گئی۔

یہ عمال جن کی طرف حضرت عثمانؓ نے یہ مکاتیب لکھے تھے حضرت عمرؓ کے عمال تھے۔ جنھیں حضرت عثمانؓ نے خود حضرت عمرؓ

کی وصیت کے مطابق ایک سال تک اپنے اپنے عہدوں پر بحال رہنے دیا تھا۔ اس سے زیادہ صحیح اور حزم و شفقت پر مبنی وصیت اور کیا ہو سکتی تھی کیونکہ حضرت عمرؓ کو یہ خدشہ تھا کہ خلیفۂ ما بعد اختیارات حکومت سے متمتع ہونے میں تعجیل سے کام لیتے ہوئے کسی کی برطرفی کرے گا اور کسی کی تقرری۔ نتیجۃً ان تمام پروگراموں کا جنھیں عمال نے شروع کر رکھا تھا شیرازہ بکھر جائے گا اور اس طرح صوبائی شہری اور سرحدی علاقوں میں مسلمانوں کے امور کو نقصان پہنچے گا۔ حضرت عثمانؓ نے اس وصیت کو تسلیم کر لیا اور اس پر پابند رہے۔ اور انھوں نے اپنے عہد میں یا اپنے عہد کے سالِ اول میں عمال کو اس حکمت عملی کا پابند رکھا جس پر حضرت عمرؓ نے پابند کیا تھا۔ جب خلیفہ منتخب ہوئے تھے تو یہی عمال برسرکار تھے، یہ وہ عمال ہیں جنھیں حضرت عثمانؓ نے اپنے مناصب پر برقرار پایا اور ان کی معزولی و تقرری کے بارہ میں اپنے اختیارات کو اس ایک سال کے دوران تک ملتوی رکھا۔

حضرت عمرؓ کے مقرر کردہ عمال جنھیں حضرت عثمانؓ نے بحال رکھا

اس وقت مکہ کے حاکم نافع بن الحارثؓ خزاعی تھے اور ظاہر ہے کہ وہ قریشی نہ تھے۔ طائف کے حاکم سفیان بن عبداللہ الثقفی تھے وہ بھی قریشی نہ تھے۔ اور طائف تو ویسے بھی خاندان ثقیف کا شہر تھا۔ صنعا پر یعلی بن مُنیہ مامور تھے جو نسلاً قریشی نہ تھے بلکہ بنی نوفل بن عبد مناف کے حلیف تھے۔ جند پر عبداللہ بن ابی ربیعہ تھے اور وہ مخزومی قریشی تھے۔ کوفہ کے حاکم مغیرہ بن شعبہؓ تھے جو ثقفی تھے۔ بصرہ کے حاکم ابوموسیٰ اشعریؓ تھے وہ بھی قریشی نہ تھے نہ مصری نہ عدنانی بلکہ یمنی تھے۔ مصر پر عمرو بن العاصؓ مامور تھے وہ قریش کی شاخ بنی سہم سے تھے۔ حمص کے والی عمیر بن سعد تھے جو انصاری تھے۔ دمشق پر معاویہؓ بن ابی سفیان مقرر تھے جو قریش کی شاخ بنی امیہؓ سے تعلق رکھتے تھے۔ فلسطین پر عبدالرحمان بن علقمہ معین تھے جو بنی کنانہ سے تھے۔ بحرین اور اس سے متعلقہ علاقوں پر عثمان بن ابی العاص الثقفی مامور تھے۔

بہرحال جیسا کہ آپ نے دیکھا ان عمال میں اکثریت ان کی ہے جو قریشی نہیں ہیں اور ان میں ایک بھی حضرت عمرؓ کے قبیلہ بنی عدی میں سے نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے عمال کی تقرری کو محض مضری یا عدنانی قبائل میں ہی محدود نہ رکھا تھا بلکہ انھوں نے تمام عرب قبائل سے ایسے مسلمانوں کو منتخب کیا تھا جن کا اسلام اعلیٰ خوبیوں کا حامل تھا اور جن کے بارے میں ثابت ہو چکا تھا کہ وہ بطرز احسن اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں گے اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے حضرت عمرؓ اپنے عمال کے دینی و دنیاوی ہر دو پہلو پر نگاہ رکھتے تھے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ جب کسی کو معزول یا مامور کرتے تھے تو ان کے یہاں عصبیت کو کوئی دخل نہ ہوتا تھا۔

حضرت عثمانؓ جب مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو انھوں نے ان عمال کو صوبائی شہروں اور علاقوں پر مقرر پایا اور ساتھ ہی انھیں ایک سال تک ان کے عہدوں پر باقی رکھنے کی وصیت بھی پائی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اس وصیت پر عمل کیا اور اپنی

خلافت کے سال اوّل میں کوئی تقرری یا معزولی نہ کی اور سلطنت کے دوسرے عمومی معاملات میں توجہ دیتے رہے۔ حضرت عبیداللہ بن عمرؓ اور ہرمزان کے فیصلہ نیز مختلف عمال اور عامۃ المسلمین کے نام اپنے مکاتیب

حضرت عثمانؓ کی طرف سے وظائف اور عطیوں میں اضافہ

ارسال کرنے کے بعد انھوں نے جو سب سے پہلا کام کیا وہ لوگوں کے عطیوں اور وظائف میں اضافہ تھا، یعنی انھوں نے عوام کے وظائف میں سو سو درہم بڑھا دیئے۔ حالانکہ ابھی حضرت عمرؓ کی وفات اور حضرت عثمانؓ کو خلیفہ بنے ہوئے پورا ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا اور کوئی ایسی نئی صورت حال پیدا نہ ہوئی تھی، نہ لوگوں کی ضرورتوں میں، نہ بیت المال کی آمدنی میں کہ جو اس اضافہ کا جواز پیدا کرتی۔ اس سیاست کے متعلق کم سے کم جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس

اضافہ پر محاسبہ

طریقہ میں حضرت عمرؓ کی بیت المال سے متعلق روش سے قدرے انحراف پایا جاتا ہے۔ خواہ وہ انحراف کتنا ہی تھوڑا کیوں نہ ہو کیونکہ حضرت عمرؓ کا اصول یہ تھا کہ بیت المال سے صرف اتنی ہی رقم خرچ کرتے تھے جس کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس اضافہ سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے خیال میں حضرت عمرؓ مالی سیاست میں تشدد سے کام لیتے تھے اور وہ (حضرت عثمانؓ) اپنی جانب سے اس تشدد کو پسند نہ کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بیت المال میں جو کچھ ہے اس سے لوگوں کو ایسی خوشحالی بخشی جا سکتی ہے جو انھیں عہدِ عمرؓ میں متیسر نہ تھی۔ گویا یہ عمل بالواسطہ ایک تنقید تھی جو وہ حضرت عمرؓ کی بیت المال سے متعلقہ حکمتِ عملی پر کر رہے تھے۔

لیکن ہم کھری بات کیوں نہ کہیں؟ یہ کیوں نہ کہیں کہ حضرت عثمانؓ اپنی اس جدید حکمتِ عملی کے ذریعہ عوام میں مقبولیت اور ان کے دلوں میں جگہ پیدا کرنا چاہتے تھے اور یہ انھی عوام کی دولت کے بل بوتہ پر، اس لئے کہ بیت المال خلیفہ کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کی ملکیت ہے۔ یہ واضح کہ حضرت عثمانؓ نے اس ضمن میں بھی اپنے حق سے تجاوز نہیں کیا تھا۔ اگر مسلمانوں کو یہ تسلیم تھا کہ خلیفہ کو وظائف مقرر کرنے کا حق حاصل ہے تو انھیں یہ بھی تسلیم تھا کہ بیت المال میں کمی واقع ہونے پر خلیفہ اس وظیفہ میں کمی بھی کر سکتا ہے اور اسی طرح بیت المال میں وسعت ہونے پر وہ وظائف میں اضافہ کا بھی مجاز ہے۔ تاہم یہ بات بھی واضح ہے کہ وظائف میں اس اضافہ نے ایک ایسا دروازہ کھول دیا جس کے بند کرنے کی کوئی شکل پیدا نہ ہو سکی۔ کیونکہ جب خلیفہ کو یہ اختیار ہو گیا کہ وہ لوگوں کے عطیوں اور وظیفوں میں اضافہ کرے تو پھر ان اضافوں اور وسعتوں کے لئے اس پر کوئی حد اور پابندی نہیں لگائی جا سکتی، اگر آج وہ عوام کے وظائف میں اضافے کر رہا ہے تو کل اسے یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ اسی قسم کی توسیع خواص کے ساتھ بھی کرے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ امتیازی سلوک، خصوصی رعایات اور جانبداری کی طرح پڑ جائے گی، جس کے بعد عوام کی دولت پر قابض ہونے کے لئے باہمی کشمکش، رقابت اور ایک دوسرے

سے بڑھ جانے کے لئے مقابلہ کے جذبات پیدا ہو جائیں گے حضرت عثمانؓ خود اپنے مال کے دینے میں نہایت سخی تھے اور راہِ خدا میں بے دریغ خرچ کرتے تھے صلہ رحمی اور دوست نوازی پر وہ بے حساب دولت صرف کرتے رہتے تھے۔ اور اس بارے میں ان پر کوئی مضائقہ اور کوئی گرفت نہ تھی بلکہ ان کا یہ عمل ثواب الٰہی اور اجر خیر کا مستوجب ہوتا تھا۔ لیکن حضرت عثمانؓ کا مال اتنی وسعت نہ رکھتا تھا کہ وہ عوام کو خوش کر سکتا یا اس سے وہ عوام کے وظائف میں اضافہ کر سکتے۔ لہٰذا، انھوں نے عوام ہی کے مال سے عوام کے وظائف میں اضافہ کر دیا اور اس طرح انہوں نے اپنے لئے اور عوام کے لئے ایک ایسا دروازہ کھول لیا جس میں داخل ہونے کا راستہ تو لوگوں کو ملتا تھا لیکن اس سے باہر نکلنا وہ نہیں جانتے تھے۔

اندریں حالات یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حضرت عثمانؓ نے اپنی خلافت کے ابتدائی دور میں سیرت عمرؓ کی پوری پیروی نہیں کی تھی اس لئے کہ بلا کسی معقول وجہ کے محض خلافت مل جانے کے سبب سے ایک دم وظیفوں میں اضافہ کر دینا سیرت عمرؓ کی پابندی نہ تھا لازماً وظائف میں اضافہ سے عوام کو حضرت عثمانؓ پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ کیونکہ اس طرح تو ان کی روزی میں توسیع کر کے انھوں نے عوام کے ساتھ سلوک اور احسان کیا ہے۔ اور لوگ اپنی دولت میں اضافہ کو کبھی برا نہیں سمجھتے۔ بلکہ فطری طور پر لوگوں نے اس پر اظہارِ مسرت کیا ہوگا جب حضرت عثمانؓ نے خلافت پر متمکن ہوتے ہی وظائف میں اضافہ کر کے انھیں حضرت عمرؓ کی شدت سے نجات دلائی ہوگی اور انھیں روزی کی وسعت دی ہوگی میں یہ نہیں کہتا کہ پہلے وہ تنگی میں تھے۔ اس لئے کہ حضرت عمرؓ عطیوں اور وظائف میں تنگی روا نہیں رکھتے تھے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت عمرؓ کی مقتصد اور معتدل فراخی کے بعد بہت زیادہ فراخی و وسعت پیدا کر دی۔ حضرت عمرؓ نے زندگی بھر اس آیۂ کریمہ کو اپنے لئے رہبر بنائے رکھا۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا (۱۳)

نہ تو اپنے ہاتھ کو طوق گردن بنا لے (کہ کسی خرچ کے لئے وہ بڑھے ہی نہیں) اور نہ اس کو بالکل ہی کھول دے (کہ ہر وقت خرچ ہی کرتا رہے) ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ملامت کئے ہوئے پریشان و درماندہ ایک طرف بیٹھ جاؤ گے۔

حضرت عثمانؓ نے صرف وظائف کے اضافہ ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ بقول مؤرخین انھوں نے پہلی بار صوبائی شہروں سے بھی وفود طلب کئے جس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ماتحت علاقوں کو بھی دعوت دی کہ وہ وظائف و انعامات لینے کے لئے ان کے پاس آئیں۔ بیت المال کی رقم کے خرچ کرنے میں یہ ایک ایسی فراخی تھی جس کا حضرت عمرؓ نے نہ کبھی ارادہ کیا تھا اور نہ کبھی اس کے متعلق سوچا تھا۔ حضرت عمرؓ ماہِ رمضان میں اہلِ مدینہ کو ایک خاص وظیفہ جو ایک درہم یومیہ تھا دیا کرتے تھے، صرف امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کو دو دو درہم یومیہ ملتے تھے۔ اس سے لوگ اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے ایک قسم کی

وسعت پاتے گئے حضرت عمرؓ اس روزینہ کو عمومی دسترخوان یا لنگر خانہ پر ترجیح دیتے تھے کیونکہ اس طرح لوگ اپنی مرضی کے مطابق اس رقم سے اپنے لئے سہولت پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن حضرت عثمانؓ کے خلیفہ ہونے پر جب ماہِ رمضان آیا تو انھوں نے وہ رقم بھی جاری رکھی جو حضرت عمرؓ دیا کرتے تھے اور اس کے ساتھ مسافروں اور اہلِ حاجت کے لئے دسترخوانِ عام بھی بچھا دیا۔

بیشک یہ بہت بڑی نیکی اور مہربانی تھی۔ لیکن ساتھ ہی اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس سے لوگوں کے دلوں میں اموالِ عامّہ کے حصول کا لالچ اور اس سے بیش از بیش انتفاع کی ہوس بڑھ گئی۔ کیونکہ ہر شخص اس پر قادر نہیں کہ احتیاط و عفت سے کام لے اور دسترخوانِ عام پر اسی وقت کھانے کے لئے پہنچے جب اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہ ہو۔ لیکن یہاں یہ حال تھا کہ بہت سے لوگوں نے بغیر کسی جھجک کے اپنے سالانہ وظائف میں وظیفہ ماہِ صیام کا بھی اضافہ کرا لیا اور پھر مسافروں اور حاجت مندوں کی طرح دسترخوانِ عام سے باقاعدہ متمتع ہوتے رہے۔ ممکن ہے حضرت عثمانؓ کی طرف سے لوگوں کے لئے اس توسیع میں خیر کا پہلو بھی ہو لیکن اس میں بعض پہلو ایسے بھی تھے جو سیاسی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے خطرناک تھے۔ نیز بعض ایسی شکلیں بھی تھیں جو کسی حد تک لوگوں کو بدظنی یا ناسزاگوئی کی دعوت دیتی تھیں۔ کس میں یہ طاقت تھی کہ وہ ناقدین و معترضین کو یہ کہنے سے روکتا کہ اس گراں بخشی سے ایک قسم کی شہرت طلبی مقصود ہے جس سے خلیفہ رعیت میں مقبولیت حاصل کر کے اس سخاوت سے ان کے دلوں کی تسخیر کا آرزومند ہے۔

حضرت عثمانؓ کی سخاوت اسی حد پر ختم نہ ہوئی۔ ابھی انھیں خلیفہ ہوئے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ انھوں نے صحابۂ کبارؓ کو ان مقررہ وظیفے کے علاوہ جو ان کے نام جاری تھا مختلف انعامات دینے شروع کر دیئے۔ چنانچہ ابن سعد کی روایات کے مطابق انھوں نے حضرت زبیر بن العوامؓ کو چھ لاکھ درہم دیئے۔ حضرت طلحہؓ کو دو لاکھ درہم دیئے ساتھ ہی وہ قرض بھی معاف کر دیا جو انھوں نے حضرت عثمانؓ سے لیا تھا۔ ابن سعدؒ کی روایت کے مطابق جب حضرت زبیرؓ کو یہ رقم ملی تو انھوں نے لوگوں سے پوچھنا شروع کیا کہ رقم لگانے کا کون سا بہترین مصرف ہے جس میں وہ اپنے صلہ کی رقم لگا دیں۔ چنانچہ انھیں بتایا گیا کہ وہ صوبائی شہروں اور علاقوں میں مکانات تعمیر کرائیں۔

انتظامی امور میں حضرت عثمانؓ کا حضرت عمرؓ سے اختلاف

حضرت عثمانؓ نے صرف مالی سیاست تک ہی حضرت عمرؓ کی سیرت سے انحراف نہ کیا بلکہ انھوں نے مذکورہ بالا تمام امور سے زیادہ خطرناک پالیسی میں بھی حضرت عمرؓ کی مخالفت کر ڈالی اور وہ یہ کہ انھوں نے صحابۂ کبارؓ کو اجازت دے دی کہ وہ حجاز سے نکل کر سلطنت اسلامیہ کے اندر جہاں چاہیں جائیں اور آباد ہو جائیں۔ حالانکہ

حضرت عمرؓ انھیں مدینہ سے باہر نہ جانے دیتے تھے۔ اور اپنی خاص اجازت کے بغیر کسی کو صوبجات کا رُخ نہ کرنے دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ وہ قریش کو فتنوں سے بچانے کے لئے سیاہ کنکریوں والی گھاٹیوں کے سرے پر کھڑے ہوئے ان کو مضبوطی سے پکڑ کر روکے ہوئے ہیں ـــــ لیکن حضرت عثمانؓ نے ان کی راہ سے یہ حائل ہٹا دیا۔

اب جبکہ حضرت عثمانؓ نے وظائف میں اضافہ کر دیا بلکہ اس سے بڑھ کر صلات و انعامات کا سلسلہ جاری کر دیا۔ پھر ان صلات و انعامات پانے والوں کو تمام اخلائے سلطنت میں پھیل جانے کی اجازت دے کر یہ موقع بھی دے دیا کہ وہ فتح یا عساکر اور مفتوح رعیت کے ساتھ رہنے لگیں تو پھر اس میں تعجب کی کون سی بات ہے کہ اس طبقہ کو ایک طرف تو فراوانی دولت حاصل ہو گئی اور دوسری طرف ان کے ہم خیال پیروکار اور حامیوں کی جماعت میں اضافہ ہو گیا اور نتیجتاً ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی گروہ کا سردار بن گیا اور وہ گروہ سمجھنے لگا کہ ہمارا سردار مسلمانوں کے امور کی تولیت کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔ اور وہ اس موقع کی تلاش میں لگا رہا کہ وہ اپنے سردار کو مسلمانوں کا والی بنا سکے؟

حضرت عثمانؓ کے لئے ان مذکورہ بالا مکاتیب ارسال کرنے کے بعد کون سی چیز ہے جو انھیں عملاً سیرت عمرؓ و ابوبکرؓ سے منحرف کرا سکتی تھی، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عثمانؓ دین کے معاملہ میں مداہنت کے قائل نہ تھے یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت عثمانؓ کو اپنی اس حکمتِ عملی میں سیرت ابوبکرؓ و عمرؓ سے کسی قسم کا معمولی یا اہم کوئی انحراف نظر نہ آتا تھا۔ انھوں نے قصداً نہ کسی پر ظلم کرنا چاہا تھا نہ کسی کی طرفداری کی تھی۔ انھوں نے تو لوگوں پر انہی کے اموال میں سے توسیع کی تھی۔ انھوں نے بیت المال بھرا ہوا پایا اور اسے زیادہ بھرنا مناسب نہ سمجھا۔ پھر اس میں کیا حرج تھا کہ وہ اس مال میں سے تھوڑا یا بہت، ان صحابۂ کرامؓ کو انعامات کی شکل میں عطا کر دیں جنھوں نے دینِ اسلام کی بنیادیں مضبوط کی تھیں، اسلامی ریاست کی بنا ڈالی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بڑے کارنامے انجام دیئے تھے اور بڑی محرومیوں، سختیوں اور آزمائشوں کے دور سے گزرے اور بے پناہ شدائد و آلام کے متحمل رہے تھے، اب جب خدائے تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا اور دولت کی فراوانی و خوشحالی عطا فرمائی تو اس نعمت سے متمتع ہونے کا ان مہاجرین سے زیادہ اور کون حقدار ہو سکتا تھا؟

یہ ٹھیک ہے کہ حضرت عثمانؓ نے بہ خیالِ خویش سنتِ موروثہ کی مخالفت نہ کی تھی بلکہ انھوں نے تو اپنی پیدایاتی سخاوت پر عمل پیرا ہو کر مسلمانوں کو خوشحالی عطا کی تھی صحابۂ رسول کو انعامات بخشے تھے۔ ان میں سے کوئی بات بھی گناہ نہیں ہے بلکہ یہ امور تو سراسر بھلائی، نیکی اور احسان ہی احسان پر مبنی تھے بظاہر لوگوں کو بھی اس میں کوئی اعتراض نہیں تھا، انھیں دولت و خوشحالی نصیب ہو رہی تھی انہوں نے نہ بُرا مانا نہ اُسے واپس کیا۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جسے مہاجرین میں سے

عہدِ عثمانؓ کے متعلق مؤرخین کے بیان کا مطلب

السابقون الاوّلون اور رسول خدا کے جلیل القدر صحابہ کرامؓ کو انعامات دیئے جانے میں کوئی اعتراض ہو، اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر حضرت عثمانؓ اپنی سخاوت اور صحابۂ کبارؓ کو وسیع پیمانہ پر بخششیں دینے میں اسی حد پر ٹھہرے رہتے تو لوگ ان پر کوئی الزام عائد نہ کرتے، یہ ہے مؤرخین کے اس قول کا مطلب کہ خلافتِ عثمانی کا صدرِ اوّل رضامندی، خوشحالی اور طمانیت کا دور تھا۔ اور یہ کہ مسلمانوں نے حضرت عثمانؓ کی خلافت کو اس کی نرمی، سہولت پسندی، کشائش اور فیاضی کے سبب سے حضرت عمرؓ کی خلافت کے مقابلے میں زیادہ پسند کیا تھا۔ کیونکہ حضرت عمرؓ کی سیاست میں ایسی شدت، سختی اور حزم و احتیاط کے عناصر تھے جنھیں برداشت کرنے کے لئے بڑے صبر و استقلال اور جفاکشی و عرق ریزی کی ضرورت تھی۔

بہتر ہے کہ ہم حضرت عثمانؓ کو ان کے سالِ اوّل یا ان کی خلافت کے ان ابتدائی سالوں میں چھوڑ دیں جبکہ ان کی اس نرم و فیاضانہ پالیسی نے انہیں عوام میں محبوب و ہر دلعزیز بنا دیا تھا؛ اور ایک نگاہ ان لوگوں پر ڈالیں جنھیں حضرت عثمانؓ نے اپنی پُرشفقت و نرم سیاست سے جوڑنا اور ملانا چاہا تھا تاکہ ہم اندازہ لگا سکیں کہ آیا اس سیاست کے ذریعہ ان کے انتشار و اختلاط کو ختم کر کے انھیں جوڑا اور ملایا بھی جا سکتا تھا یا نہیں؟

(٥)

باب ششم

حضرت عثمانؓ اور اُن کی رعایا

طبری نے بروایت سری ۔شعیب ۔سیف عمارۃ ابن القعقاع ۔حسن بصری سے بیان کیا ہے کہ " حضرت عمرؓ نے مہاجرین میں سے اکابر قریش پر یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ وہ بلا اجازت اور تعینِ مدّت، مدینہ سے باہر کسی علاقہ میں نہ جائیں ۔ اس پابندی پر قریش کو شکایت ہوئی ۔جب حضرت عمرؓ کو ان کی شکایت کا علم ہوا تو انھوں نے کہا " یاد رکھو کہ میں اسلام کی عمر کو اونٹ کی عمر کے ساتھ تشبیہہ دیتا ہوں پہلے اونٹ جوان ہوتا ہے ۔ پھر اس کے اگلے دو دانت نکلتے ہیں ۔ پھر ان سے متصل چار مزید دانت نکلتے ہیں پھر اس کے نچلے دانت نکلتے ہیں پھر وہ بھرپور عمر پر پہنچ جاتا ہے' یاد رکھو اس عمر کے بعد پھر گھٹوتری کی امید ہی باقی رہ سکتی ہے ۔ یاد رکھو اسلام بھی اونٹ کی طرح بھرپور عمر پر پہنچ چکا ہے ۔خبردار! قریش اللہ کے مال کو دوسرے بندگانِ الٰہی سے ہٹا کر صرف اپنی تحویل میں رکھ لینا چاہتے ہیں ۔لیکن جب تک عمر بن الخطاب زندہ ہے ایسا کبھی نہ ہوگا ۔ یقین مانو میں سیاہ پتھروں والی گھاٹی کے سرے پر قریشیوں کے گلے اور کمر پکڑے کھڑا ہوں تاکہ انھیں آگ میں نہ گرنے دوں ۔"

قریش کے ساتھ طرزِ عمل

طبری نے بروایت سری ۔شعیب ۔سیف اور محمد و طلحہ بیان کیا ہے کہ " جب عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے قریش پر وہ پابندی عائد نہ کی جو حضرت عمرؓ نے کر رکھی تھی ۔چنانچہ وہ اکناف ملک میں پھیل گئے جب انھوں نے سلطنت کی وسعتوں کو دیکھا ، دنیا دیکھی اور لوگوں نے انھیں دیکھا تو ہر وہ شخص جسے اسلام میں کوئی بزرگی و برتری حاصل نہ تھی اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہا تھا ان سے جا ملا ، اس طرح ان قریشیوں کے اردگرد ایسے لوگوں کی جماعتیں بن گئیں جو ان کی اُمیدیں بندھانے اور حوصلہ افزائی کرنے لگیں ۔یہ لوگ دل میں کہتے تھے کہ انہی لوگوں کو حاکم بننا ہے ، ہمارا ان سے پہلے ہی تعارف ہو گیا ہے اور ہم ان کی جماعت میں شریک ہو گئے اور ان کے مقرب بن گئے ہیں ۔لہٰذا ان کے برسرِ اقتدار آنے سے ہمیں فائدہ ہوگا ، یہ تھی وہ بنیادی اور پہلی خرابی جو اسلام میں رونما ہوئی اور یہی تنہا وہ پہلا فتنہ تھا جس نے عوام کو اپنی زد میں لے لیا تھا ۔

طبری نے ایک روایت بواسطہ سری، شعیب، سیف بن عمر اور شعبی بیان کی ہے کہ حضرت عمرؓ کی وفات ہوئی ہے تو اس وقت قریشی ان سے دل برداشتہ ہو چکے تھے کیونکہ حضرت عمرؓ نے انھیں مدینہ میں بند کر رکھا تھا اور وہاں سے باہر نکلنے سے روک رکھا تھا وہ کہا کرتے تھے "میرے نزدیک اس امت کے حق میں سب سے زیادہ خوفناک چیز تم لوگوں کا اکناف سلطنت میں پھیل جانا ہے"۔ اگر ان پابندِ مدینہ مہاجرین حضرات میں سے کبھی کوئی جنگوں میں حصہ لینے کے لئے ان سے اجازت طلب کرتا تو حضرت عمرؓ یہ جواب دیا کرتے تھے کہ آپ نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو جہاد کئے ہیں وہ آپ کے لئے کافی ہیں آج آپ کے لئے جہاد سے یہ بدرجہا بہتر ہے کہ نہ آپ دُنیا کو دیکھیں اور نہ دُنیا آپ کو دیکھے"۔ یہ عمل صرف مہاجرینِ مدینہ سے مخصوص تھا دیگر اہلِ مکہ اس میں شامل نہ تھے لیکن جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے یہ پابندی ہٹالی اس طرح یہ لوگ تمام سلطنت میں پھیل گئے اور عوام ان کے اردگرد جمع ہونے لگے اور یہ سبب ہے کہ حضرت عثمانؓ ان لوگوں میں حضرت عمرؓ سے زیادہ محبوب ہو گئے۔

قریش کا تعارف حضرت عثمانؓ کی رعایا میں ہم سب سے پہلے قریش کا ذکر کرتے ہیں، اور تمہیداً حضرت عمرؓ کا قریش کے ساتھ طرزِ عمل اپنی آج کی زبان میں بیان کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کو قریش کی جانب سے اور قریش کے حق میں جس قدر آزمائش وفتنہ کا خطرہ تھا آنا کسی اور سے نہ تھا۔ کیونکہ حضرت عمرؓ قبائلِ عرب میں قریش کے مقام کو کماحقہٗ جانتے تھے۔ وہ قریش کے مضبوط اور کمزور جملہ پہلوؤں سے بخوبی آگاہ تھے۔ قبیلہ قریش جس میں خود حضرت عمرؓ نے پرورش پائی تھی دعوتِ اسلام سے قبل اپنی قوت اور کمزوری کی وجہ سے ممتاز تھا۔۔۔۔ قریش کی قوت کا سرچشمہ خانۂ کعبہ کے اردگرد ان کی آبادی اور مناسکِ حج کی تولیت تھا جس کے باعث وہ تمام عربوں پر تسلط اور حکمرانی کیا کرتے تھے اور ان اُمور کی بدولت وہ خود میں ایک ایسی امتیازی شان پاتے تھے جس میں دوسرا کوئی قبیلہ ان کا شریک نہ تھا۔ انھیں اپنی برتر ارستقراطیت پر گھمنڈ اور ناز تھا۔ پھر تمام عرب نے بھی ان کی اس برتری وارستقراطیت کو متفقہ طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ اس برتری کا سبب ان کا جنگی تفوق یا تلوار کی طاقت میں امتیاز نہ تھا کیونکہ قریش کوئی جنگجو قبیلہ نہ تھا بلکہ ان کی اس سیادت کا منبع مذہب اور مذہب کے چھوٹے بڑے مسائل کی واقفیت پر مبنی تھا۔ ان کی قوت کا دوسرا سرچشمہ ان کی وہ وسیع تجارت تھی جو عربوں کی تمام تجارتوں پر حاوی وغالب تھی یہ وسیع تجارت بھی انھیں امن حرم اور کعبہ کے نواح میں آباد ہونے کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔ ان سہولتوں نے اس قبیلہ کو ایسی ذہانت، تدبر، دوراندیشی اور اولوالعزمی بخش دی تھی جو قبیلۂ ثقیف کے سوا باقی تمام عرب کے باشندوں میں سے کسی اور کو میسر نہ تھی۔ قریش مشرقِ بعید اور مشرقِ قریب کے مابین تجارت کی وجہ سے ایک رشتہ قائم کئے ہوئے تھے اور اسی بنا پر وہ مشرق ومغرب بلکہ روم وہند کے مابین تعلقات قائم کئے ہوئے تھے۔ اس تجارت نے

قریش کو بہت عظیم مالی فائدوں سے زیادہ دنیاوی تجربے سکھائے۔ کثرتِ دولت نے قریش کو حرص۔ محافظتِ زر۔ خوش تدبیری اور مال سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنا سکھایا۔ مسلسل تجربات اور اقوام عالم سے ارتباط و اختلاط تیز مختلف دور دراز کے علاقوں کی سیر و سیاحت نے انھیں مشکلات کا مقابلہ کرنے اور ان پر قابو پا لینے میں ماہر بنا دیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بالآخر اسی کا نتیجہ تھا کہ قریش نہایت پختہ کار، بڑا چالاک و ہوشیار اور حیلہ ساز قبیلہ بن گیا تھا۔

ان تمام امور نے قریش کو بے حد بلند ہمت اور طامع بنا دیا تھا۔ اسی چیز نے انھیں ناموافق و ناسازگار حالات میں استقلال سے کام لے کر مشکلات پر قابو پانے اور دشواریوں کو مسخر کرنے کا خوگر بنا لیا تھا، یہی نہیں بلکہ ان امور نے قریش کو اس سے بھی زیادہ خطرناک حد تک بڑھا دیا تھا جس پر پہنچنے کے بعد انھوں نے مسلمہ اقدار کو حقیر سمجھنا شروع کر دیا تھا وہ لوگوں کے مستحکم عقائد و رسوم کا تمسخر اڑانے لگے تھے وہ فوری یا دیر یاب منفعت کی خاطر ہر شے کو جائز قرار دے رہے تھے۔ ان کی چالبازی اس حد تک وسعت اختیار کر چکی تھی کہ باوجود اس کے کہ انھیں مذہب سے قطعاً کوئی تعلق اور لگاؤ نہ تھا وہ عرب والوں کو یہی بتاتے رہے کہ وہی اکیلے مذہب کے محافظ و امین ہیں۔ سردارانِ قریش کے نزدیک اگر مذہب کی کوئی وقعت تھی تو یہ کہ وہ ایک وسیلہ ہے نہ کہ غایت۔ ان نصب شدہ بتوں کے بارے میں ان کا یہی خیال تھا کہ وہ روزی کمانے اور اقتدار پھیلانے کے ذرائع ہیں اور بس۔ گویا ہر قریشی سردار ایک خودغرض حریص، دور اندیش چالاک اور انتہائی مدبر سیاستدان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہجوم مشکلات کا کیونکر سامنا کرے اور کس طرح ابتلاء و محن کے چنگل سے صحیح و سالم نکل جائے۔

حضرت عمرؓ قریش کی اس نفسیات اور جملہ حالات سے آگاہ تھے۔ لہٰذا قریش اپنے بارے میں انھیں کوئی فریب نہ دے سکے۔ بلکہ قریش کا قبولِ اسلام اور حکومت اسلام کے ساتھ ان کی وفاداری بھی حضرت عمرؓ کو ان کی رائے سے نہ ہٹا سکی۔ یہی سبب ہے کہ حضرت عمرؓ نے قریش کی سیاست میں انتہائی احتیاط سے کام لیا۔ ان کے حق میں نرمی اور مہربانی کو روا نہ رکھا۔ اور انھیں ہرگز یہ اجازت نہ دی کہ وہ من مانے طریق پر اپنی بے پناہ حرص اور دوررس ارادوں پر قادر ہو جائیں اور نہ یہ موقع دیا کہ وہ بزعم خود غلط ہو کر دوسروں کی توہین کریں۔ ویسے حضرت عمرؓ فضیلت مہاجرین کے اتنے ہی معترف تھے جتنے کہ رسولِ خدا صلعم ان کے مراتب کو بیان فرماتے تھے۔ چنانچہ وہ حسب مراتب ان کا اعزاز و احترام ملحوظ رکھتے تھے اور اپنی خصوصی رعایات و عنایات سے انھیں سرفراز کرتے تھے۔ لیکن اپنی خلافت کے دوران انھوں نے کوئی ایسی شکل پیدا نہ ہونے دی جس سے قریش کو اپنی دلی آرزوؤں کے برلانے کا موقع ملتا۔ خود ان کے اپنے الفاظ اس بارے میں سب سے بڑی شہادت ہیں کہ قریش کو آگ میں گرنے سے بچانے کے لئے ان کے گلے اور کمر پکڑے ہوئے سیاہ کنکروں کی گھاٹی

کے سرے پر کھڑا ہوں۔ اسی طرح جب کوئی مہاجر جہاد میں شریک ہونے کی اجازت طلب کرتا تو ان کا یہ جواب کہ آپ نے رسولِ خدا کے ساتھ جہاد کئے وہی کافی ہیں۔ آپ کے لئے جہاد سے بہتر یہ ہے کہ نہ آپ دنیا کو دیکھیں اور نہ دنیا آپ کو دیکھے۔ مگر اس معاملہ میں محکم ترین ثبوت وہ شدت ہے جس کا مظاہرہ انھوں نے حضرت خالد بن ولیدؓ کے حق میں کیا۔ باوجودیکہ حضرت خالد نے عہدِ نبویؐ اور عہدِ ابوبکرؓ میں اہلِ عرب اور اہلِ روم کے خلاف صف آراء ہو کر کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے انھیں معزول کیا اور ان کی نگرانی کی، صرف اس وجہ سے کہ وہ قریش کو بخوبی جانتے تھے۔ اور اس کی طرف سے بدگمانی رکھتے تھے کہ وہ قوت کا غلط استعمال کرے گی، اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے سے باز نہیں رہے گی۔ وہ آگاہ تھے کہ قریش میں اپنی کمزوریوں پر قابو پانے کی قدرت موجود نہ تھی۔ یہی چیز قریش کا کمزور پہلو تھی۔ کیونکہ اس کے سبب وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگتے اور غرور و کبریائی کا شکار ہو جاتے تھے۔ اسی کے باعث وہ مال کی محبت اور لالچ کرنے لگتے اور اسے ناحق لینے کے درپے ہو جاتے تھے۔ یہی چیز انھیں خود غرضی کا سبق سکھاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ زود یاب منافع اور لذات پر ٹوٹ پڑتے تھے حالانکہ کبھی کبھی یہ لذات گناہ سے بھی ملوث ہوتی تھیں۔ یہی چیز انھیں حرص بے پایاں کی راہ دکھاتی تھی۔ جس کے باعث وہ ہر حد کو عبور کر کے دوسروں کے مال پر نگاہ ڈالنے کا عادی اور ظلم و استبداد کا مرتکب کر دیتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب حضرت عمرؓ ان مہاجرین سے اس قدر خائف تھے جو عرصہ تک رسولِ خداؐ کی صحبت میں رہے اور جنھوں نے ہر مقام پر اور ہر مصیبت کے موقع پر نہایت پامردی کا ثبوت دیا تو ان قریشیوں سے جو بعد میں اسلام لائے حضرت عمرؓ کو لازماً اتنا ہی بلکہ ان سے زیادہ خطرہ ہوگا۔ کیونکہ ان میں وہ بوڑھے اور وہ جوان بھی شامل تھے جنھوں نے برضا و رغبت اسلام قبول نہیں کیا تھا وہ یا تو اسلام کے پلڑے کو جھکتا ہوا دیکھ کر طمع و لالچ کی وجہ سے مسلمان ہوئے تھے یا پھر جب وہ مکہ میں چاروں طرف سے گھر گئے تو کرہاً اسلام قبول کر لیا۔ ان دونوں اسباب کی بناء پر اسلام لانے والوں نے دینِ اسلام کو اس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا کہ وہ ایک ایسا دین ہے جس کا تعلق قلوب و ضمائر سے ہے اور جس میں اللہ کے حقوق و فرائض کی پابندی لازم ہوتی ہے بلکہ انھوں نے اسلام ایک بڑے سودے کی حیثیت سے دیکھا جیسے سودے وہ کرتے رہتے تھے، انھوں نے اسے بھی ایک خطرناک اور جرأت مندانہ اقدام خیال کیا جیسے اقدامات وہ عموماً اندرون و بیرونِ عرب میں کرتے رہتے تھے۔ انھیں یہ بھی یاد تھا کہ جب رسولِ خداؐ نے انھیں اسلام کی دعوت دی تھی تو ان سے دنیوی حکومت اور اُخروی جزائے خیر کا وعدہ فرمایا تھا۔ چنانچہ دنیوی حکومت تو سب ہی کے خیال میں تھی لیکن اُخروی ثواب کا خیال معدودے چند کو تھا۔ اسی دنیوی خیال نے انھیں قبولِ اسلام پر آمادہ کیا اور یہی سبب تھا کہ انھوں نے جہاد و فتوحات کی گرانبار ذمہ داریوں کو دوسرے لوگوں کی طرح بلکہ ان سے بھی ایک قدم آگے رہ کر برداشت کیا۔ ان میں سے بیشتر بخلوص نیت یا نمائشی طور پر یہ چاہتے تھے کہ جنگوں میں

بڑھ چڑھ کر کارہائے نمایاں انجام دے کر وہ اس محرومی کی تلافی کر سکیں جو انھیں رسولِ خدا کی معیت میں شریک غزوات نہ ہو سکنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ یہی سبب ہے کہ جب عرب شاہراہ فتوحات پہ گامزن ہوئے تو یہ لوگ بھی ہر امکانی استعداد کے ساتھ بصد جوش و خروش بھرتی ہو گئے۔ ان میں سے بیشتر متاع دنیوی کے طلبگار تھے، اور بہت ہی کم ثواب آخرت کے طالب تھے۔ ان کے زعماء و رؤساء کو خیال تھا کہ وہ مغلوب ہو کر معافی پانے والے (طلقاء) ہیں اس لئے فتح مکہ سے پہلے اسلام لا کر کارہائے نمایاں انجام دینے والوں سے وہ کم مرتبہ ہیں۔ یہ خیال انھیں دل ہی دل میں جلاتا اور غصہ دلاتا رہتا تھا اور ان پر وہی کیفیت طاری کرتا تھا جسے ہم آج کل کی زبان میں "احساس کمتری" کہتے ہیں۔ پھر انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے بارے میں حضرت عمرؓ کی مخصوص رائے کیا ہے۔ اس خیال کی وجہ سے وہ حضرت عمرؓ سے بھی ناراض تھے اور یہی بات انھیں جہاد میں پامردی سے شدائد کا مقابلہ کرنے پر ابھارتی تھی تاکہ وہ حضرت عمرؓ پر ظاہر کر سکیں کہ ہمارے بارے میں آپ کی رائے مبنی بر صواب نہیں۔ نیز دوسرے لوگوں پر بلکہ ان سے پہلے اپنے آپ پر بھی اسی حقیقت کا انکشاف کر سکیں —— ذیل کے واقعہ سے آپ کو اس خیال کی تائید ملے گی۔ کہتے ہیں کہ جب خالد بن ولیدؓ کے پاس شام کی ایک جنگ میں عکرمہؓ بن ابی جہل زخموں سے چور لائے گئے تو انھوں نے اپنا سر حضرت خالدؓ کی ران پر رکھ کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابن حنتمہ (یعنی حضرت عمرؓ) سمجھتے ہیں کہ ہم شہادت کے طلب گار نہیں ہیں!"

غرضیکہ حضرت عمرؓ کا طرزِ عمل قریش کے حق میں اس درجہ سخت گیرانہ تھا کیونکہ وہ ان کی نفسیات سے واقف تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ قریش کسی چیز کو بھی جو ان کے قبضے میں آجائے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اور ہر اس چیز کے لئے جو ان کی دسترس سے باہر ہو جان لڑا دینے کو تیار رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ رسولِ خدا نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو خارش کی وجہ سے ریشمی لباس پہننے کی اجازت دی تھی۔ لیکن ایک روز جب وہ حضرت عمرؓ سے ملنے آئے تو ان کے ساتھ ان کا ایک لڑکا بھی تھا جس نے ریشمی قمیض پہن رکھی تھی۔ حضرت عمرؓ نے لڑکے کو دیکھ کر کہا کہ یہ کیا ہے؟ ساتھ ہی اپنا ہاتھ قمیض کے گریبان میں ڈال کر اسے کنارے تک چاک کر دیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ رسولِ خدا نے مجھے ریشم پہننے کی اجازت عطا فرمائی تھی۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا "ہاں" لیکن وہ اجازت صرف تمہیں تمہاری بیماری کے پیش نظر دی گئی تھی تمہارے بیٹے کے لئے نہیں تھی۔"

حضرت عمرؓ کو مہاجرین کی طرف سے تو اس خیال کے تحت خطرہ رہتا تھا کہ کہیں وہ رسولِ خدا کی دی ہوئی اجازت و رعایت

ؔ ان کے باہمی مراتب میں فرق ضرور تھا لیکن قرآن مجید نے کُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی (۴:۹۵) کہہ کر ان کے مقام بلند کی بھی نشاندہی کر دی تھی۔

سے ناجائز فائدہ اٹھاکر حد سے نہ بڑھ جائیں۔ مگر غیر مہاجرین قریشیوں سے انھیں اس لئے خطرہ تھا کہ کہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں کو منع کیا ہے ان میں بھی وسعت پیدا کرکے ان سے فائدے حاصل کرنا شروع کر دیں۔ غالباً یہی سبب ہوگا کہ حضرت عمرؓ نے عام مسلمانوں کو خطرے سے محفوظ رکھنے کے لئے حضرت معاویہؓ کو بحری لڑائیوں کی اجازت نہ دی جس کی اجازت لینے کے لئے حضرت معاویہؓ بار بار حضرت عمرؓ سے تقاضے کرتے تھے کیونکہ حضرت عمرؓ کو اس اقدام میں وہی قریشی خطرپسندی کا گمان گزرتا تھا جس میں قریشی بغیر ہچکچاہٹ کے کود جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا خیال تھا کہ انھیں لازماً عامۃ المسلمین کو قریشی کو جوانوں کی خطرپسندی سے بچائے رکھنا چاہیئے۔ پہلے ہم بیان کر آئے ہیں کہ خلافتِ ابی بکرؓ نے قریش کو اچانک ارستقراطیت بخش دی تھی جو اس کی قدیم ارستقراطیت کا نعم البدل تھی۔ حضرت عمرؓ اسی ارستقراطیت سے خائف تھے۔ اور اس کی حدبندی کرتے رہتے تھے تاکہ اسے بے راہ روی سے روکا جائے۔

حضرت عثمانؓ پر جس رعایا کی نگرانی آن پڑی تھی قبیلۂ قریش اس کا ایک حصہ تھا، حضرت عثمانؓ کے لئے صرف دو ہی راستے تھے۔ تیسری کوئی شکل نہ تھی یا تو وہ حضرت عمرؓ کی سی سختی اور بندش سے کام لے کر زعمائے مہاجرین کو پابند مدینہ رکھتے اور قریشی عوام کے حق میں اسی بدگمانی کا مظاہرہ کرتے جس کا اظہار حضرت عمرؓ کرتے تھے۔ قریش کے بزرگوں اور نوجوانوں کو ان کی حدود میں مقید رکھتے اور حکومت و امارت کو انہی شرائط کا پابند کرتے جن کی پابندی حضرت عمرؓ کرتے تھے یعنی حکومت کے عہدے انہی کو دیئے جائیں جو ان کی ذمہ داریاں انجام دینے کی قابلیت و استعداد رکھتے ہوں اور اس میں تمام عرب ہی نہیں بلکہ جملہ مسلمانوں کو برابر کا موقع دیا جاتا۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ نرمی اختیار کرتے قریش کو من مانی کرنے کی چھٹی دے دیتے۔ تاکہ انھیں یہ اجازت ہو کہ وہ طمع و ہوس، خطرپسندی اور خودغرضی کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زن ہوں آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ حضرت عثمانؓ نے پہلی راہ کی بجائے طوعاً یا کرہاً دوسری راہ اختیار کی۔

حضرت عثمانؓ کی رعیت کا دوسرا فریق انصار تھے۔ اسلام میں انھیں جو مقام حاصل ہے وہ سب جانتے ہیں خدائے تعالیٰ نے قرآن میں ان کی جو تعریف کی ہے وہ محفوظ ہے اور رسولِ خدا نے ان کی رعایت کا حکم دیا وہ بھی سب پر عیاں ہے۔

جماعت انصار

یہ آپ دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کے "امامت قریش میں[1] ہوگی" بیان کرنے کی وجہ سے انصار خلافت سے محروم ہو گئے تھے۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے انصار سے فرمایا تھا "ہم امیر ہوں گے اور تم وزیر" چنانچہ حضرت ابوبکرؓ انصار سے اسی طرح مشورہ لیتے رہے جس طرح مہاجرین سے

---

[1] یہ حدیث وضعی ہے اس لئے حضرت ابوبکرؓ نے ایسا کبھی نہیں کہا

لیتے تھے، حضرت عمرؓ کا بھی یہی اصول رہا۔ حضرت عثمانؓ نے بھی ان سے مشورہ لینے میں کوتاہی نہ کی۔ لیکن یہ ائمہ ثلاثہ انصار میں سے صرف صحابۂ کرامؓ سے مشورہ لیتے تھے۔ لیکن انصار کے وہ نوجوان جنھیں حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں کوئی اہمیت حاصل نہ تھی اور حضرت عمرؓ کے عہد میں انھوں نے ہوش سنبھالنا شروع کیا تھا اور عہدِ عثمانؓ میں تو وہ بجوبی خود نگر و خود شناس ہو گئے انھیں کوئی ایسا امتیاز حاصل نہ تھا جو انھیں دوسروں سے فائق ثابت کرتا۔

حضرت عمرؓ نے والیوں اور عاملوں کی تقرری کے بارے میں یہ اصول بنا رکھا تھا کہ عہدے فقط قریش تک ہی محدود نہ رہیں۔ بلکہ تمام قبائلِ عرب کو مدنظر رکھ کے انتخاب عمل میں لایا جائے۔ اگر حضرت عمرؓ زندہ رہتے تو یقیناً وہ ان نوجوانوں پر یہ بات واضح کر دیتے کہ حکومت ان کے حق میں کوئی کمی نہ کرے گی انھیں بھی دوسرے لوگوں کی طرح تمام حقوق حاصل ہوں گے خصوصاً انھیں ان کا حق ولایت و حکومت بھی ضرور ملے گا۔ بیشک انصار کے شیوخ اور عظماء حضرت ابوبکرؓ کی رائے اور حضرت عمرؓ کے طرزِ عمل کو بہ خلوص خاطر پسند کرتے تھے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ انصار کے عوام بالخصوص ان کا نوجوان طبقہ قریش کی اس جدید استقراطیت سے بیزار اور دل برداشتہ تھا، وہ جانتے تھے کہ انھوں نے ہی بدر کے میدان میں اسلام کی خاطر قریش کو مارا تھا اور وہی مہاجرین کے ہمراہ فتح مکہ میں شریک تھے۔ اگر انصار کو کوئی شے تسلی دیتی تھی تو یہ بات کہ حضرت عمرؓ قریش کو خوب دبائے رکھتے تھے اور انھیں دوسرے مسلمانوں پر کوئی ترجیح نہ دیتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے بعد انصار کا موقف ان کے بارے میں اس امر پر منحصر تھا کہ وہ قریش کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں، یعنی یہ کہ اگر وہ حضرت عمرؓ کی سیرت پر کاربند رہتے ہیں تو انصار کو بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح امور دنیوی میں سے ان کا حصہ ملنے کی امید ہوتی۔ اور اگر وہ قریش کو دوسروں پر ترجیح دیں گے ان کی جانبداری کرتے ہوئے انھیں زیادہ عزیز رکھیں گے تو پھر انصار یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ قریشی ارستقراطیت نہایت سرکش و خود غرض ہے اور قریش کے مقابلہ میں ان کی حیثیت مغلوبوں اور محکوموں کی سی ہو گی نہ ان لوگوں کی سی جو امامت کو چھوڑ کر باقی تمام امور میں قریش کے ساتھ برابر کے شریک ہوں۔ آگے چل کر آپ دیکھ لیں گے کہ حضرت عثمانؓ نے بخوشی یا بہ مجبوری قریش کو دوسروں پر ترجیح دی۔ جس نے انصار کو سخت صدمہ پہنچایا اور ان کی اس رنجش کا بعد میں ہونے والے فتنہ و فساد اور اس کے نتائج و عواقب میں بہت بڑا دخل تھا۔

حضرت عثمانؓ کی رعیت کا تیسرا فریق عرب کے عوام تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو طوعاً یا کرہاً اسلام لائے اور حضرات

عرب کے عوام

ابوبکرؓ و عمرؓ نے انھیں معرکہ ہائے فتوحات کی جانب دھکیل دیا ــــ وہاں ان سے جو کچھ بن پڑا انھوں نے کیا۔ اس کے بعد وہ محروسہ شہروں اور سرحدی علاقوں میں آباد ہو گئے تاکہ ایک جانب وہ مسلمانوں کے لیے آڑ بن کر انھیں دشمن سے محفوظ رکھیں اور دوسری طرف وہ لشکر میں شامل ہو کر آگے بڑھتے

رہیں اور دشمنوں کا علاقہ فتح کریں۔ یہ وہی عرب تھے جنہیں اسلام نے مکمل مساوات کا وعدہ دیا تھا کہ کسی کو کسی پر تقویٰ، کفایت اور مردانہ وار محنت کشی کی فضیلت کے سوا اور کوئی فضیلت حاصل نہ ہوگی۔ یہ وہی لوگ تھے جنہیں حضرت عمرؓ اسلام کا خام مواد کہا کرتے تھے۔ انہی نے وسیع علاقے تسخیر کئے تھے۔ دشمن کو زیر کیا تھا۔ اور دینِ خدا کو آفاق میں پھیلا دیا تھا۔ اندریں صورت وہ حقدار تھے کہ حاکمیت کے معاملہ میں کسی کو ان پر ترجیح نہ دی جاتی۔ بایں ہمہ وہ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور عہد جاہلیت سے قریب تر تھے ابھی وہ اپنے دورِ جاہلیت کے باہمی جھگڑے، تعصبات، مفاخرت، حسب نسب اور مال و دولت میں باہمی فخر و مقابلے بھی نہ بھولے تھے۔ ان دیرینہ مفاخر جاہلیت کے علاوہ ان میں کچھ جدید مفاخر بھی شامل ہو گئے تھے جو قدیم مفاخر سے زیادہ خطرناک اور اہم نتائج کے حامل تھے۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے لئے موزوں و مناسب سیاست وہی تھی جو ایک طرف تو ان کی جاہلیت کو نابود کر دیتی اور دوسرے انھیں خالصتاً اسلامی رنگ میں رنگ کر یہ ثابت کرتی کہ خدا نے ان کے ساتھ اخوت و عدل کے جو وعدے کئے ہیں وہ سب سچ ہیں۔ حضرت عمرؓ تو پوری طرح اسی راہ پر گامزن رہے۔ انھوں نے جاہلیت کا حتی الوسع مقابلہ کیا یہاں تک کہ وہ ان شعراء کو بھی ڈراتے دھمکاتے رہتے تھے جو جاہلیت کے واقعات پر مشتمل اشعار سناتے تھے یا جو اپنے کلام میں جاہلیت کے آثار کا ذکر کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے صوبہ جات میں صحابہؓ کرام میں سے کئی بزرگوں کو معلم مقرر کر کے بھیجا جو وہاں کے باشندوں کو قرآن مجید پڑھاتے، طریق سنت سمجھاتے، دین میں تفقہ کی استعداد عطا کرتے اور اس طرح انھیں خالص اسلامی تربیت دیتے تھے۔ علاوہ ازیں حضرت عمرؓ ایک فریق کو دوسرے فریق کے مقابلے میں کوئی امتیاز نہ دیتے تھے اور نہ حکومت کے مناصب کے ضمن میں ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ پر فضیلت دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان میں مساوات اور مکمل عدل کو رواج دیا۔ انھوں نے قبائل مضر اور ربیعہ سے بھی والی منتخب کئے اور قبائل یمن سے بھی۔ وہ اپنے والیوں پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ پچھلے صفحات میں ہم نے حضرت عثمانؓ کا ایک خط درج کیا ہے جس میں انھوں نے اپنے آپ کو سیرت عمرؓ کا پابند بنایا تھا لیکن آپ دیکھیں گے کہ حضرت عمرؓ کی وصیت کہ ایک سال تک عاملوں اور والیوں کو ان کے مناصب پر بحال رکھا جائے کس طرح مقررہ مدت ختم ہوتے ہی حضرت عثمانؓ مجبوراً یا بخوشی دوسری سیاست پر کاربند ہو گئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے قریش کو اہلِ عرب میں امتیازی حیثیت حاصل ہو گئی اور وہ عربوں پر مسلط ہو گئے اور انھوں نے بڑے بڑے اہم صوبے اور بلند مناصب دوسروں سے لے کر فقط اپنے لئے مخصوص کر لیئے۔

مفتوحہ اقوام

حضرت عثمانؓ کی رعیت کا چوتھا عنصر وہ مفتوحہ اقوام تھیں جو مفتوحہ علاقوں میں رہتی تھیں۔ ان کے بارے میں اسلام کا طرزِ عمل واضح ہے اور وہ یہ کہ جو ان کے ذمہ واجب الادا ہو وہ لے لیا جائے۔ اگر وہ

واجبات ادا کرتے رہیں تو انھیں بھی مسلمانوں کے برابر سب حقوق حاصل ہوں گے۔ ان پر بھی وہی فرائض عائد ہوں گے جو مسلمانوں پر ہوتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ اس اصول سے آگاہ تھے۔ لہٰذا انھوں نے ان خطوط میں جو قبل ازیں درج کیے گئے ہیں اپنے آپ کو نیز اپنے عمال کو اسی اصول کا پابند کیا تھا۔

حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں ذمیوں کے ساتھ کوئی قابلِ ذکر جھگڑے کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ اس لئے نہیں کہ ان کے بارے میں مقررہ اصول وضوابط تھے ان پر پوری طرح بلا انحراف عمل درآمد ہو رہا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ یہ مفتوحہ اقوام ابھی اتنی اٹھی نہ تھیں کہ وہ سیاست میں کوئی اہم اور پُرخطر حصہ لے سکتیں ویسے ہمارے لئے اس مکالمہ کو سمجھ لینا جو حضرت عثمانؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کے مابین ہوا دلچسپی سے خالی نہ رہے گا۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت عمروؓ سے کہا: "اے عمرو تمہارے بعد تو ان اونٹنیوں نے خوب دودھ دینا شروع کر دیا ہے" حضرت عمروؓ نے جواب دیا۔ "ہاں مگر ان کے بچے تو مر رہے ہیں" اس گفتگو کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ مصر سے ابن ابی سرح کے عہد میں اتنی کثیر مقدار میں بیت المال کے لئے خراج آیا کہ حضرت عمرو بن العاصؓ کے زمانے میں کبھی اتنی مقدار میں نہ آیا تھا، حضرت عثمانؓ کے فقرے کا یہی مفہوم تھا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کے جواب کا مفہوم یہ ہے کہ خراج میں جو بیشی ابن ابی سرح کے عہد میں واقع ہوئی تھی اس کا سبب معاہدین اور ذمیوں پر ظلم وستم ہے اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں، یا تو یہ کہ حضرت عمرو بن العاصؓ خراج کی پوری رقم بیت المال میں داخل کرنے کی بجائے اس کا کچھ حصہ خود دبا لیتے تھے یا یہ کہ ابن ابی سرح معاہدین اور ذمیوں سے واجبی رقم سے زائد وصول کر رہے تھے ـــــ اور دونوں باتیں بہرحال بُری تھیں۔ پھر یہ کہ رعیت کے ساتھ ان کے طرزِ عمل کا معاملہ انھیں بیان کردہ حدود تک محدود نہ تھا۔ ہم دیکھ چکے کہ حضرت عمرؓ قریش کے حق میں پوری سختی برتتے تھے اور انھیں دیگر اہلِ عرب پر کوئی فوقیت نہ دیتے تھے۔ اسی طرح کسی قبیلہ کے ساتھ بھی دوسرے قبیلہ کے مقابلے میں کوئی امتیازی رعایت نہ کرتے تھے۔ لیکن حضرت عثمانؓ اسی مساوات کو قائم نہ رکھ سکے۔ لہٰذا انہوں نے قصداً یا بغیر قصد کے اہلِ عرب کے مقابلے میں قریش کو امتیازی حیثیت دے دی، پھر یہ کہ خود قریش میں بھی مساوات قائم نہ رکھ سکے اور طوعاً یا کرہاً انھوں نے قریش کے ایک فریق کو دوسرے پر مقدم کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اسی جنبہ داری اور ترجیحی سلوک کا خوف تھا چنانچہ انھوں نے حضرت عثمانؓ کو ہدایت کی تھی کہ اگر وہ خلیفہ ہو تو بنو امیۃ اور بنو ابی معیط کو لوگوں پر مسلط نہ کر دیں۔ اسی طرح حضرت علیؓ کو ہدایت کی تھی کہ اگر وہ امیر المؤمنین بنیں تو بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کو لوگوں کے سر پر سوار نہ کر دیں۔ حضرت عثمانؓ حضرت عمرؓ کی ہدایت پر عمل پیرا نہ ہو سکے۔ اور اس میں کوئی شک کی گنجائش ہی نہیں کہ انھوں نے بنو امیۃ اور بنو ابو معیط کو لوگوں کی گردنوں پر سوار کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ خود حضرت علیؓ جب خلیفہ

ہوئے تو وہ بھی اس ہدایت پر عمل پیرا نہ ہو سکے۔ انھوں نے بھی اپنے چچا حضرت عباسؓ کے تین فرزندوں کو بصرہ، مکہ اور یمن کا والی مقرر کر دیا تھا ـــ حتیٰ کہ مالک الاشتر کہہ اٹھا "اگر صورت حال یہی باقی رہنی تھی تو پھر ہم نے اس بوڑھے (حضرت عثمانؓ) کو کس جرم میں قتل کیا تھا!" ـــ لیکن مجھے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے عمل میں شدید فرق محسوس ہوتا ہے وہ اس طرح کہ والیوں کے معاملے میں خود حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کو بُرا بھلا کہا تھا۔ جس پر حضرت عثمانؓ نے یہ دلیل پیش کی تھی کہ مغیرہ بن شعبہؓ کو حضرت عمرؓ ہی نے والی کوفہ مقرر کیا تھا حالانکہ وہ اس قابل نہ تھے۔ نیز یہ کہ حضرت معاویہؓ کو بھی حضرت عمرؓ ہی نے والی بنایا تھا"۔ اس پر حضرت علیؓ نے یہ جواب دیا کہ حضرت عمرؓ اپنے والیوں کی کڑی نگرانی، شدید بازپرس کرتے اور انھیں ڈانٹتے ڈراتے رہتے تھے لیکن آپ کے عمال آپ کی پروا کئے بغیر من مانی کرتے ہیں، اپنے احکام کو آپ سے منسوب کر دیتے ہیں اور آپ کوئی تدارک یا کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ میری نظر میں حضرت علیؓ کی روش اپنے چچازاد بھائیوں کے ساتھ جو والی بنائے گئے ایسی ہی تھی جیسی کہ حضرت عمرؓ کا طریقہ اپنے والیوں کے ساتھ تھا۔ حضرت علیؓ ان پر بہت سختی کرتے اور کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ وہ جب کسی والی کو کوتاہی یا انحراف کرتے دیکھتے تو خود ہی اسے معزول کر دیتے کسی دوسرے کو اتنا موقع نہ دیتے تھے کہ وہ انھیں اس کی معزولی پر مجبور کرے۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے اپنے کسی ایسے والی کو جو بنو امیہ یا بنو ابی معیط سے متعلق تھا صرف اسی وقت معزول کیا جب کہ متعلقہ صوبے کے لوگوں نے انھیں اس امر پر مجبور کر دیا۔

بہرحال حضرت عثمانؓ کی رعیت وہی تھی جو حضرت عمرؓ کی تھی اور جس میں اگر کوئی معمولی تبدیلی واقع ہوئی تھی تو اس وقت جب حضرت عثمانؓ کو مسند خلافت پر آئے بہت عرصہ ہو گیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اُس رعایا کے انتظام و انضباط تدبیر امور اور ہدایت و رہنمائی کے لئے وہی سیاسی حکمت عملی موزوں و مناسب تھی جسے حضرت عمرؓ اختیار کئے ہوئے تھے۔

لیکن یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں کہ وہ سیرت عمرؓ کی پابندی کر سکے کیونکہ ہر آدمی ان مشکل گھاٹیوں سے نہیں گزرا ہوتا جن سے حضرت عمرؓ گزرے تھے اور نہ ہر آدمی کو ایسی استقامت میسر ہوتی ہے جو راہ حق و عدالت میں نہ کسی رو رعایت کو ملحوظ رکھتی ہے اور نہ کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا کرتی ہو ـــ اس بات کا خود حضرت عثمانؓ کو بھی اعتراف تھا۔ چنانچہ ایک بار جب ان کی نرم غذا لائی گئی تو انھوں نے حاضرین مجلس سے کہا "ہم میں کون ہے جو حضرت عمرؓ کی سی تاب و تواں رکھتا ہو" اسی طرح ایک بار حضرت عثمانؓ نے ان افراد سے جو انھیں بیت المال کے ذریعہ

صلۂ رحمی کرنے پر ملامت کر رہے تھے کہا تھا " ہم میں حضرت عمرؓ کا مقابلہ کون کر سکتا ہے"۔ ایک اور موقع پر انھوں نے منبرِ رسولؐ اللہ سے اپنے نکتہ چینوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا " ابن خطابؓ نے تمہیں پاؤں تلے روندا۔ ہاتھوں سے زدوکوب کیا اور زبان سے رگیدا۔ لہٰذا، تم ان سے ڈرتے رہے۔ اور جو چیز ان سے پسند کرتے تھے مجھ سے پسند نہیں کرتے کیونکہ میں تمہارے خلاف نہ زبان استعمال کرتا ہوں نہ ہاتھ" حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں میں طبیعت مزاج ہی نہیں بلکہ عمر کے لحاظ سے بھی بہت زیادہ فرق تھا بلکہ محض یہ فرق یا اس قسم کے بہت سے فرق ہی فتنۂ و افتراق کا مصدر نہ تھے بلکہ اس فتنۂ و افتراق کے مصادر کچھ اور تھے جن کا تدارک حضرت عثمانؓ کے بس کا روگ نہ تھا۔ ہم ان میں سے بعض مصادر پر اگلی بحث میں روشنی ڈالیں گے۔

باب ہفتم

حضرت عثمانؓ کی خلافت کا دوسرا دور

جونہی حضرت عثمانؓ اپنی خلافت کا پہلا سال گزرنے کے بعد حضرت عمرؓ کی اس وصیت کی پابندی سے آزاد ہوئے جس کے ذریعہ انھوں نے حضرت عثمانؓ کو اپنے مقرر کئے ہوئے عمال ایک سال تک بحال رکھنے کا پابند کر دیا تھا، انھوں نے اپنے تقرری اور برطرفی کے اختیارات استعمال کرنا شروع کر دیئے۔ اپنے ان حقوق کے استعمال میں ان سے کسی قدر جلدی بھی ہوئی لیکن بڑی حد تک ڈھیل اور آہستگی بھی کارفرما رہی۔ کیونکہ انھوں نے ان والیوں کی طرف کوئی توجہ ہی نہ دی جن کے صوبے سیاسی۔ انتظامی یا جنگی اعتبار سے کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے۔ ان صوبہ جات میں انھوں نے حضرت عمرؓ کے عمال ہی کو بحال رہنے دیا۔ ان میں اگر کوئی تھوڑی بہت تبدیلی کی بھی تو صرف اس وقت جب اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور اس ضمن میں زیادہ دلچسپی اور اہتمام نہ کیا، بلکہ ایک حد تک ہموار و نرم طرز عمل اختیار کئے رہے۔

تقرریاں اور برطرفیاں

مفتوحہ علاقوں کی مختلف حیثیتیں

مفتوحہ علاقے بعض حیثیتوں سے ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ ان میں سے بعض کو سیاسی انتظامی اور جنگی حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ وہ علاقے تھے جن کا کچھ حصہ مسلمانوں نے رومیوں سے چھینا تھا اور بقیہ ایرانیوں سے۔ یہ اہم صوبے چار تھے۔ شام، مصر، کوفہ، بصرہ۔ ان علاقوں میں سے ہر ایک کے سامنے سرحدی علاقہ تھا جس کی نگرانی و حفاظت ضروری تھی اور ہر ایک کے سامنے دارالحرب تھا جہاں مسلمانوں کا دھاوا ناگزیر تھا۔ شام کے سامنے سمندر اور مملکت روم تھے۔ مصر کے سامنے سمندر اور شمالی افریقہ تھا۔ کوفہ و بصرہ کے سامنے ایران کا مفتوحہ و غیر مفتوحہ علاقہ تھا۔ یہ چاروں علاقے اسلامی قوت کے لئے مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ یہاں مسلمانوں کی چھاؤنیاں تھیں۔ سامنے ہی سرحدی علاقے تھے جہاں لڑنے والے لشکروں کے قیام اور آمدورفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مسلمانوں کی دولت کا سرچشمہ بھی یہی چاروں صوبے تھے۔

ان علاقوں میں پائیدار و آسودہ تہذیب و تمدن موجود تھا۔ یہاں کی زمینیں زرخیز تھیں جن سے بڑی پیداوار اور خراج کی کثیر رقم حاصل ہوتی تھی۔ انہی علاقوں میں وہ معاہدین بھی آباد تھے جو جزیہ ادا کرتے تھے۔ یہی علاقے ملک کے وہ سرے تھے جہاں سے فتوحات کے لئے پیش قدمی کی جاتی تھی اور جہاں فتح کے بعد واپس آیا جاتا تھا۔ ہر سال جو مالِ غنیمت فاتحین کے ہاتھ لگتا تھا وہ پہلے انہی علاقوں میں پہنچتا تھا اور یہیں سے خمس مدینہ بھیجا جاتا تھا ــــ اگر صحرا نشین عرب اسلام کا خام مال اور عسکری قوت کا منبع تھے تو یہ علاقے اسلام کا خام مال اور قوتِ مالیہ کے سرچشمہ تھے۔ لہٰذا، اگر خلیفہ نے ان علاقوں کی طرف دوسرے غیر اہم اور معمولی علاقوں کے مقابلے میں خصوصی توجہ دی تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہ تھی۔ مکہ، طائف اور یمن، گو اپنی اپنی جگہ خاص قدر و منزلت رکھتے تھے لیکن وہ نہ جنگی سرحد کے بالمقابل تھے نہ وہاں سے کثیر مقدار میں دولت حاصل ہوتی تھی اور نہ وہ قوت و طاقت کے ایسے مراکز تھے جہاں سے اس نوخیز سلطنت کو غلبہ و عزت کا سامان حاصل ہوتا۔

ان علاقوں کی اہمیت اس وقت بھی تھی جبکہ یہ فتح نہ ہوئے تھے اور جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بلادِ عرب کو اسلام کے زیرِ نگیں کرنے کے لئے جد و جہد فرما رہے تھے۔ جب یہ علاقے مسخر ہو گئے، یہاں اللہ کا بول بالا ہو گیا اور اسلام ان کے شر سے مامون ہو گیا تو پھر ان کی حیثیت جدید مفتوحہ علاقوں کے مقابلے میں ثانوی رہ گئی کیونکہ ان نئے علاقوں کی تسخیر و تعمیر پر مسلمانوں نے جس قدر جانیں، مال اور محنتیں صرف کیں وہ ان صرفوں سے کہیں زیادہ تھا جو انھوں نے پہلے فتح کئے ہوئے عربی علاقوں میں کیا تھا۔

اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان مدینہ سے جب بھی نکلنے کا ارادہ کرتے تو اگر سب کے سب نہیں تو اکثریت کے پیشِ نظر مکہ، طائف یا یمن جانے کا قصد نہ ہوتا تھا بلکہ ان کی نگاہ عراق، شام یا مصر کی طرف ہوتی تھی۔ اس ترکِ وطن سے صالحین کی نیت تو ثوابِ آخرت ہوتی تھی تاکہ وہ سرحدوں پہ آباد ہو کر آگے کے علاقے فتح کرنے میں مشغول ہو جائیں لیکن کمانے والوں کا مقصد اس سے متاعِ دنیوی حاصل کرنا ہوتا تھا چنانچہ وہ وہاں جاکر تجارت و زراعت اور دوسرے کمائی کے دھندوں میں لگ جاتے تھے۔ جب حضرت عمرؓ کا انتقال ہوا تو کوفہ پر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور بصرہ پر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی حکومت تھی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے انھیں سال اول تو بحال رکھا۔ جب یہ سال

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی تقرری و معزولی

گزر گیا تو انھوں نے کوفہ سے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو معزول کر کے ان کی جگہ حضرت سعد بن ابی وقاص زہریؓ کو متعین کر دیا۔ کیونکہ حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ میں نے حضرت سعدؓ کو کسی خیانت کی بناء پر معزول نہیں کیا۔ بہر حال حضرت سعدؓ کوفہ میں ایک سال یا اس سے کچھ کم ہی رہے تھے کہ حضرت عثمانؓ انھیں معزول کرنے پر مجبور ہو گئے۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت عثمانؓ حضرت سعدؓ کو معزول کرنے پر اس لئے مجبور ہو گئے تھے کہ حضرت سعدؓ اور بیت المال کے خزانچی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مابین اختلاف ہو گیا تھا جس نے حضرت عثمانؓ کو دونوں سے ناراض کر دیا تھا۔ انہوں نے دونوں کے خلاف کارروائی کرنا چاہی تھی لیکن پھر صرف حضرت سعدؓ کو معزول کرنے پر اکتفا کر لیا۔

اس اختلاف کی بنیاد واقعی عجیب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سعدؓ نے بیت المال سے کچھ قرض لیا اور تمسک دے دیا۔ چنانچہ جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے رقم طلب کی تو حضرت سعدؓ نے رقم مہیا نہ ہونے کی وجہ سے مہلت مانگی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے مہلت دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر دونوں بزرگوں نے اپنی اپنی جگہ کوفہ کے بعض اشخاص کو واسطہ بنایا۔ حضرت ابن مسعودؓ اپنے دوستوں سے یہ کام لینا چاہتے تھے کہ وہ حضرت سعدؓ کو ادائے قرض پر مجبور کریں اور حضرت سعدؓ یہ چاہتے تھے کہ ان کے دوست حضرت ابن مسعودؓ کو ادائگی قرض میں مہلت دینے پر رضامند کر دیں۔ ایک دفعہ جب ہر دو بزرگ اپنے ساتھیوں کے ساتھ یکجا ہوئے تو بات بڑھی اور دونوں میں جھڑپ ہو گئی حتیٰ کہ حضرت سعدؓ بقول بعض راویوں کے حضرت ابن مسعودؓ کو بد دعا دینے لگے تھے۔ حضرت ابن مسعودؓ گھبرا گئے اور بعجلت تمام وہاں سے اٹھ بھاگے۔ کیونکہ انھیں حضور رسالت مآب کی حضرت سعدؓ کے حق میں یہ دعا یاد تھی کہ اے خدا سعدؓ کی ہر دعا منظور فرماتا، کہتے ہیں کہ حضرت سعدؓ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا تھا کہ ابھی اتنا ہی کہا تھا "اے رب ارض وسما" کہ حضرت ابن مسعودؓ پکارے "ہوش کرو۔ کوئی کلمہ خیر زبان سے نکالنا۔" اتنا کہا اور جلدی سے نکل گئے۔ جب معاملہ حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچا تو انھیں دونوں پر غصہ آیا۔ دونوں کے خلاف کارروائی کرنا چاہی، مگر پھر باز رہے اور حضرت سعدؓ کو معزول کر دیا اور جو رقم ان کے ذمے نکلتی تھی وہ وصول کر لی۔ حضرت ابن مسعودؓ کو بیت المال کے عہدہ پر بحال رکھا اور کوفہ میں نیا حاکم بھیج دیا۔

اس واقعہ پر تنقیدی نظر

اس واقعہ پر تمام راوی متفق ہیں لیکن میں پوری احتیاط اور تنقید سے کام لینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس واقعہ میں بہت سی باتیں شدید احتیاط کی متقاضی ہیں۔ پہلے گزر چکا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے جانشین خلیفہ کے لئے وصیت کی تھی کہ وہ حضرت سعدؓ کو والی مقرر کرے کیونکہ انھوں (حضرت عمرؓ) نے حضرت سعدؓ کو بہ سبب خیانت معزول نہ کیا تھا۔ لیکن مذکورہ بالا واقعہ میں جو بات بادی النظر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت سعدؓ نے بیت المال سے قرض لیا اور پھر ادائگی قرض میں تاخیر کی یا ٹال مٹول سے کام لیا، غور فرمائیے، بھلا ایک ایسا آدمی جسے حضرت عمرؓ شوریٰ کے لئے منتخب کریں اور خلافت کا امیدوار قرار دیں اور نیز اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو یہ ہدایت کر جائیں کہ اگر حضرت سعدؓ خلیفہ نہ بن سکیں تو ان سے امورِ حکومت میں مدد لی جائے کیا اس قسم کے کردار کا مالک ہو سکتا ہے؟ حضرت عمرؓ کے متعلق یہ گمان بھی نہیں گزر سکتا کہ انھوں نے کسی بات کا حکم دینے یا کسی امر سے منع کرنے میں کسی کا حق مار کر

ایک کو دوسرے پر ترجیح دی ہوگی ان کے امرونہی سے ہمیشہ عامۃ المسلمین کی بہتری مقصود ہوتی تھی ــ لہٰذا، حضرت عمرؓ نے اپنے جانشین خلیفہ کو حضرت سعدؓ کی تولیت کی ہدایت کرکے نہ تو حضرت سعدؓ کی خوشنودی چاہی تھی نہ ان کی طرفداری کی تھی نہ ہی دوسرے صحابہ پر انھیں کوئی فوقیت و ترجیح دی تھی، یقیناً اس وصیت سے انھوں نے خلیفہ اور عامۃ المسلمین کی بہبودی چاہی تھی اور حکم دیا تھا کہ حضرت سعدؓ کی قابلیت بالخصوص جنگی تجربوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ایران کے حالات مسلمانوں کے لئے پوری طرح قابلِ اطمینان نہ تھے۔ ایران کی سلطنت تو ختم ہوچکی تھی تاہم اس نے پوری طرح دم نہیں توڑا تھا، یعنی کسریٰ یزدجرد کو شکست تو ہوچکی تھی مگر وہ نہ قتل ہوا تھا نہ قید نہ جلاوطن بلکہ وہ ملک ہی میں موجود تھا اور اپنی شکست خوردہ فوج کے ہمراہ مختلف علاقوں، شہروں اور پرگنوں میں گھومتا پھر رہا تھا ــ ایران میں بے شمار شہر تھے ان میں کچھ ایسے بھی تھے جہاں ابھی تک مسلمان پہنچے ہی نہ تھے۔ بعض ایسے شہر تھے جنھوں نے مسلمانوں سے منافقانہ صلح کر رکھی تھی وہ موقع کے منتظر رہتے تھے۔ اور جونہی موقع ملتا عہد توڑ دینے پر آمادہ تھے۔ بلادِ فارس کی فتح شروع ہوئی اور بڑی تیزی سے بڑھتی چلی گئی بعد میں اس کی یہ رفتار باقی نہ رہی۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ ہی جنگِ قادسیہ کے ہیرو اور کسراؤں کی سلطنت کو برباد کرنے والے تھے۔ لہٰذا، اگر حضرت عمرؓ نے یہ سوچا کہ یہ مہم جس کا آغاز حضرت سعدؓ کے ہاتھوں ہوا اس کا انجام بھی انہی کے ہاتھوں سے ہو تو مقامِ حیرت نہیں۔ گمانِ اغلب یہ ہے کہ اگر حضرت عمرؓ زندہ ہوتے تو وہ انھیں دوبارہ کوفہ کا والی مقرر کرکے انھیں دشمن سے لڑائی جاری رکھنے کا حکم دے دیتے تا آنکہ خدا ان کے ہاتھوں تکمیل فتوحات کرا دیتا۔ یہی نہیں حضرت سعد رضی اللہ عنہ پہلے پہل اسلام قبول کرنے والوں میں سے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ خدا کی قسم میں اسلام لانے والوں میں تیسرا ہوں۔ مطلب یہ کہ ابوبکرؓ کے بعد ان کا شمار ہوتا تھا پہلے رسولِ خدا دوسرے حضرت ابوبکرؓ اور تیسرے حضرت سعدؓ یا یہ کہ وہ حضرت ابوبکرؓ اور زید بن حارثؓ کے بعد تیسرے شخص تھے جو مسلمان ہوئے۔ لہٰذا، دعوتِ رسول پر لبیک کہنے والے اوّلین مسلمانوں میں شمار ہوئے ــــ علاوہ ازیں سب راوی اور سب محدثین متفق ہیں کہ راہِ خدا میں سب سے پہلے جس نے تیر چلایا وہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ ہی ہیں ــــ یہ اس موقع کی بات ہے جب حضرت سعدؓ عبیدہ بن الحارث بن عبدالمطلب پر چھاپہ مارنے کے لئے "بطن رابغ" کی طرف گئے تھے۔

حضرت سعدؓ وہی بزرگ ہیں جن پر جنگِ اُحد میں حضورؐ نے اپنے ماں باپ کو قربان کیا تھا اور اس موقع پر جبکہ وہ ثابت قدمی سے حضورؐ کے ساتھ رہنے والوں کے ساتھ ڈٹے ہوئے تھے فرمایا تھا کہ "سعد! تیر مارو میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں"۔ حضرت سعدؓ کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں باپ دونوں کو فدا کرنے کے الفاظ کسی دوسرے شخص کے لئے استعمال نہیں فرمائے۔ الغرض یہ کہ جسے یہ رتبہ بلند ملا ہو کہ وہ تیسرے نمبر پر اسلام لایا ہو اور راہِ خدا میں سب سے پہلا تیر

چلا آیا ہو اور جس پہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے ماں باپ فدا کئے ہوں اور خوش ہو کر جسے عشرۂ مبشرہ میں شامل فرمایا ہو، جس نے ایرانی حکومت کا قلع قمع کیا ہو، جنگِ قادسیہ کو جیتا ہو اور جس کے خلیفہ نہ بن سکنے کی صورت میں والی بنانے کی ہدایت کی گئی ہو اور یہ بلند فضائل حاصل ہوں وہ بیت المال سے قرض لے کر کیسے ٹال مٹول کر سکتا ہے قطع نظر اس سے کہ قرض کی رقم زیادہ تھی یا کم نہ یہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابنِ مسعودؓ اُن پہ اس قسم کا شبہ کریں اور نہ یہ کہ حضرت عثمانؓ ان پہ غصّہ کریں، اور ان کے خلاف کارروائی کرنا چاہیں اور پھر ان سے واجب الادا رقم لے کر راضی ہو جائیں۔ گمانِ اغلب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ کے بارے میں صرف یہ ہدایت نہیں کی تھی کہ انھیں کسی صوبہ کا حاکم مقرر کیا جائے بلکہ مقول نے خاص طور پر انھیں کوفہ کا والی بنانے کی وصیت کی ہوگی کیونکہ یہی وہ شہر ہے جہاں انہیں رہنا چاہئے تھا، تاکہ وہ یہاں سے آگے کے علاقوں میں فتوحات کا سلسلہ مکمل کرنے کے لئے بڑھیں۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ حضرت ابنِ مسعودؓ یہ سب باتیں جانتے ہوئے کہ حضرت سعدؓ سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں ہیں اور یہ کہ رسولِ خدا اور حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کے یہاں ان کی کیا قدر و منزلت تھی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ان کے متعلق کیا رائے تھی ان سے بدظن ہو گئے۔ اور پھر یہ کہ حضرت ابن مسعودؓ ہی سب سے زیادہ رسولِ خدا کے قریب رہے ہے آپؐ کی سنت کے سب سے بڑے راوی وہی ہیں۔ براہِ راست رسولِ خدا سے انھیں نے قرآن کا سب سے زیادہ حصّہ اخذ کیا اور آپؐ اپنے صحابہ کے حق میں جو رائے رکھتے تھے اس سے جس قدر وہ آگاہ تھے اور کوئی نہ تھا اس سے بھی زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ ان کے بارے میں شک کریں اور قرض کی ادائیگی کے لئے شدید تقاضے کریں، حتیٰ کہ جب حضرت سعدؓ بددعا کا ارادہ کریں تو وہ گھبرا جائیں اور انھیں مناتے ہوئے وہ بھاگ جائیں۔ جب فتنۂ و فساد کی آگ بھڑکی تو حضرت سعدؓ غیر جانبدار رہے انھوں نے برسرِپیکار لوگوں میں سے کسی کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا "میں فقط اسی وقت شاملِ جنگ ہوں گا جب مجھے کوئی ایسی تلوار دی جائے جو بینا، عاقل و ناطق ہو اور مجھے بتائے کہ یہ کافر ہے اور یہ مسلمان —— ان کا یہ عجیب و غریب مؤقف ہی اس عجیب و غریب قصہ کی اختراع کا باعث ہوا[1] کیونکہ اگر حضرت سعدؓ حضرت علیؓ کے حامیوں میں شامل ہو جاتے تو شیعہ ان کی مدافعت کرتے —— اگر انصارِ عثمانؓ میں شامل ہو جاتے تو ہوا خواہانِ حضرت عثمانؓ ان کے لئے ڈھال بن جاتے۔ مگر حضرت سعدؓ نے باہم دست و گریبان ہونے والوں سے کنارہ کشی اختیار کئے رکھی۔ لہٰذا، ان جھگڑنے والوں نے بھی حضرت سعدؓ سے ویسا ہی غیر جانبدارانہ سلوک کیا۔

---

[1] اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ ہماری تاریخ کس قدر قابلِ اعتماد ہے ؟

میرا خیال تو یہ ہے کہ حضرت سعدؓ کی معزولی کا اصل سبب یہ ہے کہ بنو اُمیّہ اور آلِ ابی معیط نے ولایت حاصل کرنے کے لئے جلد بازی تقاضے اور مختلف حیلے اختیار کرنا شروع کر دیئے۔ انھوں نے حضرت عثمانؓ پر دباؤ ڈال رکھا تھا کہ وہ ان کے لئے

حضرت سعدؓ کی معزولی کا اصل سبب

حکومت تک پہنچنے کی راہ صاف کریں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے حضرت سعدؓ کو کوفہ سے معزول کیا تو ان کی جگہ صحابۂ کبار یا مہاجرین و انصار میں سے کسی کو متعین نہ کیا، نہ حضرت طلحہؓ کو بھیجا نہ حضرت زبیرؓ کو نہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کو نہ حضرت محمد بن مسلمہؓ کو اور نہ حضرت ابوطلحہؓ کو۔ انھوں نے بھیجا تو ولید بن عقبہ بن ابی معیط کو۔ حالانکہ مسلمانوں کو ولید پر کوئی اعتماد نہ تھا ــــ کیونکہ اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکا دیا تھا۔ ان کے بارے میں دروغ گوئی سے کام لیا تھا۔ وہ اسلام قبول کر کے کافر ہو گیا تھا۔ قرآن میں اس کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئی تھیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَاۗءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰي مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ (۴۹/۶)۔

اے ایمان والو! جب تمہارے پاس فاسق کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ لاعلمی کی وجہ سے تم ایک قوم کو نقصان پہنچا دو پھر تم اپنے کئے پر پشیمان ہو جاؤ۔

یہ اس وقت ہوا تھا جب رسولِ خداؐ نے اسے بنی مصطلق کے پاس وصولیٔ صدقہ کے لئے بھیجا تھا، مگر وہ لوٹ آیا اور آپؐ کو اطلاع دی کہ بنو مصطلق ادائگیٔ صدقہ سے انکار کر رہے ہیں ــــ یہ سن کر آپؐ نے ان کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔ مگر ولید کی جعلسازی ظاہر ہو گئی۔ اور آپؐ کو خدا نے حقیقتِ واقعہ سے آگاہ کر دیا۔ ولید نے ہر طرف سے مایوس ہو کر دوبارہ اسلام قبول کر لیا اور جہاں تک بس چلا اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرتا رہا ــــ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اُسے بنو تغلب کا جو الجزیرہ میں آباد تھے محصّلِ خراج مقرر کیا تھا، لیکن کہاں حضرت عمرؓ یا عمّالِ عمرؓ میں سے کسی کی طرف سے اُسے محصّل صدقہ بنا کر جزیرے کے ایک عیسائی بدوی قبیلہ میں بھیجنا اور کہاں حضرت عثمانؓ کا اسے ایسے علاقہ کا حاکم بنا دینا جو مسلمانوں کے سب سے اہم صوبوں میں شمار ہوتا تھا اور جس کی سرحدیں دور دور تک چلی گئی تھیں ــــ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اسے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا جانشین بنایا گیا تھا، یہ تو بہت ہی بڑا فرق ہے۔

لہٰذا، جن لوگوں نے کوفہ پر حضرت سعدؓ کی جگہ ولید کی تولیت کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا وہ حق بجانب تھے۔ فی الحقیقت ولید کی یہ تقرری بڑا اہم مسئلہ ہے۔

دوسری چیز جو حضرت عثمانؓ کے حضرت سعدؓ کو معزول کرنے اور ولید کو والی بنانے کی "کہانی" کو مشکوک بناتی ہے

یہ ہے کہ خود حضرت عثمانؓ نے مدینہ میں بیت المال سے متعلق ایسا ہی رویہ اختیار کر رکھا تھا جو حضرت سعدؓ کی جانب منسوب کردہ روش سے کہیں بڑھ کر ہولناک تھا ـــــ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے کسی عزیز کو بیت المال سے بڑی رقم دلائی ۔ بیت المال کے خزانچی نے اس رقم کو بڑا خیال کرتے ہوئے دینے سے انکار کر دیا ۔ حضرت عثمانؓ نے اصرار کیا اور خزانچی انکار کرتا چلا گیا ـــــ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اسے ملامت کی ـــ قصہ طویل ہے جسے ہم اس کے موقع پہ بیان کریں گے ۔ اور کہا "تمہیں اس سے کیا غرض ؟ تم تو بس ہمارے خزانچی ہو" اس پہ خزانچی نے جواب دیا " میں خود کو آپ کا خزانچی نہیں سمجھتا تھا ۔ آپ کا خازن آپ کا کوئی غلام ہوگا ۔ میں تو خود کو مسلمانوں کے مال کا خزانچی خیال کرتا ہوں " اس کے بعد وہ خزانچی بیت المال کی چابیاں منبرِ رسولؐ کے ساتھ لٹکا کر خانہ نشین ہوگیا ۔ غرضیکہ بیت المال کے ساتھ جب خود حضرت عثمانؓ کا یہ رویّہ ہو تو پھر حضرت سعدؓ پر ان کی گرفت واقعی قابلِ حیرت ہے ۔ حالانکہ بیان کردہ کہانی کے مطابق حضرت سعدؓ نے بیت المال سے کچھ رقم قرض لی تھی اور اس قرض کی ادائی کے لئے مہلت مانگی تھی ـــــ معلوم ہوا کہ جس طرح حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ کو کسی خیانت کی بناء پر معزول نہیں کیا تھا اسی طرح حضرت عثمانؓ نے بھی حضرت سعدؓ کو کسی چھوٹی یا بڑی خیانت کی بناء پر معزول نہیں کیا تھا ـــــ بات یہ ہے کہ پہلے انھوں نے حضرت عمرؓ کی وصیت کو عملی جامہ پہنا دیا اور پھر آلِ ابی معیط کے ایک شخص کو جگہ دینے کے لئے حضرت سعدؓ کو معزول کر دیا ۔

کوفہ میں ولید اور اس کی سیاست

ضروری ہے کہ ہم یہ اعتراف کریں کہ ولید نے کوفہ کی حکومت کے دوران جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ بڑی حد تک قابلیت، بالغ نظری اور حسنِ کارکردگی کا آئینہ دار تھا ۔ اس نے سرحدوں کی مدافعت اور معرکہ ہائے فتوحات کی سرگرمیوں میں کوئی کوتاہی نہ کی ۔ بلکہ اس ضمن میں اس نے ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جنھیں شہرت عام حاصل ہوگئی اور جن کا تذکرہ نہ صرف ولید کی زندگی میں بلکہ اس کی موت کے بعد بھی لوگوں کی زبانوں پہ جاری رہا ۔ اس نے اہلِ کوفہ پہ بڑی احتیاط، قوتِ ارادی اور جرأت کے ساتھ فرمانروائی کی ۔ امن قائم کیا ۔ مفسدوں، فتنہ پردازوں اور ان افراد کو جو نہ نظم وضبط کی پروا کرتے تھے اور نہ دین کا احترام ملحوظ رکھتے تھے شدید سزائیں دیں ۔ ایک بار نوجوانوں کے ایک ٹولے نے ایک کوفی نوجوان کو قتل کر دیا ۔ ولید نے انھیں گرفتار کر لیا اور شرعی سزا دیتے ہوئے انھیں قصرِ حکومت کے دروازے کے سامنے قتل کر دیا ۔ بعض راویوں کا بیان ہے کہ اس عمل سے مقتولوں کے والدین سیخ پا ہو گئے ـــ چنانچہ انہوں نے ولید کی لغزشوں کی ٹوہ لگانا شروع کی، اور اس کے خلاف الزام تراشیاں کر کے لوگوں کو اس سے بدظن کرنا شروع کر دیا ۔ یہاں تک کہ ایک روز ان میں سے ایک شخص رات کو ولید کے پاس آیا اور دیر تک قصے کہانیاں سناتا رہا ـــــ وہ ابھی بیٹھا تھا کہ ولید سو گیا ـــــ اس نے اٹھ کر ولید کی انگلی سے

• سے انگوٹھی اتار لی ـــــ اور اپنے ایک دوست کو ساتھ لے کر حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچا۔ وہاں دونوں نے ولید کے خلاف یہ گواہی دی کہ وہ شراب پیتا ہے۔

اس قصے کا فرضی ہونا اتنا واضح ہے کہ کسی صفائی اور وضاحت کی ضرورت نہیں۔ کوئی حاکم بھی اپنی محفل میں سوتا نہیں ہے پھر نیند بھی اس غفلت کی کہ انگلی سے انگوٹھی اتاری جاتی ہے اور اسے احساس تک نہیں ہوتا ہی نہیں بلکہ اس کے خدام، دربان، سپاہی سب ہی بے حس ہو جاتے ہیں اور کوئی بھی اس حرکت کو ہوتا دیکھ کر مزاحمت نہیں کرتا!! جب اس انگوٹھی کے بارے میں اس قدر لاابالی پن اور غیر ذمہ داری سے کام لیا گیا ہو جو احکامات وفرامین نافذ کرنے نیز خلیفہ اور سرحدی کمانڈروں سے مراسلات کرنے میں مہر کا کام دیتی تھی تو اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ولید احتیاط، قوت ارادی اور ذہانت سے بالکل ہی محروم تھا۔ دشمنانِ ولید کی بیان کردہ باتوں میں سب سے زیادہ اشتباہ انگیز بات یہ ہے کہ وہ اپنے شاعر دوست ابوزبید کے ہمراہ شراب پیا کرتا تھا۔ ابوزبید سے اس کا تعلق اس وقت سے تھا جب وہ بنو تغلب کا محصلِ خراج مقرر ہوا تھا۔ اس نے ابوزبید کو اس کے ماموؤں سے اس کا حق دلوایا تھا اور بعد ازاں اسے اپنا مقرب بنالیا تھا۔ ابوزبید کا باپ قبیلۂ طے سے تھا اور ماں بنو تغلب سے اور وہ عیسائی تھا۔ جب ولید والیٔ کوفہ ہوا تو ابوزبید اس کے پاس آتا جاتا رہا۔ وہ ولید ہی کے پاس قیام کرتا اور اس سے انعامات وصول کرتا رہتا تھا، یہ سلسلہ ولید کی طرف سے برابر جاری رہا یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو گیا اور دونوں ایک دوسرے سے قریب ہو گئے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ابوزبید کا اسلام بھی اتنا ہی ڈھیلا تھا جتنا کہ ولید کا۔ اس نظریہ کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ولید کو سزائے شرعی دی تھی، حالانکہ جب جرم کے ثابت ہونے میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش ہو سزا نہیں دی جاتی۔ اگر حضرت عثمانؓ کو ان دو نوجوانوں کی شہادت میں کسی قسم کا بھی کمزور یا قوی شبہ ہوتا تو وہ سزا دینے سے احتراز کرتے۔ کیونکہ شبہ کی وجہ سے سزا موقوف کر دینے میں حضرت عثمانؓ پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا تھا، الزام اور خرابی کی بات تو یہ ہے کہ کسی قوی یا معمولی سے معمولی شبہ کی بناء پر کسی کو سزا دے دی جائے۔

اس امر پر لوگوں کا اختلاف ہے کہ ولید کو سزا دینے میں حضرت عثمانؓ کے حکم کی تعمیل کس کے ہاتھوں انجام پائی ـــــ ایک گروہ کا خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ کے حکم سے حضرت علیؓ نے سزا دی تھی۔ کیونکہ بہت سے دوسرے لوگ اس پر تیار نہ ہوئے ـــــ اگر یہ روایت صحیح ہے ـــــ گو ہمیں اس سے اتفاق نہیں۔ تو حضرت علیؓ حدود دین سے نہایت درجہ واقف، سنت کے پابند، خدا کی رضا اور اس کے حکم کو نافذ کرنے میں سب سے آگے رہنے والے تھے کبھی ایسا نہیں کر سکتے تھے کہ شک وشبہ کی موجودگی میں حد جاری کر دیتے ـــــ اکثر راویوں کا خیال ہے کہ ولید کو سزا دینے والے سعید بن العاص ہوئی

تھے، یہ سعید حضرت عثمانؓ اور ولید دونوں کے قریبی رشتہ دار تھے، نیز خلیفہ اور اس کے قریبی یا دور کے رشتہ داروں کے بارے میں لحاظ اور تعصب برتنے والے تھے، الہٰذا، اگر اس جرم کی صحت میں انھیں کوئی شبہ نظر آتا تو وہ مزید حضرت عثمانؓ سے اس فیصلہ پر تبادلۂ خیال کرتے اور وہ اتنی قوت رکھتے تھے کہ ناکام ہونے کی صورت میں وہ ولید کو سزا دینے سے معذوری کا اظہار کر دیتے، لیکن ایسا کچھ نہ ہوا اور سعید نے ولید کو شرعی سزا دی اور اس بات نے بعد میں ان دونوں کی نسلوں میں بھی دشمنی پیدا کر دی ۔

مخالفین ولید کا بیان ہے ـــــ جسے ہم محض مبالغہ آرائی خیال کرتے ہیں ـــــ کہ ولید نے ایک دن صبح نشہ میں بدمست ہوکر فجر کی نماز تین یا چار رکعتیں پڑھا دیں۔ اور پھر نمازیوں سے مخاطب ہوکر کہا "اگر آپ لوگ چاہیں تو کچھ رکعتیں اور پڑھا دوں" اس پر بعض افراد نے اسے گالیاں دیں، بعض نے کنکریاں ماریں اور لوگوں نے حضرت عثمانؓ سے التماس کی کہ اُسے ہٹا لیا جائے چنانچہ حضرت عثمانؓ نے ان کی استدعا قبول کر لی ـــــ ولید کے متعلق یہ قصہ اس قدر مشہور ہو گیا کہ اس کو لطیفوں میں شامل کر لیا گیا، شعراء نے اسے موضوع بنا لیا، کہتے ہیں کہ مشہور شاعر حطیئہ نے اس ضمن میں یہ اشعار کہے ہیں:-

شَهِدَ الْحُطَيْئَةُ يَوْمَ يَلْقَى رَبَّهُ ۔ اَنَّ الْوَلِيْدَ اَحَقُّ بِالْعُذْرِ
نَادَى وَقَدْ نَفِدَتْ صَلٰوتُهُمْ ۔ اَاَزِيْدُكُمْ ثَمِلاً وَلَا يَدْرِيْ
لِيَزِيْدَهُمْ خَيْرًا وَلَوْ قَبِلُوْا ۔ مِنْهُ لَزَادَهُمْ عَلٰى عَشْرِ
فَاَبَوْا اَبَا وَهْبٍ وَلَوْ فَعَلُوْا ۔ لَقَرَنْتَ بَيْنَ الشَّفْعِ وَالْوَتْرِ
حَبَسُوْا عِنَانَكَ اِذْ جَرَيْتَ وَلَوْ ۔ خَلُّوْا عِنَانَكَ لَمْ تَزَلْ تَجْرِيْ

(ترجمہ) حطیئہ جب اپنے پروردگار سے ملے گا تو اس امر کی شہادت دے گا کہ ولید معافی کا بہت زیادہ مستحق ہے، نماز ختم ہو جانے کے بعد اس نے نشہ سے بدمستی کے عالم میں لوگوں سے پکار کر کہا "کیا کچھ اور زیادہ رکعتیں پڑھا دوں" حالانکہ اسے کچھ معلوم ہی نہ تھا، اس کا ارادہ تو لوگوں کو خیر و بھلائی زیادہ دینے کا تھا، اگر لوگ منظور کر لیتے تو وہ انھیں دس رکعتوں سے زیادہ پڑھا دیتا، لیکن لوگوں نے ابو وہب کی پیشکش کو رد کر دیا، اگر یہ لوگ قبول کر لیتے تو پھر (ولید) طاق اور وتر رکعات ملاتا چلا جاتا، جب تو نے دوڑنا شروع کیا تو لوگوں نے تیری باگ کھینچ لی، اگر یہ تیری لگام چھوڑ دیتے تو تو دوڑتا ہی رہتا ۔

میرا خیال تو یہ ہے کہ یہ تمام کا تمام قصہ گھڑا ہوا اور بے اصل ہے ۔ اگر ولید نے نماز میں اضافہ کیا ہوتا تو مسلمان ان کو ذہن میں اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور معلمین و صالحین بھی شامل تھے ہرگز اس کی اقتدار نہ کرتے ۔ ایسی صورت میں وہ

کبھی اس سزا پر رضامند نہ ہوتے جو شراب نوشی پر اسے حضرت عثمانؓ نے دی تھی اس لئے کہ نماز میں اضافہ کرنا یا نماز کا تمسخر اڑانا اللہ اور مسلمانوں کے نزدیک شراب نوشی سے بھی زیادہ ہولناک جرم ہے۔

پھر مذکورہ بالا اشعار حطیئہ کے نہیں ہیں، حطیئہ نے جو شعر کہے ہیں وہ تو ولید کی مدح اور اس کی رضاجوئی کا اظہار کرتے ہیں اور وہ اشعار یہ ہیں :-

شَہِدَ الحُطَیئَۃُ حِینَ یَلقیٰ رَبَّہٗ — اَنَّ الوَلِیدَ اَحَقُّ بِالعُذرِ

خَلَعُوا عِنَانَکَ اِذ جَرَیتَ وَلَو — تَرَکُوا عِنَانَکَ لَم تَزَل تَجرِیْ

وَرَاَوا شَمَائِلَ مَاجِدٍ مُتَبَرِّعٍ — یُعطِیْ عَلَی المَیسُورِ وَالعُسرِ

فَنُزِعتَ مَکذُوبًا عَلَیکَ وَلَم — تُرَدَّد اِلیٰ عَوَزٍ وَلَا فَقرٍ

(ترجمہ) حطیئہ جب اپنے پروردگار سے ملے گا تو اس امر کی شہادت دے گا کہ ولید معافی کا بہت زیادہ مستحق ہے، ابھی تو نے دوڑنا ہی شروع کیا تھا کہ لوگوں نے تجھے برطرف کر کے تیری لگام اتار دی اگر وہ تیری لگام چھوڑ دیتے تو تو لگاتار دوڑتا ہی رہتا انھوں نے معزز و فیاض شخص کے خصائل تجھ میں دیکھے تھے جو خوش حالی اور تنگی میں دینے کا عادی ہے۔ تجھ پر تہمت تراش کر تجھے الگ کیا گیا ہے لیکن اس طرح تو کسی فقر و فاقہ میں نہیں ڈالا گیا۔

پہلے جو اشعار حطیئہ سے منسوب کیے گئے ہیں وہ دراصل ان مدحیہ اشعار کے مقابلے میں کسی شیعہ نے بنا لئے ہیں۔ اس میں بھی کسی شک کی گنجائش نہیں کہ مندرجہ ذیل اشعار بھی جو حطیئہ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں قطعاً اس کے نہیں ہیں۔

تَکَلَّمَ فِی الصَّلٰوۃِ وَزَادَ فِیہَا — عَلَانِیَۃً وَجَاہَرَ فِی النِّفَاقِ

وَمَجَّ الخَمرَ عَن سَنَنِ المُصَلِّیْ — وَنَادیٰ وَالجَمِیعُ اِلَی افتِرَاقِ

اَزِیدُکُم عَلیٰ اَن تَحمِدُونِیْ — فَمَا لَکُم وَمَا لِیْ مِن خَلَاقِ

(ترجمہ) اس نے نماز میں بات کی اور اس میں علانیہ اضافہ کیا اور کھلم کھلا نفاق کا مرتکب ہوا نماز کے راستے میں شراب کی کلیاں کیں اور جب نمازی واپس جانے کے لئے منتشر ہونے لگے تو پکار کر کہا کہ اگر تم میری تعریف کرو تو میں کچھ رکعات زیادہ پڑھا دوں اس میں میرے یا تمہارے لئے کوئی اچھا اجر تو ہے ہی نہیں۔

مذکورۃ الصدر اشعار بھی صرف ولید کے دشمنوں نے گھڑ لئے ہیں، حطیئہ نے تو ولید کی گورنری کے زمانہ میں اس کی مدح کرتے ہوئے نہایت عمدہ اشعار کہے ہیں اور یہ اس زمانہ میں جب کہ ولید کے خلاف کسی سازش اور سرزنش کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔ اپنے اس قصیدے میں وہ ولید کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے :-

أبَى لابنِ أروَى خَلَّتَانِ اصطَفَاهُمَا ... قِتَالٌ إذَا يَلقَى العَدُوَّ وَنَائِلُه

فَتًى يَملأُ الشِّيزَى وَيُروِي بِكَفِّهِ ... سِنَانُ الرُّدَينِيِّ الأَصَمِّ وَعَامِلُه

یہ ایسا نوجوان ہے جس کی دو پسندیدہ عادتیں ہیں، ایک دشمن کی صفوں کو چیرنا دوسری بخششیں عطا کرنا، پیالے بھر بھر کر دیتا ہے اور عمدہ نیزہ کا پھل اور بالائی حصّہ اس کے ہاتھ میں پہنچ کر خون سے سیراب ہو جاتا ہے۔

يَؤُمُّ العَدُوَّ حَيثُ كَانَ بِجَحفَلٍ ... يُصِمُّ العَدُوَّ جَرسُهُ وَصَوَاهِلُه

تَرَى عَافِيَاتِ الطَّيرِ قَد وَثِقَت لَهَا ... بِشِبعٍ مِنَ السَّخلِ العِتَاقِ مَنَازِلُه

(ترجمہ) دشمن کی طرف وہ ایک لشکرِ جرار لے کر پیش قدمی کرتا ہے جس کی گھنٹیوں اور گھوڑوں کی آوازیں دشمن کو بہرا کر دیتی ہیں مُردہ خور پرند اس لشکر کو دیکھ کر اپنے پیٹ بھرنے کی طرف سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور ایسے نرم گوشت کی اُمید رکھتے ہیں جو آسودگی میں پلا ہو۔

اسی قصیدہ میں آگے چل کر وہ کہتا ہے :-

وَإنِّي لأَرجُوهُ وَإن كَانَ نَائِيًا ... رَجَاءَ الرَّبِيعِ أنبَتَ البَقلَ وَابِلُه

لِزُغبٍ كَأَولَادِ القَطَا رَاثَ خَلفُهَا

عَلَى عَاجِزَاتِ النَّهضِ حُمرٌ حَوَاصِلُه

(ترجمہ) میں اس ممدوح سے اگرچہ وہ دور ہے ایسی ہی اُمید رکھتا ہوں جیسے کہ موسم بہار میں بارش سبزی اگا دیتی ہے میں اپنے نرم و نازک بچوں کی پرورش کے لئے ممدوح کی مدد کا طالب ہوں جو چھوٹے ہیں اور گھر سے نکلنے کے قابل نہیں۔

اسی طرح یہ واقعہ بھی فرضی معلوم ہوتا ہے کہ ولید کے پاس ایک جادوگر آیا تھا ولید نے اس کے بارے میں ابنِ مسعود سے فتویٰ لیا۔ جب ابنِ مسعود کو یقین ہو گیا کہ وہ شخص واقعی جادو پر ایمان رکھتا ہے تو انھوں نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ یہ سن کر اہلِ کوفہ میں سے ایک آدمی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور بغیر ولید کے حکم کے اس جادوگر کو قتل کر دیا۔ بعد میں جب اہلِ کوفہ ولید کے خلاف شکایت لے کر حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت عثمانؓ نے یہ کہتے ہوئے کہ تم محض گمان کی بناء پر لوگوں کو قتل کر ڈالتے ہو انھیں ناکام واپس کر دیا۔

ممکن ہے کہ ولید کے پاس کوئی جادوگر لایا گیا ہو۔ اور ولید نے اس کا تماشا دیکھا ہو جس پر کوفہ کے متشددین بگڑ کر اس بے چارے جادوگر پر پل پڑے ہوں اور اسے قتل کر دیا ہو ـــــ جس پر ولید کو بھی غصّہ آیا ہو اور حضرت عثمانؓ کو بھی۔ کیونکہ لوگوں کو یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ وہ حکومت کے فیصلہ کے بغیر یا محض ظن و گمان کی بناء پر کسی کا خون بہانے لگ جائیں۔

مختصر یہ ہے کہ ولید ایک عام قریشی فرد تھا بظاہر مسلمان تھا ساتھ ہی اپنے جملہ جاہلی خصائل کا بھی پابند تھا۔ اس دور میں وہی پہلا شخص نہ تھا جو شراب نوشی کر رہا تھا بلکہ اس جیسے اور بہت سے تھے۔ جن کی زبانیں مسلمان ہو چکی تھیں مگر دل پُر خلوص ایمان سے خالی تھے۔ بلکہ کفر و ایمان کے مابین متذبذب تھے۔ اکیلا ولید ہی نہ تھا جو پوشیدہ طور پر عشرت کوشی تماشا پسندی اور ہنسی مذاق کا دلدادہ تھا بلکہ اس جیسے اور بھی بہت تھے۔ لہٰذا، قرینِ قیاس بات یہی ہے کہ ولید اس جادوگر کی شعبدہ بازی سے لطف اندوز ضرور ہوا ہوگا۔ باقی قصہ جو ابن مسعود کی دخل اندازی کا مظہر ہے ولید کی مدافعت کے لئے گھڑ لیا گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ولید کی معزولی کا ایک سبب اس کی شراب خواری تھی لیکن کچھ اسباب اور بھی تھے جو ممکن ہے اس کی شراب خواری اور اس جادوگر کے کمالات کے معائنہ سے بھی زیادہ اہم اور بعید الاثر ہوں ـــــ ہو سکتا ہے کہ وہ اسباب اہلِ کوفہ کے حق میں ولید کی عام سیاسی حکمت عملی یا طرزِ عمل سے تعلق رکھتے ہوں۔ اہلِ کوفہ کی اکثریت یمنی قبائل پر مشتمل تھی۔ مصریوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ ولید قریشی تھا اور اُسے اپنی قریشیت اور حضرت عثمان رضؓ سے قرابت کا جو اس کی ماں کی طرف سے اس کے بھائی تھے بہت گھمنڈ تھا۔ میں اس بیان کو بعید از قیاس نہیں سمجھتا کہ یہ یمنی اکثریت اس مصری قریشی حاکم سے تنگ دل ہو گئی ہو کیونکہ وہ کھلے بندوں اپنی بڑائی کا اظہار اور دوسروں کی تحقیر کرتا تھا۔ چنانچہ وہ آہستہ آہستہ ولید سے متنفر ہوتے چلے گئے۔ خود اسے بھی اس تنفر کا احساس تھا۔ مگر مجبوراً اسے یہ گوارا کرنا پڑتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ولید اس ارستقراطیت سے مقابلہ کر رہا تھا جسے وہ باعث فخر و ناز سمجھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے بعض اشراف نے اعلان کر رکھا تھا جو شخص کوفہ میں آئے اور اس کا کوئی ٹھکانہ نہ ہو تو اس کا ٹھکانہ "فلاں قبیلہ" میں ہوگا" گویا بظاہر یہ اشراف اس ضمن میں باہم مقابلہ کر رہے تھے، اور اس طرح ایک روایاتی قدیم عربی رواج کو زندہ کر رہے تھے۔ وہ قدیم رواج یہ تھا کہ مہمان کے پرتپاک استقبال کرنے یا اسے اپنے یہاں زیادہ سے زیادہ ٹھہرانے اور بڑھ چڑھ کر اس کی مہمانی کرنے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کیا جائے۔ یہ دیکھ کر ولید نے حضرت عثمان رضؓ کے حکم سے یا خود اپنی طرف سے ایک مہمان خانہ قائم کیا اور اس طریقے سے ان رؤسا کی باہمی رقابت و تفاخر اور عصبیت کا دربند کر دیا[1]۔ ابو زبید شاعر بھی آکر اسی مہمان خانہ میں اُترتا پھر جا کر ولید سے ملتا۔ اور جب تک وہاں مقیم رہتا اکثر ولید کے یہاں اس کی آمد و رفت جاری رہتی، ہو سکتا ہے۔ کہ کئی بار ابو زبید ولید کے یہاں سے مہمان خانہ کی طرف نشہ کے عالم میں لوٹا ہو اور زبان کو قابو میں نہ رکھ سکا ہو۔ لہٰذا وہ لوگ ولید کے بارے میں تجسس کرنے لگ گئے ہوں۔

---

[1] دیکھو طبری ۳۰ھ کے واقعات کا بیان۔

اُدھر ولید کو بھی محسوس ہو گیا تھا کہ لوگ اس سے متنفر اور درپردہ آمادۂ پیکار ہیں چنانچہ اس نے ایسی سیاست سے کام لیا جس میں بظاہر نرمی اور خیر و معروف کی اشاعت معلوم ہوا اور درپردہ عوام میں مقبولیت و ہر دل عزیزی اور اکثریت کی ہمدردی حاصل کرنا مقصود ہو۔ اس نے غلاموں کی آسائش کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کا تین درہم ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور اس رقم کی وجہ سے ان غلاموں کے آقاؤں اور ان کے موالی کے وظیفوں میں کچھ کمی نہ کی بلکہ انھیں یہ رقم فاضلہ دولت میں سے ملتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فاضلہ دولت موجود تھی جو اصولاً ان وظیفہ پانے والوں میں تقسیم ہونی چاہیے تھی جنہوں نے اُسے لڑ کر بطور غنیمت حاصل کیا تھا۔ لیکن ولید اُس فاضلہ رقم کو ان مجاہدین کے حوالے کرنے کی بجائے اس سے لونڈی غلاموں کی بہبود کا بندوبست کرتا تھا۔ گویا وہ مالِ غنیمت کو مالِ غنیمت ہی میں واپس لوٹا رہا تھا۔ کیونکہ لونڈی غلام بھی مالِ غنیمت ہی کا ایک حصہ تھے جنہیں فاتحین نے سونے چاندی اور دوسری اشیاء کی طرح آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ اب جو عربوں کی اس نفسیات سے واقف ہے کہ وہ بڑی حد تک جاہلیت کی عادات لے کر بظاہر مسلمان ہو گئے تھے وہ بلا کسی تعجب کے اظہار کے یہ سمجھ لے گا کہ کوفہ کے یمنی قبائل اس قریشی والی سے کیوں بیزار تھے جو ان کا مالِ غنیمت انہی کے مالِ غنیمت میں لوٹا رہا تھا اور انہی کی فاضلہ دولت کے ذریعے لونڈی غلاموں کو آسودہ کر کے ان کی ہمدردیاں محبت اور تائید حاصل کر رہا تھا۔ عین ممکن ہے کہ ان کے ذریعے وہ اپنے لئے ایک ایسی طاقت بنا رہا ہو جو اپنے آقاؤں کے مقابلہ میں اس کی حمایت کرے یا اپنے سرداروں کے خلاف بوقت ضرورت حکومت کی مدد کر سکے راویوں کا بیان ہے کہ جب ولید معزول ہوا تو غلام اور لونڈیوں نے اس پر سوگ منایا۔ طبری کی روایت کے مطابق باندیاں رونے کی وجہ سے ہچکیاں لے کر یہ رجزیہ اشعار گاتی تھیں:۔

يَا وَيْلَتَا قَدْ عُزِلَ الْوَلِيدُ ۔۔۔ وَجَاءَنَا مُجَوِّعًا سَعِيدُ

يَنْقُصُ فِي الصَّاعِ وَلَا يَزِيدُ ۔۔۔ فَجَوَّعَ الْإِمَاءَ وَالْعَبِيدُ

(ترجمہ) ہائے ولید کی معزولی کے سبب سے ہم تباہ ہو گئے اور اس کے بعد بھوکا مارنے والا سعید ہمارا حاکم بن کر آیا ہے، وہ پیمانہ (صاع) میں کمی کرتا ہے بڑھاتا نہیں، لونڈیاں اور غلام تو بھوک کے مار دیئے گئے۔

لیکن میرے خیال میں یہ رجز جعلی ہے جسے ولید کے حامی قصہ نگاروں نے گھڑ لیا ہے۔ اس لئے کہ کوفہ کے ایرانی لونڈی غلام عربی زبان پر اس قدر حاوی نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ ولید و سعید کے بارے میں عربوں کی طرح رجزیہ اشعار کہتے۔ تاہم ایسے رجزیہ اشعار سے یہ بات ضرور ظاہر ہوتی ہے کہ ایرانی غلام اور آزاد افراد سب ولید کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ انھیں عزیز رکھتا تھا اور انھیں اپنانا چاہتا تھا۔ یہی باعث ہے کہ راویوں کے قول کے مطابق ولید کے بارے میں اہلِ کوفہ دو پارٹیوں میں بٹ گئے تھے۔ عوام اس کے حامی تھے اور خواص مخالف۔

اس کا مطلب بجز اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ ولید عوام کے ساتھ مشفقانہ سلوک کرتا تھا اور خواص کے ساتھ سختی برتتا تھا۔ لیکن اگر اس معاملہ میں ولید کا طرزِ عمل وہی ہوتا جو حضرت عمرؓ کا تھا تو کوئی اس پر اعتراض کی جرأت نہ کرتا۔ حضرت عمرؓ بھی عوام کے حق میں نرمی اور خواص کے حق میں سختی برتتے تھے۔ لیکن خواص کے حق میں اس سختی کے ذریعہ ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ ان کی خود پسندی وخود رائی، جاہلی عصبیت کی پاسداری اور جذبۂ غرور وتکبر کا مقابلہ کریں۔ ولید کے پاس ایسا کوئی مقصد نہ تھا۔ وہ تو ارستقراطیت سے زور آزمائی کر رہا تھا اور اس مقابلہ میں اس نے لونڈی غلاموں کو اپنے مابین آڑ بنا لیا۔

بہر حال ولید معزول ہو گیا اس وقت کوفہ کے اصحاب عقل ورائے اس سے بیزار اور ناراض تھے۔ سرداران قوم کی ناراضگی کا سبب جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا یہ تھا کہ وہ انھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتا اور ان سے چشمک رکھتا تھا اس کی کوشش یہ تھی کہ ان کے غلاموں کو ان کے خلاف ورغلائے معلّمین وصالحین اور فقہا حضرات اس کی جاہلیت کی علامتوں کے باعث اسے ناپسند کرتے تھے جس کی وجہ سے وہ تماشبینی، ہنسی، مذاق، عیش کوشی کا دل دادہ تھا اور حدود اللہ سے تجاوز کرتا تھا۔

باب ہشتم

کوفہ سعید بن العاص رض کے دور میں

حضرت عثمان رض کا یہ اقدام نہایت مناسب تھا کہ انھوں نے ولید کو بحال رکھنے پر اصرار نہ کیا اور اس کی رعایت کئے بغیر شرعی سزا دی جس کا وہ مستحق تھا۔ اس کے بعد انھیں چاہئیے یہ تھا کہ کوفہ کی حکومت مہاجرین و انصار میں سے کسی صحابی اور قابل شخص کے سپرد کرتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو اس صوبہ کی حالت سدھر جاتی اور لوگ اختلافات اور فرقہ بندیوں کا شکار نہ ہوتے۔ لیکن انھوں نے اہل کوفہ کی گردنوں پر سے آلِ ابی معیط کے ایک شخص کو اتار کر بنو امیہ کے ایک شخص کو حاکم بنا کر ان کی طرف بھیج دیا حالانکہ حضرت عمر رض نے انھیں پہلے ہی تاکید کر دی تھی کہ وہ ان دو قبائل کے افراد کو لوگوں کی گردنوں پر ہرگز سوار نہ کریں اور اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ اہل کوفہ کو حضرت عمر رض کی اس تاکیدی ہدایت کا علم ہوگا جو انھوں نے حضرت عثمان رض کو دی تھی مزید برآں ان کی نظر میں بہت سے صحابہ کرام رض ایسے تھے جن کی سیرت پر وہ مطمئن تھے اور جنھیں اپنا حاکم بنانا وہ پسند کرتے تھے۔ حضرت عثمان رض کو یہ بھی معلوم تھا کہ اہل کوفہ سعد بن ابی وقاص رض کے بعد ولید بن عقبہ کی حکومت سے دل تنگ ہو چکے تھے، لہٰذا، اب کی بار ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ کوفہ کی حکومت پر کسی ایسے شخص کو مامور کرتے جو ولید کے ہم مرتبہ ہونے کی بجائے حضرت سعد رض کی قدر و منزلت کا ہوتا۔

کوفہ کے نئے والی سعید بن العاص رض

سعید بن العاص رض بنی امیہ کے نوجوانوں میں سے تھے ان کے مزاج میں اعتدال راست روی تھی۔ فتح شام میں اپنے بھائیوں کے ساتھ انھوں نے بھی اپنے جوہر دکھائے اور کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ حضرت عثمان رض کی خلافت سے پہلے وہ انہی کی سرپرستی میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رض نے قریشیوں کو تلاش کرتے ہوئے ان کے بارے میں پوچھا تو انھیں بتایا گیا کہ سعید بیمار ہیں اور ان کی حالت نازک ہے۔ چنانچہ عمر رض نے حضرت معاویہ رض کے پاس پیغام بھیجا کہ سعید کو آرام و حفاظت سے ان کے (عمر رض) پاس بھیج دیا جائے جونہی وہ مدینہ پہنچے ان کی صحت و قوت لوٹ آئی۔ حضرت عمر رض نے ان کا بڑے تپاک سے استقبال کیا اور ان سے بہت محبت و شفقت کا سلوک کیا۔ حضرت عمر رض ان کے حال پر بدستور

مہربان رہے حتیٰ کہ آپ نے ان کی شادی کر دی اور انھیں وہی رتبہ عطا کیا جو ان کے جیسے دوسرے قریشی نوجوان اشراف کو حاصل تھا۔ بہرحال وہ اموی قریشی اور حضرت عثمانؓ کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ صداقت پسند تھے لیکن بایں ہمہ وہ قریش کی عظمت کے عموماً اور بنو امیہ کی عظمت و امتیاز کے خصوصاً قائل تھے۔ الغرض وہ کوفہ میں اس پختہ ارادہ کے ساتھ گئے تھے کہ ولید کی پیدا کردہ جملہ خرابیوں کی اصلاح کریں اور اس بارے میں ان کی طرف بہت سے قصے منسوب کئے جاتے ہیں۔ بعض داستان گو کہتے ہیں کہ انھوں نے ولید کی عصیاں کاری سے اجتناب کے پیش نظر منبر کو بھی دھلوایا جس سے بعض قریشیوں کو دکھ پہنچا۔

یہ ٹھیک ہے کہ اہلِ کوفہ نے ان کا شاندار استقبال کیا تھا اور سعید نے بھی ابتداءً ان لوگوں کے ساتھ اچھی سیاست سے کام لیا۔ انھوں نے کوفہ کے حالات کا بہت قریب سے مطالعہ کیا۔ ان اشخاص کو ندیم و مصاحب بنایا جو قرّاء اور مبلغین میں سے تھے اور جنھیں ولید نے ناراض کر لیا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ معاملہ کی تہہ تک پہنچ گیا اور

کوفہ اور دیگر نئے مفتوحہ علاقوں کی اصل بیماری

معاملہ کی صحیح صورت سے حضرت عثمانؓ کو مطلع کر دیا، اس نے حضرت عثمانؓ کے پاس جو روئیداد بھیجی تھی اس میں صرف احوال کوفہ ہی کی ہو بہو تصویر نہ تھی بلکہ اس سے صوبہ جات کے احوال پر بھی روشنی پڑتی تھی۔ اس نے بتایا کہ کوفہ دو وجوہ کی بنا پر فتنہ و فساد سے دوچار ہے۔ ایک سبب یہ تھا کہ "صاحبِ سبقت" حضرات کمزور ہو گئے تھے۔ مرورِ ایام کے ساتھ ان کی حیثیت گھٹتی جا رہی تھی۔ اصحاب سبقت وہ رؤسا تھے جو فتوحات میں سب سے پہلے شریک ہوئے اور جب کوفہ کا شہر بسایا گیا تو وہیں مقیم ہو گئے۔ ان میں سے بعض ایسے بزرگ بھی تھے جنہیں اپنے قبیلوں میں سرداری حاصل تھی۔ ان میں ایسے مبلغین بھی تھے جنھیں رسولِ خداؐ یا صحابۂ کرامؓ سے شرفِ زیارت کے باعث بلند دینی مرتبہ حاصل تھا۔ مگر اب موت ان کی تعداد کو جنگ و امن ہر دو صورتوں میں گھٹائے جا رہی تھی۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ نوجوانوں اور دیگر علاقوں سے آنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی ان میں بڑی تعداد ان عرب کے صحرانشینوں کی تھی جو اپنی مرضی سے یا خلیفہ کے حکم سے لشکر میں بھرتی ہونے کے لئے آتے تھے اور اسی طرح ایک بڑی تعداد ان قیدیوں کی تھی جنھیں فاتحین اسیرانِ جنگ کی حیثیت سے مالِ غنیمت کے ساتھ آپس میں تقسیم کر لیتے[1] اور پھر اپنے ساتھ کوفہ میں لا کر بسا لیتے۔ پھر اس نئی نسل میں بہت بڑی تعداد ان کی تھی جو آزاد ماؤں، لونڈیوں

---

[1] یہ قرآن کے خلاف تھا۔

کی اولاد تھی علاوہ ازیں ایسے نوجوان بھی کثیر تعداد میں موجود تھے جو یا تو آزاد عجمیوں کی اولاد تھے یا غلام عجمیوں کی۔ یہ تمام نئی پود بڑھ کر نمایاں حیثیت و قوت اختیار کر کے کوفہ کی عمومی زندگی پر اثر انداز ہو رہی تھی۔

غرض عرب و عجم کے یہ اجنبی اور ان کی اولاد کوفہ میں اس قدر پھیل گئی کہ اہلِ سبقت دب کر رہ گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی بجائے حکومت کی باگ ڈور بھی اس نئی پود کے ہاتھ میں آجائے گی۔ یہ نئی پود ساری کی ساری علم کی بجائے جہل اور نرمی و مہربانی کی بجائے درشتی و تند خوئی سے زیادہ بہرہ ور تھی۔ بدو اپنے ہمراہ اپنی روایتی درشتی۔ تند خوئی عصبیت اور جہل لاتے تھے۔ قیدی اپنے ہمراہ اپنا موروثی تمدن لاتے تھے جو زوال پذیر حالت میں ہوتا جس میں شکست خوردگی کی وجہ سے عاجزی و ذلت ماضی پر حسرت، مستقبل سے مایوسی، آقا کے خلاف دل میں بغض و کینہ مکر و خوف اور چال بازی کے ملے جلے جذبات پائے جاتے۔ اس ماحول میں پرورش پانے والوں نے دونوں گروہوں سے کچھ عادتیں اور اخلاق اپنالئے، صحیح شکلیں ان کے سامنے نہ رہیں اس طرح نہ صرف اپنے لئے بلکہ دوسروں کے لئے بھی یہ پریشانی کا سبب بن گئے اور ان کی وجہ سے سیاسی معاملات بھی نہایت پیچیدہ بن گئے جنھوں نے امراء و عمال کو عجیب و غریب مشکلات میں ڈال دیا، وہ اگر معاملات کے ایک سرے کو سلجھاتے تھے تو دوسرا سرا پھر الجھ جاتا تھا۔

اس قسم کی کچھ باتیں سعید نے حضرت عثمانؓ کی خدمت میں لکھ بھیجیں تاکہ انھیں اپنے علاقہ کی حقیقتِ حال سے آگاہ کریں۔ حضرت عثمانؓ نے جواباً سعید کو ہدایت کی کہ "جہاں تک ممکن ہو تم امن و عافیت اور بھلائی کو اپنا شعار بنالو اور حتی الوسع اپنے آپ کو اور عوام کو فتنہ و فساد سے بچائے رکھو۔ نیز یہ بھی ہدایت کی کہ "اصحاب سبقت" کو اور ان سے مراسم رکھنے والوں کو مقدم رکھتے ہوئے باقی جملہ عوام کے ساتھ منصفانہ طور پر درجہ بدرجہ سلوک کرو کسی کو دوسرے پر ناواجب ترجیح نہ دو نہ کسی کے ساتھ زیادتی کرو نہ کسی پر ستم ڈھاؤ۔"

تاہم اس وقت سے حضرت عثمانؓ کو یہ محسوس ہونے لگا کہ عوام کے احوال متغیر ہو چکے ہیں اور فتنہ رونما ہو رہا ہے لہٰذا،

حضرت عثمانؓ کا مجوزہ علاج

اس فتنہ سے بچاؤ کی سبیل پیدا کرنا لابدی امر ہے۔ چنانچہ انھوں نے مدینہ میں لوگوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے یہ سب امور بیان فرما دیئے۔ فتنہ کے نتائج سے متنبہ کیا اور جس روش پر گامزن ہونے کی انھوں نے سعید کو ہدایت کی تھی اس کے بارے میں مشورہ طلب کیا۔ لوگوں نے ان کی فرستادہ ہدایات کی تائید کی لیکن حضرت عثمانؓ نے ایک اور اہم تجویز پیش کی جسے سن کر اہالیانِ مدینہ کی اکثریت نے بہت زیادہ مسرت کا اظہار کیا۔ حضرت عثمانؓ کا خیال تھا کہ اس طرح بگڑی ہوئی حالت کو سنوارا جا سکے گا اور منتشر اجزاء کی شیرازہ بندی ہو سکے گی۔ لیکن نتیجہ حضرت عثمانؓ کی مرضی کے بالکل برعکس نکلا، ان کی پیش کردہ تجویز یہ تھی کہ لوگ عرب

میں جہاں بھی اقامت کرلیں انھیں جگہوں پر ان کے مالِ غنیمت کے حصے منتقل ہو جائیں، مطلب یہ تھا کہ فوجی خدمت کے علاوہ جو ناگزیر یہ ہے کوفہ، بصرہ اور مصر میں صرف وہی افراد رہیں جن کا وہاں رہنا ضروری ہو۔ اہلِ مدینہ حضرت عثمانؓ کی اس نئی تجویز کو سُن کر حیرت و تعجب میں پڑ گئے، انھوں نے حضرت عثمانؓ سے دریافت کیا کہ آخر آپ ہماری وہ زمینیں جو مالِ غنیمت میں ملی ہیں ہماری طرف کیونکر منتقل فرمائیں گے؟ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا ــــ "اور یہی اس نئی تجویز کا لب لباب ہے جو چاہے گا ہم اس کی زمین اس کی جائداد کے بدلے میں جو وہ حجاز میں لینا چاہے بکوا دیں گے"۔ لوگ یہ سُن

اسلام میں بڑی بڑی ملکیتوں اور جاگیردارانہ نظام کا آغاز ایک عظیم اقتصادی انقلاب

کر بہت خوش ہوئے اس طرح اللہ نے ان پر ایک مسئلہ آسان کر دیا جو اُن کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ چنانچہ وہ خدا کی طرف سے اس کشائش کی خبر سُن کر اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے اولاً اہلِ حجاز کے لئے اور ازاں بعد تمام اہلِ عرب کے لئے یہ پیش کش کی کہ وہ اپنی ان زمینوں کی بجائے جو عراق یا دوسرے علاقوں میں ہیں، حجاز یا عرب کے دوسرے اقطاع میں جہاں چاہیں زمینیں خرید سکتے ہیں۔ اس صورت میں وہ اپنے اپنے علاقوں میں رہیں گے اور انھیں وہاں سے اِدھر اُدھر نہیں جانا پڑے گا۔ ان کے ساتھ ان کے کنبہ، قبیلہ والے اور متعلقین بھی مقیم رہیں گے۔ لہٰذا، صوبہ جات میں آبادی کا دباؤ ہلکا ہو جائے گا اور ان علاقوں کی طرف اہلِ عرب کی ہجرت گھٹ جائے گی۔ علاوہ ازیں یہ بھی مدِّنظر تھا کہ جو لوگ صوبہ جات میں واقع املاک کے عوض عرب کے اضلاع میں یا حجاز میں زمین خریدیں گے انھیں بہت سے مزدوروں کی بھی ضرورت ہوگی تاکہ ان زمینوں کی اصلاح ہو اور ان میں فصلیں کاشت کی جائیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ غلام و موالی زیادہ تعداد میں اقطاعِ عرب کی جانب کھنچ آئیں گے اور اس طرح صوبائی علاقوں میں قیدیوں کی مسلسل آمد کے باعث آبادی پر جو دباؤ پڑ گیا تھا وہ بھی ہلکا ہو جائے گا۔ اس تجویز پر لوگوں کی مسرّت و شادمانی کوئی تعجب خیز امر نہ تھا، ظاہر ہے کہ حجازیوں کے لئے سرزمینِ حجاز عراق کے مقابلے میں زیادہ عزیز تھی۔ اسی طرح یمنیوں کو سرزمین یمن مصر و شام سے زیادہ پیاری تھی، وہ زمینیں ان کے وطنوں میں ہونے کی وجہ سے ان سے قریب ہوں گی، انھیں اس کی دیکھ بھال میں زیادہ مشقّت و کلفت بھی برداشت نہ کرنا پڑے گی۔ نہ کوئی چھوٹا بڑا سفر کرنا پڑے گا اور نہ اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین سے ہجرت کرنی پڑے گی۔ حضرت عثمانؓ نے اس اجازت کی عام تشہیر کی اور لوگوں کے لئے وہ عظیم راہ کھول دی جس کا لوگوں کی سیاسی۔ اجتماعی۔ اقتصادی اور عقلی زندگی پر بہت گہرا اثر پڑا۔ اس اثر کو بتانے کے لئے ہم کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ہوا یوں کہ حجاز میں کئی صحابۂ کبارؓ بڑی بڑی منقولہ و غیر منقولہ املاک رکھتے تھے۔ جلد ہی انھوں نے دیگر صوبہ جات میں زمینیں خریدنے کے لئے اپنا تمام مال خرچ کر دیا،

انھیں علم تھا کہ مفتوحہ علاقوں کی زمینیں حجاز کی زمینوں سے زیادہ شاداب اور زرخیز ہیں اور وہاں کاشتکاری بھی کم محنت طلب ہے۔ حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ نے بڑی جد وجہد صرف کر کے خیبر کے تقریباً تمام حصے ان لوگوں سے یا ان کی اولاد سے خرید لئے تھے جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ فتح خیبر میں شریک ہوئے تھے۔ مگر جب حضرت عثمانؓ نے یہ در کھول دیا تو انھوں نے خیبر کے حصے ان اہلِ حجاز کے ہاتھوں بیچ دیئے جو فتح عراق میں شریک تھے ان کے عوض ان لوگوں کی عراق کی زمینیں لے لیں۔ حضرت طلحہؓ کے پاس خیبر کی زمینوں کے علاوہ بھی بہت مال و متاع تھا۔ لہٰذا، انھوں نے چند اور اہلِ حجاز سے بھی ان کی عراق میں واقع زمینیں خرید لیں۔ بلکہ خود حضرت عثمانؓ کو اپنی حجاز والی زمین دے کر اس کے عوض ان کی عراق والی زمین لے لی۔ دوسرے لوگوں نے بھی یہی سلسلہ جاری رکھا، جس کو بھی حجاز سے ہجرت ناگوار گذری اسی نے مفتوحہ علاقوں والی زمین بیچ کر اپنے وطن سے قریب کی زمین خرید لی۔ اس کا نتیجہ ایک تو یہ نکلا کہ عراق اور دوسرے علاقہ جات میں بڑی بڑی جاگیریں ظہور میں آگئیں۔ کیونکہ اس جدید تجویز سے فائدہ اٹھا سکنے والے وہی لوگ تھے جن کے پاس بڑا سرمایہ تھا۔ اور جو چھوٹی چھوٹی جائداد کے مالکوں سے ان کی جائیدادیں خرید سکتے تھے۔ لہٰذا، حضرت طلحہؓ نے خریدی۔ حضرت زبیرؓ نے خریدی۔ مروان بن الحکم نے خریدی۔ اور اس سال زمین کی خرید۔ فروخت قرضہ جات اور تبادلے کی وجہ سے دولت خوب مختلف ہاتھوں میں گھومتی پھرتی رہی۔ پھر یہ سلسلہ صرف حجاز و عراق تک محدود نہ رہا۔ بلکہ یہ ایک طرف تمام ملک عرب اور دوسری طرف تمام ممالک مفتوحہ میں عام ہو گیا[1]۔ ایک طرف بڑی بڑی زمینداریاں اور جاگیریں نظر آتی تھیں تو دوسری طرف ان کی دیکھ بھال کرنے والے مزدور بھی نظر آتے تھے۔ جن میں غلام۔ موالی اور آزاد سبھی شامل تھے۔ بایں صورت اسلام میں وہ طبقۂ جدید ظہور میں آگیا جسے مالداروں کی حکومت (PLUTOCRACY) کہتے ہیں۔ جس کا امتیازی نشان وہ ارستقراطیت ہے جو نسلی سیادت کے علاوہ جائداد کی کثرت۔ دولت کی فراوانی اور خدمت گزاروں کی افراط رکھتی ہے۔

ثانیاً اس کا جو نتیجہ برآمد ہوا وہ یہ کہ جن لوگوں نے ملک عرب میں اور بالخصوص حجاز میں زمینیں خرید لی تھیں وہ انھیں زرخیز بھی بنانا چاہتے تھے لہٰذا، انھوں نے زیادہ سے زیادہ غلام فراہم کر لئے۔ چنانچہ کچھ ہی مدت بعد حجاز کا دنیا کے بہترین گلزاروں میں شمار ہونے لگا۔ ایسے باغات جو سب سے زیادہ شاداب و زرخیز اعلیٰ پھلوں سے لدے ہوئے اپنے مالکوں کے لئے بڑی آمدنیوں کا باعث جس کا نتیجہ خوشحالی و فارغ البالی ہو ــــ نتیجۃً جلد ہی خود مکہ۔ مدینہ اور طائف میں فارغ البال رئیسوں کا وہ طبقہ پیدا ہو گیا جو خود کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتا جس کا تمام کام غلاموں کے ہاتھوں سرانجام پاتا۔ اور جس کا اپنا وقت لہو و لعب،

---

[1] یہ سب قرآن کے معاشی نظام کے خلاف ہے۔ لہٰذا، صحیح نظر نہیں آتا۔

عشرت کوشی اور ہنسی مذاق میں گزرتا۔

ازاں بعد ایک صورت یہ رونما ہوئی کہ حجاز اور اس کے علاوہ تمام اقطاعِ عرب میں تمدن بسرعت تمام کھنچ آیا چنانچہ خوشحالی و آرام پرستی کا دور دورہ ہو گیا۔ وہ فنون بھی پیدا ہو گئے جو خوش حالی اور آرام پرستی کا ثمرہ ہوتے ہیں یعنی نغمہ و سرود، رقص و شاعری کی وہ قسمیں جو سنجیدگی اور قوتِ عمل پیدا نہیں کرتیں بلکہ بیکاری و آرام پرستی، اور ان کی لذت کے لئے مر مٹنے کی عکاسی کرتی ہیں یا ان اغراض کے لئے اپنے آپ میں کھوئے رہنے اور اپنے نفس کی فکروں میں لگے رہنے کی ترجمانی کرتی ہیں ـــــ اس خوش حال و آرام پرست طبقہ کے جلو میں غلاموں کا وہ طبقہ زندگی گزار رہا تھا جو اپنے آقاؤں کا ملک تھا اور ان کی زندگیوں کے پروگرام مرتب کرتا تھا۔ ان کے لئے ان کی باطل سرگرمیوں اور ہوس پرستیوں کا انصرام و اہتمام کرتا تھا۔ علاوہ ازیں ان غلام سرداروں یا سردار غلاموں کے پہلو میں ایک اور طبقہ بھی زندگی بسر کر رہا تھا اور وہ تھا محروم صحرا نشین عربوں کا جو عراق میں کسی زمین کے مالک نہ ہونے کی وجہ سے حجاز میں کوئی قطعۂ اراضی نہ خرید سکے اور اسی طرح حجاز میں ان کے قبضہ میں کوئی زمین نہ تھی جسے بیچ کر عراق میں جائداد خرید سکتے۔

جب حضرت عثمانؓ اور ان کے مشیران و خواص اس نئی تجویز پر غور و فکر کر رہے تھے تو ان میں سے کسی کی نگاہ ان دور رس نتائج تک پہنچی تھی، حضرت عثمانؓ نے تو ایک خرابی کا ازالہ اور ایک بدعنوانی کا استیصال کیا تھا، ان کا مطلب تو یہ تھا کہ عربوں کو ان کے علاقوں میں ہی رہنے دیا جائے اور ان کی ہجرت کا ندر کم ہو جائے۔ نیز قیدیوں اور غلاموں کو ملکِ عرب میں لے آیا جائے۔ انھوں نے تو اہلِ حجاز کو اجازت دی تھی کہ وہ مقبوضہ علاقوں میں واقع اپنے چھوٹے چھوٹے اقطاع بیچ کر ان کے عوض اپنے قریبی علاقوں میں زمین خریدیں اور قریب رہ کر اس کی نگہداشت کریں۔ لیکن حضرت عثمانؓ کا مقصد حاصل نہ ہوا بلکہ اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور معاملہ کو مزید خطرناک کر دیا۔ نہیں معلوم کہ حضرت عثمانؓ عربوں کو ممالک مفتوحہ کی طرف جانے سے روک سکنے یا وقتی طور پر اس ہجرت کے ریلے کو بند کرنے میں کامیاب ہوئے یا نہیں۔ کیونکہ تاریخ ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔ بلکہ مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ تاریخ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے مشیرانِ کار کی اس اہم تجویز کو سمجھ بھی سکی جس کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں کی اقتصادی زندگی میں یہ انقلابِ عظیم برپا کرنا چاہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت عثمانؓ ان مفتوحہ علاقوں سے ان روز افزوں غلاموں اور قیدیوں کا دباؤ کم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لئے کہ عہدِ عثمانؓ میں فتوحات کی رو تھمی نہ تھی بلکہ فتوحات کا ریلا بدستور بڑی شدت اور تندی کے ساتھ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔ پھر یہ کہ مالِ غنیمت کے پانچ حصوں میں سے چار حصے ($\frac{4}{5}$) فاتحین میں تقسیم ہو رہے تھے۔ یہ فاتحین مفتوحہ شہروں میں ہی اقامت گزیں تھے۔ سرحد کی طرف انھیں چار سال کے بعد ایک بار جانا ہوتا تھا اور جب جاتے

تھے تو صرف چھ ماہ کے لگ بھگ وہاں ٹھہرائے جاتے تھے۔ بہر حال یہ اموالِ غنیمت اور یہ غلام[1] اپنے آقاؤں کے ساتھ صوبائی شہروں میں سے بڑھتے چلے آ رہے تھے اور غلاموں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی تھی۔ ایک ہی چارہ کار تھا اور وہ یہ کہ فتح کا سلسلہ رُک جاتا اور سلطنت امن و آشتی کے سائے میں زندگی بسر کرتی اور یہ چیز حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں میسر نہ آ سکی کیونکہ اس وقت تو والیانِ صوبہ جات کا ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر علاقے فتح کرنے میں مقابلہ ٹھنا ہوا تھا۔ اسی طرح سپہ سالاران سرحد کے مابین شدید مقابلہ تھا کہ کون کس کارزار میں سب سے پہلے دشمن کے سامنے سینہ سپر ہوتا ہے اور کون سب سے پہلے کس شہر پر قابض ہوتا ہے۔ کون سب سے زیادہ غنیمت سمیٹ کر اولاً خود کو اور اپنے لشکر کو آسودہ و دل شاد کرتا ہے ثانیاً حاکم صوبہ کی خوشنودی حاصل کرتا ہے اور ثالثاً خلیفہ و صحابۂ رسولؐ کی مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ بہر حال حضرت عثمانؓ مستعمرین اور مغلوبین کا دباؤ مفتوحہ شہروں بالخصوص بصرہ و کوفہ سے کم نہ کر سکے۔ اور نہ حجاز میں زمینیں خریدنے والوں کو یہ موقع مل سکا کہ وہ اپنے معاملات کو منظم و منضبط کر کے مطلوبہ کارکنوں کو اس انداز سے درآمد کرتے کہ مفتوحہ شہروں میں غلاموں کی تعداد کم ہو جاتی۔ حضرت عثمانؓ نے اس اقتصادی انقلاب کی بنیاد ۳۰ھ میں ڈالی اور ۳۵ھ میں وہ شہید ہو گئے۔ ابتدائی دو سالوں کے اندر ہی گڑبڑ شروع ہو گئی تھی۔ لہٰذا، اس مختصر سے وقت میں یہ انقلاب متوقع نتائج تو پیدا نہ کر سکا بلکہ حد درجہ مختصر سے وقت میں وہ انتہائی ناگوار پھل لایا۔ کیونکہ حجاز کے سرمایہ دار تو اس موقع کے بہ غایت اشتیاق منتظر تھے ہی۔

حضرت عمرؓ نے جب قریش کو مدینہ کا پابند کیا تھا تو صرف افراد کو پابند نہیں کیا تھا بلکہ بڑی حد تک ان کی دولت کو بھی وہاں سے باہر نہ جانے دیا تھا وہ حجاز اور ممالک مفتوحہ کے درمیان بڑے پیمانہ پر تجارت کرتے تھے۔ جس سے انھیں بڑی مقدار میں منافع حاصل ہوتا تھا۔ لیکن وہ اس دولت کے سیلِ بے پناہ کو ہماری آج کل کی اصطلاح کے مطابق کسی بڑے نفع بخش کام میں نہ لگا سکتے تھے۔ مال پہ مال اور نقدی پہ نقدی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ فقراء اور متوسط درجے کے لوگ اس دولت کو دیکھتے تو حیرت و تعجب کا اظہار کرتے، کبھی اس کے خلاف زبانیں بھی کھولتے جس سے مجبور ہو کر اصحابِ ثروت اپنی دولت کا کفارہ بخشش خیرات اور عطیّوں کی شکل میں ادا کرتے رہتے تھے۔ نیک دل اغنیاء اس اس سخاوت و بخشش سے خوشنودیٔ مولیٰ اور عوام کی دلجوئی کے طالب ہوتے تھے اور دوسرے لوگ اس عمل سے بعض لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے حسد و کینہ سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔

[1] حیرت ہے کہ اسیرانِ جنگ کے متعلق قرآن کے صریح حکم کے خلاف انھیں غلام بنایا جاتا تھا۔ کیا ہم تاریخ کے بیان کو صحیح مانیں؟

حضرت عمرؓ نے قریش کو اکتسابِ زر سے منع نہ کیا تھا کیونکہ ان کے پاس اس سلسلہ کو بند کرنے کے لئے کوئی صورت نہ تھی تاہم ان کے دل میں یہ بات پوری طرح جاگزیں ہو چکی تھی کہ سرمایہ دار جتنی چاہیئے اس سے زیادہ دولت کما رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں فرمایا تھا۔ "جو بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی اگر ابتداء میں معلوم ہو جاتی تو میں زرداروں سے تمام فالتو دولت چھین کر فقراء میں تقسیم کر دیتا" بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز جب اہلِ مدینہ خواب سے بیدار ہوئے تو ایک ہنگامہ خیز شور سنائی دیا۔ حضرت عائشہؓ کو دریافت کرنے پہ بتایا گیا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا کاروانِ تجارت وارد ہوا ہے۔ اس پہ حضرت عائشہؓ نے کہا " میں نے رسولِ خدا کو یہ فرماتے ہوئے سُنا تھا " مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے عبدالرحمٰن بن عوفؓ پل صراط[1] پہ ہوں وہ کبھی ایک طرف کو جھکتے ہیں کبھی دوسری طرف وہ بچ کر تو نکل آتے ہیں مگر بڑی مشکل سے۔ یہ حدیث حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے سُنی تو کہا میری طرف سے اس قافلہ کے تمام اُونٹ مع لدے ہوئے ساز و سامان کے راہِ خدا میں خیرات ہیں"۔ راویوں کا بیان ہے کہ اس پہ جو سامان تھا وہ اُونٹوں سے زیادہ قیمتی تھا۔ اور کاروانِ تجارت پانچسو اُونٹوں پر مشتمل تھا[2]۔

ابنِ سعد کی ایک روایت بواسطہ سلیمان بن عبدالرحمٰن دمشقی۔ خالد بن یزید بن ابی مالک۔ اپنے والد سے۔ عطاء بن ابی رباح۔ ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف اپنے والد حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے عبدالرحمٰن! تو زرداروں میں سے ہے۔ تو جنت میں گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے داخل ہوگا۔ خدا کی راہ میں خیرات کر کہ تیرے قدم کھل جائیں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا " یا رسولؐ اللہ کون سی چیز خیرات کر دوں"۔ فرمایا " جو کچھ کل تک تیرے پاس تھا اسے خیرات کر دے"۔ ابن عوف نے کہا " یا رسولؐ اللہ کیا وہ سارا کچھ دے دوں" آپ نے فرمایا! " ہاں"۔

ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف کہتے ہیں کہ یہ سُن کر میرے والد وہاں سے تعمیلِ ارشاد کرنے کے ارادہ سے چلے آئے کہ رسولؐ خدا نے پیغام بھجوایا کہ جبرئیلؑ نے کہا ہے " عبدالرحمٰنؓ کو حکم دو کہ وہ مہمان نوازی کرے، مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ سائل کو خیرات دے اور اس خیرات کی ابتداء اپنے اہل و عیال سے کرے، اگر وہ ایسا کرے گا تو یہ اس کے زر و مال کا تزکیہ ہو جائے گا[3]"۔

---

[1] یہ پل صراط کا عقیدہ مجوسیوں سے ماخوذ ہے۔ لہٰذا یہ روایت وضعی ہے۔

[2] طبقات ابن سعد مطبوعہ لیدن، جزء ثالث، القسم الاوّل ص۹۳

[3] صاف نظر آتا ہے کہ روایت کا یہ حصہ وضعی ہے کیونکہ پہلا حکم قرآن کے ارشاد کے بالکل مطابق تھا جس میں (قل العفو) اپنی ضروریات سے زائد تمام دولت کو فی سبیل اللہ دے دینے کے لئے کہا گیا ہے۔

غرض عہدِ نبوی میں حضرت عبدالرحمٰن کی دولت کا یہ عالم تھا آپؐ کے بعد ایک تو تجارت کی توسیع اور اس کے نفع کی بدولت دوسرے ان اموال غنیمت کی وجہ سے جو خدا مسلمانوں پہ ارزانی کر رہا تھا اس دولت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے پچاس لاکھ دینار (سونے کے) راہِ خدا میں خیرات کرنے کی وصیت کی تھی۔ انھوں نے بہت بڑی میراث چھوڑی تھی، ان کے پاس ایک ہزار اونٹ اور تین ہزار بھیڑ بکریاں تھیں۔ ان کی زراعت شاداب زیریں زمینوں میں تھی جنھیں بیس اونٹ سیراب کرتے تھے۔ ان کی چار بیوگان میں سے ہر ایک کا حصہ اسی ہزار سے لے کر ایک لاکھ تک بنتا تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے جو سونا چھوڑا تھا اسے کلہاڑیوں سے توڑا گیا تھا اور اسے کاٹنے والوں کے ہاتھوں میں آبلے پڑ گئے۔ ساتھ ہی یہ بھی ذہن نشین رہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ ہی واحد شخصیت نہ تھے جو اس قدر عظیم سرمایہ کے مالک تھے۔ تمام صحابۂ کبار اور رؤسا قریش کا یہی حال تھا: چنانچہ جب حضرت عثمانؓ نے یہ جدید اقتصادی انقلاب پیدا کیا تو ان زرداروں کو اپنا سرمایہ منافع کے کاروبار میں لگانے کا موقع مل گیا لہٰذا، وہ مالدار ہونے کے ساتھ ساتھ کاروبار والے بھی ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بڑی بڑی جاگیریں پیدا ہو گئیں جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اور آغازِ اسلام میں ہی وہ بڑی جاگیرداریاں رونما ہو گئیں جو رومن جمہوریت کے آخری ایام میں نمودار ہو کر اس کی بربادی کا باعث ہوئی تھی۔ وہی جاگیردارانہ نظام جس نے رومن جمہوریت کو تباہ کیا تھا بعینہٖ اس نے اسلامی خلافت کو بھی برباد کر دیا۔ اہلِ روما کی مٹھی بھر اقلیت اٹلی کی تمام زمینوں کی مالک بن گئی تھی۔ چنانچہ لوگ ان سے وابستہ ہو کر گروہوں اور جماعتوں میں تقسیم ہو گئے تھے بعینہٖ مسلمانوں کی بھی ایک قلیل تعداد مملکت کی زمینوں کی مالک بن گئی۔ اور لوگ ان کے دامن سے وابستہ ہو کر گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ اس نظامِ نو کے نتائج جسے حضرت عثمانؓ نے خواہ اپنی رائے سے اختراع کیا خواہ اپنے مشیرانِ کار کے مشورہ سے، صرف سیاسی ہی نہ تھے کہ دولت مند طبقہ پیدا ہو گیا اور ان کی افراطِ زر نے لوگوں کو اپنی جانب کھینچ کر گروہوں میں بانٹ دیا اور پھر اس تفرقہ کی وجہ سے ان میں باہم حکمرانی کے لئے کشمکش پیدا ہو گئی بلکہ اس کے اجتماعی نتائج بھی تھے وہ یوں کہ اس انقلاب نے طبقاتی نظام کو اس کی انتہا تک پہنچا دیا۔ ایک طرف رئیسوں کا اونچا طبقہ تھا جو وسیع پیداوار، بے شمار دولت اور بے حساب قوت کا مالک تھا دوسری طرف ان بدنصیبوں کا طبقہ تھا جو زراعت کرتے تھے اور ان رؤسا کے کاروبار کی نگرانی کرتے تھے۔ ان دو متباعد طبقوں کے درمیان عرب عوام کا متوسط طبقہ تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو صوبائی علاقوں میں اقامت گزیں تھے۔ دشمنوں پر یلغار کرتے تھے۔ سرحدوں کی محافظت کرتے تھے اور اہلِ ملک کے جان و مال کی مدافعت کرتے تھے۔ یہی وہ متوسط طبقہ ہے جس کے ساتھ اغنیا نے ٹکر لی اور انھیں گروہوں اور ٹولیوں میں تقسیم کر دیا۔ جو شخص بھی مسلمانوں کی تاریخ کا بغور مطالعہ کرے گا وہ دیکھے گا کہ مسلمانوں کا پہلا

دنگل زرداروں کے مابین اور پھر ان زرداروں اور متوسط طبقہ کے مابین قائم ہوا تھا۔ مگر جہاں تک تیسرے طبقہ کا تعلق ہے یعنی مزارعین اور مختلف مصالح کی نگہداشت کرنے والا طبقہ تو انھوں نے اگر زور پکڑا تو اس دنگل کے بعد اور وہ ایک الگ داستان ہے۔

دراصل یہ فتنہ خالص سرزمین عرب کی پیداوار تھا، جو زرداروں کی ہوسِ زراندوزی و اقتدار پرستی کی جنگ کے باعث نیز عربی عوام کے دلوں میں ان زرداروں کے خلاف حسد و عداوت کے جذبات کے سبب رونما ہوا تھا اور

فتنہ کی ابتداء

جونہی حضرت عثمانؓ کا مجوزہ نظام پھیلا اور زرداروں نے تیزی سے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی یہ فتنہ ظاہر ہو گیا، اور دوسرے علاقوں سے پہلے یہ فتنہ کوفہ سے اٹھا اور خود سعید ہی کی محفل سے۔ یہ واقعہ ۳۳ھ کا ہے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ سعید رؤسا، مبلغین اور صالح لوگوں میں سے بعض چیدہ اشخاص کے ساتھ مجلسِ خصوصی منعقد کرتے جو رات کو وقائع اور قصہ گوئی کے فرائض بھی انجام دیتی تھی۔ کسی روز یا کسی رات کا واقعہ ہے کہ اس نے کہا "سواد یعنی سرزمینِ کوفہ تو قریش کا چمنستان ہے۔" یہ سن کر بہت سے لوگ لال پیلے ہو گئے کیونکہ ان میں سے اکثر یمنی تھے۔ انھوں نے سعید کی اس بات کا نہایت تلخ جواب دیا اور کہا کہ کوفہ کی یہ سرزمین تو مالِ غنیمت ہے جو خدا نے ہم مسلمانوں کو عطا کی ہے قریش کا بھی اس میں اتنا ہی حصہ ہے جتنا دوسرے مسلمانوں کا۔ لوگوں کی اس برہمی اور سخت جوابی پر سعید کے حفاظتی دستے کا افسر طیش میں آ گیا اور اس نے لوگوں کو ڈانٹا جس پر سب افسر کے خلاف ہو گئے اور اسے مارنا شروع کر دیا۔ اور مارتے مارتے بیہوش کر دیا۔ سعید مجلس سے اٹھ کر اندر چلے گئے لیکن لوگوں نے اپنے مشورے مجالس اور محفلیں قائم رکھیں۔ اور سعید نیز حضرت عثمانؓ اور قریش کے خلاف دل کھول کر زبانیں چلائیں جب یہ چرچے پھیلے تو بہت سے لوگ ان مخالفین میں شامل ہو گئے۔ سعید نے ان افراد کا ماجرا حضرت عثمانؓ کو لکھ بھیجا اور لکھا "مجھے خدشہ ہے کہ یہ لوگ دوسروں کو بھی آمادہ فساد کریں گے" حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ انھیں شام بھیج دو، ادھر حضرت معاویہ کو لکھا کہ وہ ان لوگوں سے مل کر ان کی اصلاح کریں۔ راویوں کی ایک اور جماعت اس حادثہ کو یوں بیان کرتی ہے کہ سعید مجلس عام میں بیٹھے تھے جس میں مذکورہ رؤسا اور مبلغین بھی تھے۔ باتوں باتوں میں لوگوں نے حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ کا ذکر چھیڑا۔ سعید نے کہا ہر وہ شخص جس کے پاس حضرت طلحہؓ جتنی نقدی اور جائداد ہو گی لازماً سخی ہو گا۔ اگر میرے پاس بھی اتنی دولت ہوتی جتنی حضرت طلحہؓ کے پاس ہے تو تم سب کو عیش کراتا ــــ یہ سن کر قبیلۂ مضر کے ایک نوجوان نے جو بنی اسد سے تعلق رکھتا تھا کہا "کیا اچھا ہو کہ امیر (سعید) فرات کی ساحلی زمین لے لیں" یہ زمین حکومت کی ملکیت تھی اور اس لئے تمام مشترکہ مسلمانوں کی جاگیر تھی۔ لہٰذا، اس نوجوان کی یہ تجویز سن کر حاضرین بگڑ

گئے اور اس نوجوان کو ڈانٹا، لوگوں میں باہم لے دے ہوئی، یہ لوگ اٹھے اور اس نوجوان کو ہی نہیں اس کے باپ کو بھی اتنا مارا کہ دونوں بیہوش ہو گئے۔ یہ حال دیکھ کر بنو اسد کو بھی طیش آگیا۔ سعید نے چاہا کہ معاملے کو امن و آشتی سے رفع دفع کر کے صلح کرا دیں مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر کوفہ والوں نے سعید پر زور ڈالا کہ وہ ان اشخاص کو کوفہ سے نکال دیں چنانچہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کے حکم سے انھیں شام کی طرف جلا وطن کر دیا۔

غور طلب امر یہ ہے کہ سعید نے ان افراد کو ان کے وطن سے نکال دیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ حاکم کو کس حد تک یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ مسلمانوں کو جلا وطن کر دے خواہ یہ جلا وطنی خود حاکم کی مرضی سے عمل میں آئے یا خلیفہ کے حکم سے مسلمانوں کی جلا وطنی صرف اسی صورت میں جائز تھی جب ان کے خلاف واضح طور پر ثبوت مل جاتا کہ انھوں نے خدا اور رسول کے احکام کی خلاف ورزی کی ہے اور ملک میں فساد برپا کرنا چاہا۔ پس اسی شکل میں امام کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ انھیں یا تو قتل کر دے یا پھانسی دے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوا دے یا انھیں جلا وطن کر دے۔

جلا وطنی کی سزا

لیکن ان مبلغ صالح اور کارزار فتح میں جانیں لڑانے والے اشخاص کے خلاف کوئی محکم ثبوت نہ تھا کہ وہ خدا اور رسول سے آمادہ پیکار ہوئے یا انھوں نے ملک میں فساد پھیلانا چاہا۔ حق یہ ہے کہ انہوں نے اطاعت سے بھی سرتابی نہ کی تھی۔ حضرت عثمانؓ یا ان کے کسی مقررہ والی کا بھی انھوں نے انکار نہ کیا تھا۔ وہ نماز اسی والی کے پیچھے پڑھ رہے تھے اور اپنے واجبات ادا کر رہے تھے۔ ان کا جرم صرف یہی تھا کہ انھوں نے امیر کے طرزِ عمل یا کسی قول پر تنقید کی تھی اور اپنی حد سے بڑھ کر اس نوجوان کو یا امیر کے حفاظتی دستہ کے سالار کو مارا پیٹا تھا۔ جہاں تک امیر کے طرز عمل یا کسی قول پر تنقید کرنے کا سوال ہے تو یہ عوام کا حق ہے جسے چھینا نہیں جا سکتا۔ بلکہ حضرت عثمانؓ سے قبل حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ تو خود لوگوں سے اپنے اوپر تنقید کرنے کا مطالبہ کرتے تھے۔ لہٰذا، ان افراد کو جرمِ تنقید میں سزا دینا یقیناً غیر واجب تھا۔ رہا یہ کہ انھوں نے نوجوان یا حفاظتی دستہ کے سالار کو مارا پیٹا تھا تو اس کے لئے تادیبی کارروائی اور واجبی سزا دی جا سکتی تھی۔ جو یا تو تنبیہہ و سرزنش کی شکل میں ہوتی یا قید کے ذریعہ یا پھر قصاص لیا جا سکتا تھا، لیکن ایک دم جلا وطن کر دینا تو بہت بڑا ظلم تھا۔ اس ضمن میں بعض قدما نے توجیہہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ حضرت عمرؓ نے نصر بن حجاج کو مدینہ سے شہر بدر کر دیا تھا کیونکہ انھیں اس کی طرف سے عورتوں کے حق میں فتنہ اور خرابی پیدا کر دینے کا اندیشہ تھا۔ اس اعتبار سے حضرت عثمانؓ یا ان کے امیر کو بھی حق پہنچتا تھا کہ وہ ان اشخاص کو کوفہ سے جلا وطن کر دیتے جن کی طرف سے مسلمانوں کو مبتلائے فساد ہونے کا خطرہ لاحق تھا۔ لیکن نصر بن حجاج کی جلا وطنی درحقیقت پورے معنوں میں جلا وطنی نہ تھی وہ سزا

بھی نہ تھی کیونکہ نصر بن حجاج نے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ اسے خدا کی طرف سے موزوں جسم حسین چہرہ عطا ہوا تھا۔ وہ عورتوں کو پھسلانے، اپنی جانب مائل کر کے دامِ محبت میں گرفتار کرنے کے لئے حد بے اختیار نہ کرتا تھا۔ میرے خیال میں حضرت عمرؓ نے اسے مدینہ چھوڑنے کی ترغیب دی تھی اور اس قسم کا خیال اس پر ظاہر کیا تھا نیز اس سلسلہ میں اسے مالی امداد بھی دی تھی، اس ضمن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے روایاتی تند و تیز لہجہ میں جو در اصل سخت نہ ہوتا تھا کچھ تلقین کی ہو گی۔ تاہم حضرت عمرؓ کے اس اقدام کو بھی سب لوگوں نے پسند نہ کیا تھا۔ میں پھر اپنے قول کو دہرا کر کہتا ہوں کہ حضرت عمرؓ نے اس نوجوان کو نہ جلا وطن کیا تھا اور نہ اسے کوئی سزا دی تھی۔ انھوں نے تو صرف اسے مدینہ سے باہر چلے جانے کی ترغیب دی تھی اور اس ضمن میں اسے مالی امداد کی پیش کش بھی کی تھی۔

لیکن جہاں تک سعید کا تعلق ہے اس نے ان اشخاص کو کوفہ سے چلے جانے پر نہ رضامند کیا اور نہ اس ضمن میں ان کی مالی اعانت کی بلکہ انھیں بزورِ اقتدار جلا وطن کر کے ایسے پردیس میں بھیج دیا۔ جہاں نہ انھیں اطمینان حاصل ہو سکتا تھا اور نہ وہاں کے باشندوں سے انھیں سکون مل سکتا تھا۔ سعید نے خود یا حضرت عثمانؓ نے انھیں حضرت معاویہؓ کے حوالہ کر دیا تاکہ وہ ان کی آزادی ختم کر کے جس طرح مناسب سمجھیں ان کی اصلاح کریں۔ گویا سعید نے انھیں شہر بدر کیا۔ گھر بار سے دور پھینک دیا، مقررہ وظائف سے محروم کیا اور ان کی آزادی ختم کر دی۔ حالانکہ ان سزاؤں میں سے انھیں کسی سزا دینے کا کوئی حق نہ پہنچتا تھا۔ سعید کی مدافعت میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ان افراد کو حقیقی معنوں میں جلا وطن نہ کیا تھا۔ اس لئے کہ انھوں نے ان لوگوں کو ایک اسلامی علاقہ سے دوسرے اسلامی علاقہ میں بھیج دیا تھا اور تمام اسلامی سرزمین مسلمانوں کا گھر ہے۔

لیکن حضرت عثمانؓ کے ہم عصر صحابہ و تابعین نے اس جلا وطنی کو بہر حال ناپسند کیا اور اسے ناجائز جلا وطنی قرار دیا۔ کہنے والے کچھ ہی کہیں بہر صورت امام کو سزا دینے کا حق حاصل ہے لیکن اسے سزا دینے میں مروجہ اور معروف حدود سے تجاوز کا کوئی حق نہیں۔ ہم آگے دیکھیں گے کہ حضرت عثمانؓ کے عمال نے جلا وطنی کی سزا دے کر خود اپنے اوپر اور اپنے امام پر نیز لوگوں پر ظلم کیا۔

حضرت معاویہؓ نے ان جلا وطنوں کو اپنی نگرانی میں لے لیا انھیں ایک کنیسہ میں ٹھہرا کر ان کے لئے حسب ضرورت خرچ مقرر کر دیا۔ اس کے بعد پھر حضرت معاویہؓ نے انھیں مختلف طریقوں سے سدھارنے کی کوششیں کیں۔ ان کے ساتھ مناظرے اور بحثیں کیں، مشورے اور تبادلہ خیالات کئے نصیحتیں کیں مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ حضرت معاویہؓ نے عرب کے مقابلے میں قریش کی فضیلت کے بارے میں بھی مباحثہ کیا لیکن وہ اسے بھی تسلیم نہ کرتے تھے کیونکہ اسلام قریش کو عرب

پر یا دوسرے بنی نوعِ انسان پر کوئی تفضیلت نہ دیتا تھا اگر کوئی فضیلت تھی تو یہ کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ان میں پیدا ہوئے تھے۔ مگر رسولِ خدا کے قریش میں پیدا ہو جانے سے قریش کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ لوگوں پر تسلط جما کر ان کے حاکم بن بیٹھیں یا دوسروں کے مقابلے میں اپنے آپ کوئی امتیازی حیثیت اختیار کرلیں، جیسا کہ وہ عہدِ عثمانؓ میں کر رہے ہیں۔ اور بنابریں کسی صورت میں بھی ایک قریشی امیر کے لئے یہ کہنا جائز نہ تھا کہ سواد کوفہ قریش کا چمنستان ہے۔ اس کے بعد حضرت معاویہؓ نے ان کے ساتھ امام اور اس کے عمال کی اطاعت کے مسئلہ پر بحث کی اس کا بھی ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کیونکہ ان کے خیال میں امام کی اطاعت اس وقت تک روا تھی جب تک کہ امام عدل پر قائم رہے۔ اس کے فیصلے حق پر مبنی ہوں۔ وہ سُنّت کو رواج دے اور بدعت کا قلع قمع کرے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ اگر امام اور اس کے عمّال عدل گستری سے انحراف کریں اور شاہراہ سے ہٹ جائیں تو پھر ان کی اطاعت واجب نہیں ہوتی۔ ازاں بعد معاویہؓ نے خود اپنے بارے میں ان سے تبادلۂ خیال کیا۔ جب بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ان لوگوں نے حضرت معاویہؓ کی ناصحانہ اور حاکمانہ روش پر بھی اظہارِ ناپسندیدگی کیا۔ اور مطالبہ کیا کہ وہ حکومت سے دستبردار ہو جائیں تاکہ اس عہدہ پر کوئی ایسا آدمی فائز ہو جو اُن سے پہلے اسلام لایا ہو۔ جس کا والد اُن کے والد سے زیادہ محترم ہو اور جو شرع و آئین اسلام کو زیادہ بہتر طریقہ پر نافذ کرسکتا ہو۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ ان لوگوں سے فقط مایوس ہی نہ ہوئے بلکہ انہیں خوف لاحق ہوا کہ کہیں یہ فتنہ اہلِ شام میں نہ پھیل جائے۔ حضرت معاویہؓ اہلِ شام سے بہت خائف رہتے تھے۔ لہٰذا، انھوں نے حضرت عثمانؓ کو لکھا کہ مجھے ان جلاوطنوں کو اپنے پاس رکھنے سے معاف رکھا جائے۔ اور حضرت عثمانؓ نے ان کی معذرت قبول کرلی۔ اور ہدایت بھیجی کہ انھیں ان کے وطن کوفہ واپس بھیج دیا جائے۔ لیکن جونہی وہ کوفہ پہنچے انھوں نے سعید۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ کے خلاف زہر اگلنا شروع کردیا۔ یہاں تک کہ ان کی اس فکر نے کسی حد تک عوام کے دلوں میں راہ پیدا کرلی۔ سعید نے حضرت عثمانؓ کو دوبارہ خط لکھا کہ مجھے ان لوگوں کو اپنے علاقہ میں رکھنے سے معذور فرمایا جائے۔ حضرت عثمانؓ نے ان کی معذرت قبول کرلی اور حکم دیا کہ انھیں دوبارہ جلاوطن کرکے جزیرہ میں عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کے پاس بھیج دیا جائے جو حمص و جزیرہ پر حضرت معاویہؓ کی جانب سے حکومت کرتے تھے۔ چنانچہ انھیں عبدالرحمٰن کے پاس بھیج دیا گیا۔ عبدالرحمٰن نے ان کے ساتھ نہایت سخت اور درشت طرزِ عمل اختیار کیا۔ انھیں ذلیل و خوار کرنا شروع کیا۔ ان کے سامنے اپنے والد کی اور قریش کی عظمت و شوکت کی ڈینگیں مارنا شروع کردیں۔ وہ ایسی باتیں بحث ڈھیس اور استدلال کے رنگ میں نہیں بلکہ تحکمانہ تلخ کلامی کی صورت میں کرتا تھا اور عملاً ان باتوں سے بھی زیادہ سختی کا سلوک

کرتا تھا۔ جب وہ سوار ہو کر نکلتا تو انہیں اپنے پیچھے پیدل چلاتا۔ انھیں ڈانٹتا، جھڑکتا، ذلیل کرتا اور لوگوں کے سامنے قابلِ عبرت نمونہ بنا کر پیش کرتا۔ جب یہ بدسلوکی برداشت کی حد سے بڑھ گئی تو انھوں نے ہار مان کر اطاعت و توبہ کا اعلان کر دیا اور اپنی لغزش پر خواستگار معافی ہوئے عبدالرحمٰن نے ان کا قصور معاف کر دیا اور ان کی طرف سے تنہا اشتر کو نمایندہ بنا کر حضرت عثمانؓ کے پاس توبہ واطاعت کی خبر دینے کے لئے بھیج دیا۔ اشتر حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوا کچھ اپنی کہی کچھ ان کی سُنی۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے اسے اجازت دے دی کہ وہ اسلامی مملکت میں جہاں چاہے مقیم ہو جائے اس نے اپنے ساتھیوں کے پاس واپس جانے اور عبدالرحمٰن کے ہاں اقامت گزیں ہونا پسند کیا۔ لیکن یہ اقامت زیادہ دیر نہ رہی۔ کیونکہ ادھر سعید اپنی جگہ کسی اور شخص کو نائب بنا کر حضرت عثمانؓ سے ملنے کے لئے گئے اور ادھر تمام جلا وطن اور علاقہ بدر لوگوں کے گھر والوں نے متحد ہو کر فیصلہ کر لیا کہ اب سعید کو واپس کوفہ میں نہ آنے دیا جائے۔ پھر ان لوگوں نے اپنے شہر بدر اعزہ کو بھی کوفہ بلوالیا اور یہ لوگ تیزی سے کوفہ پہنچ گئے، ان سب نے قسمیں کھائیں کہ جب تک لبس چل سکے گا، سعید کو کوفہ میں داخل نہ ہونے دیں گے ازاں بعد وہ سب جمع ہو کر اشتر کی قیادت میں کوفہ سے نکلے اور مقام جرعہ پہ پہنچ کر سعید کا انتظار کرنے لگے تاکہ اُسے واپس کر دیں۔ اور حضرت عثمانؓ کو مجبور کر دیں کہ انھیں معزول کر کے کسی دوسرے شخص کو ان کا حاکم مقرر کریں۔ ان کی مرضی یہ تھی کہ ابوموسیٰ اشعری کو ان کا والی مقرر کیا جائے۔ آخر حضرت عثمانؓ نے مجبوراً سعید کو کوفہ کی حکومت سے معزول کر دیا۔ یہ تھے وہ حالات جس کے تحت حضرت عثمانؓ کو بامر مجبوری دوبارہ کوفہ کا عامل بدلنا پڑا۔ ولید کو اس لئے کہ لہو ولعب، شراب نوشی میں پڑ گئے، تکبر کرنے لگے، سعید کو اس لئے کہ انہوں نے سختی اختیار کی اور قریشی غیر قریشی میں بیجا امتیاز روا رکھا، ولید کی معزولی کے وقت اہلِ کوفہ نے کوئی نام اپنے نئے حاکم کے لئے تجویز نہ کیا لہٰذا حضرت عثمانؓ نے سعید کو والی مقرر کر دیا، اب کوفہ والوں نے نئے والی کا انتخاب حضرت عثمانؓ پر نہ چھوڑا بلکہ خود ایک صحابی کا نام پیش کر دیا جو یمنی تھے، چنانچہ حضرت عثمانؓ نے ان پر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو والی بنا کر بھیج دیا۔ جس سے وہاں قدرے سکون نظر آیا لیکن یہ سکون زیادہ مدت قائم نہ رہا۔

باب نہم

بصرہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی معزولی

اور

عبداللہ بن عامر کی تقرری

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت عمرؓ کی طرف سے بصرہ کے عامل تھے۔ حضرت عثمانؓ نے انھیں کئی سال تک اس منصب پر برقرار رکھا۔ بعض راویوں کا بیان ہے کہ یہ عرصہ تین برس تھا لیکن اکثریت چھ برس بتاتی ہے۔ بصرہ کے باشندوں میں مُضریوں کی اکثریت تھی اور ان میں زیادہ تعداد بنی ربیعہ کی تھی۔ یمنی قبائل کے لوگ اقلیت میں تھے۔ مگر حضرت عمرؓ نے کسی مصلحت کی بناء پر ایک یمنی شخص کو بصرہ کا حاکم بنا دیا۔ جہاں کے باشندوں کی کثرت مضری قبائل سے تعلق رکھتی تھی اور ایک ثقفی (مغیرہ بن شعبہؓ) کو کوفہ کا والی مقرر کیا جہاں کے باشندوں کی زیادہ تعداد یمنی تھی۔ اسی طرح دو قریشی مضریوں کو شام و مصر کا حاکم مقرر کر دیا جبکہ ان علاقوں میں آباد ہونے والے عربوں کی کثرت یمنی تھی۔ گمان غالب ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ طریق کار اس لئے اختیار کیا تھا کہ وہ عصبیت کا مقابلہ کر سکیں اور اسے مٹا سکیں یہی سبب ہے کہ وہ رعایا اور حاکم کے درمیان قومی تعصب کا اختلاف برقرار رکھتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں حضرت ابوموسیٰؓ کے بصرہ میں کئی سال تک حالات درست رہے اور انتظامات ٹھیک چلتے رہے نہ رعایا نے اپنے حاکم کے خلاف کوئی شکایت کی اور نہ امیر کو اپنی رعایا سے کوئی شکوہ ہوا حضرت ابوموسیٰ کا اصحاب رسول اللہؐ میں بڑا بلند مقام تھا وہ نہایت نیک سیرت منتظم اور فاتح مردِ میدان تھے لیکن حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں تعصب پرستی نے اپنے جلوے دکھانے شروع کر دیئے اور قبائل عرب میں سے ہر قبیلہ خود غرض اور مطلبی ہو گیا تھا۔ اس ضمن میں قریش اور خصوصاً حضرت عثمانؓ کے قرابت دار پیش پیش تھے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس وقت کے چار بڑے صوبوں میں سے تین قریشیوں کے قبضے میں تھے ولید بن عقبہ اور ان کے بعد سعید کوفہ میں، حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان شام میں حضرت عمرو بن عاص اور پھر ان کے

بعد عبداللہ بن سعد بن ابی سرح مصر میں۔

بڑے صوبوں میں سے صرف ایک صوبہ (بصرہ) ایسا تھا جس کی حکومت نہ کسی اموی کے ہاتھ میں تھی اور نہ کسی قریشی یا مضری کے قبضے میں بلکہ وہاں اہل یمن میں سے ایک شخص امیر تھا۔ ابو موسیٰ کا وجود ان والیوں کے درمیان ایک عجیب و بیگانہ حیثیت رکھتا تھا۔ وہ واحد یمنی تھے جو اتنے بڑے اہم علاقے پر حاکم تھے وہ علاقہ جس میں رعایا کی اکثریت مضری تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قریشیوں کی نگاہ میں یہ چیز کھٹک رہی تھی۔ حضرت عثمانؓ کے قرابت دار اس چیز کو دیکھ رہے تھے۔ نیز خود بصرہ کے مضری باشندے اس بات کو محسوس کر رہے تھے۔ ایک راوی کا بیان ہے کہ ایک مضری جو بنی ضبۃ سے تھا اور جس کا نام غیلان بن خرشۃ الضبی تھا حضرت عثمانؓ کے پاس گیا اور کہا "کیا آپ لوگوں کے پاس کوئی لڑکا نہیں جسے حوصلہ دلا کر بصرہ کا حاکم مقرر کر سکیں؟ یہ بوڑھا کب تک بصرہ پہ قابض رہے گا؟" بوڑھے سے مراد حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی ذات تھی اور انھیں حضرت عمرؓ کے بعد وہاں چھ برس ہو رہے تھے۔ غیلان کی بات سن کر حضرت عثمانؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو معزول کر دیا۔ بعض دوسرے مورخین کا بیان ہے کہ کچھ مفتوحہ اضلاع کے باشندوں نے حضرت ابو موسیٰؓ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا چنانچہ حضرت ابو موسیٰؓ نے لوگوں میں تقریر کے ذریعہ جوش جہاد پیدا کیا اور دشمن کی طرف پیادہ پا کوچ کرنے کی ترغیب دلائی۔ چنانچہ کچھ لوگ پیدل ہی چل دیئے۔ لیکن کچھ یہ دیکھنے کے لئے پیچھے کھڑے انتظار کرنے لگے کہ ان کا حاکم اس موقع پر کیا اقدام کرتا ہے۔ جب حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ روانہ ہوئے تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ سوار تھے اور اپنا سامان چالیس خچروں پر لاد رکھا تھا۔ چنانچہ انھوں نے حضرت ابو موسیٰؓ سے کہا کہ ان فالتو خچروں پر ہمیں سوار کر کے لے چلئے تو انھوں نے لوگوں کو ڈانٹا اور وہ ان کے پاس سے واپس ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے ایک وفد حضرت عثمانؓ کے پاس بھیجا کہ حضرت ابو موسیٰؓ کو بصرہ سے ہٹالیں۔ جب حضرت عثمانؓ نے ان سے پوچھا کہ وہ ان کی جگہ کسے چاہتے ہیں تو انہوں نے کوئی نام تجویز نہ کیا اور اتنا کہا کہ جسے بھی آپ چاہیں مقرر کر دیں۔ آپ جسے بھی منتخب کریں گے وہ ابو موسیٰ کا نعم البدل ہو گا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جو کچھ ہمیں معلوم ہے وہ سب کی سب باتیں ہم آپ سے کہنا نہیں چاہتے تاہم انھوں نے الزام لگایا کہ حضرت ابو موسیٰؓ ان کے علاقہ کی پیداوار خورد برد کر رہے ہیں اور اپنے اشعری قبیلہ کو پال رہے ہیں چنانچہ حضرت عثمانؓ نے حضرت ابو موسیٰؓ کو معزول کر دیا اور بصرہ کی حکومت کے لئے اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامر بن کریز کو منتخب کیا۔ عبداللہ والی بن کر جب بصرہ میں پہنچے تو اس وقت ان کی عمر پچیس برس تھی۔

جب اس نوجوان کے والی مقرر ہونے کی اطلاع ابو موسیٰ کو ملی تو انہوں نے کسی قسم کی تنگدلی کا اظہار نہ کیا بلکہ لوگوں سے کہا "تمہارے پاس ایک ہوشیار اور معاملات سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے والا نوجوان آرہا ہے جو نجیب الطرفین ہے

اور جس کے زیر فرمان دونوں فریق متحد رہیں گے۔[1]

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے جو کچھ کہا تھا وہ غلط نہ تھا۔ عبداللہ بن عامر واقعی بڑے ہوشیار اور منتظم قریشی نوجوان تھے وہ بڑے دور اندیش، اولوالعزم طاقت ور، صاحب دبدبہ، اور مشکلات کو حل کرنے والا انسان تھا، انھوں نے اپنے آپ کو اور لوگوں کو فتوحات میں مشغول رکھا، اس ضمن میں سعید بن عاص کے ساتھ ان کا مقابلہ ہوا اور وہ اس سے سبقت لے گئے۔ انہوں نے اپنی رعایا پر بیدار مغزی، سنجیدگی، فیاضی اور اولوالعزمی سے فرمانروائی کی، انھیں بصرہ میں وہ دشواریاں پیش نہ آئیں جو کوفہ میں ولید اور سعید کو پیش آئی تھیں۔ یا جو دشواریاں اہلِ مصر کی جانب سے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو پیش آئی تھیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ ان کی اس کامیابی کا باعث ایک طرف تو ان کا یہ محتاط طرزِ عمل — دور اندیشی اور بالغ نظری تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی رعایا کی اکثریت مضر قبیلہ کی تھی اور حاکم بھی مضری تھا۔ لہٰذا، نہ انھوں نے اسے ناپسند کیا اور نہ اس کے خلاف کوئی آواز اٹھائی لیکن ان سب باتوں کے باوجود عبداللہ بن عامر کا علاقہ فساد سے مکمل طور پر محفوظ نہ رہ سکا جس کی دلیل یہ ہے کہ اہلِ بصرہ میں سے ایک گروہ نے خواہ وہ دوسرے گروہوں کے مقابلہ میں سب سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو حضرت عثمانؓ کی مخالفت میں باقاعدہ حصہ لیا، گویا اس علاقہ کے تمام لوگ حضرت عثمانؓ یا ان کے والی سے راضی نہ تھے، اور بصرہ بھی اُن مشکلات سے بالکل خالی نہ تھا جن کی شکایت کوفہ کو تھی۔ بصرہ سے بھی کچھ لوگ جلاوطن کر کے ایسے ہی شام کی طرف بھیجے گئے جیسے بعض اہل کوفہ کو بھیجا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اہلِ بصرہ میں سے جو لوگ جلاوطن کئے گئے تھے وہ علانیہ جور وستم اور محض بدگمانی کی بنا پر پکڑ لئے گئے تھے اور ان کی مظلومیت امیر معاویہؓ پر بآسانی واضح ہو گئی تھی یہ ہوا یہ کہ ایک چغل خور نے عبداللہ بن عامر کے پاس شکایت کی کہ عامر بن عبدالقیس خدا کی طرف سے حلال کردہ امور میں مسلمانوں کے ساتھ متفق نہیں، وہ گوشت نہیں کھاتے، شادی کو ضروری قرار نہیں دیتے، نماز جمعہ میں بھی شریک جماعت نہیں ہوتے، یہ سن کر عبداللہ بن عامر نے حضرت عثمانؓ کی خدمت میں خط لکھا۔ بعض راویوں کا بیان ہے کہ حضرت عثمانؓ نے عامر کو مدینہ میں طلب کیا لیکن جب پتہ چلا کہ ان کے عائد کردہ الزام بے بنیاد ہیں تو انھیں بڑی عزت کے ساتھ اُن کے وطن واپس بھیج دیا۔ مورخوں کی ایک اور جماعت کا بیان ہے کہ حضرت عثمانؓ نے عامل بصرہ کو لکھا تھا کہ عامر کو حضرت معاویہؓ کے پاس بھیج دیا جائے جب وہ امیر کے سامنے لائے گئے تو اس وقت امیر معاویہؓ کے سامنے دسترخوان بچھا تھا، اور جب ان کی صلاح کی گئی تو وہ دسترخوان کے کھانے میں شریک ہو گئے۔ امیر معاویہؓ

---

[1] الطبری ۳۵ھ کے واقعات دیکھئے۔

نے دیکھا کہ وہ گوشت کھاتے ہیں چنانچہ تمام دروغ ان پر واضح ہوگیا دوسرے الزامات کے بارہ میں بھی امیر معاویہؓ نے اُن سے استفسار کیا جس کے جواب میں عامر نے کہا کہ انھوں نے قصابوں کے ذبح کئے ہوئے جانوروں کا گوشت اس لئے کھانا چھوڑ دیا تھا کہ ایک بار انھوں نے ایک قصاب کو دیکھا کہ ذبح کرتے وقت بھیڑ کے ساتھ نہایت سختی برت رہا تھا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ نمازِ جمعہ پڑھتے ہیں مگر مسجد کے سب سے پائیں حصہ میں شریک نماز ہوتے ہیں اور سب لوگوں سے پہلے نکل جاتے ہیں۔ رہا شادی کا معاملہ تو جب وہ بصرہ سے نکالے گئے ہیں ان کی شادی کے لئے سلسلہ جنبانی ہورہی تھی یہ سن کر امیر معاویہؓ نے چاہا کہ انھیں ان کے شہر واپس بھیج دیں لیکن انھوں نے ایسے شہر کی طرف واپس جانے سے انکار کردیا جہاں کے باشندے غیبت، چغلی اور لوگوں کی جلاوطنی کو حلال سمجھتے ہوں۔ چنانچہ وہ شام ہی میں مقیم رہے اور اپنے طریق زہد وعبادت پر کاربند رہے۔ امیر معاویہؓ انھیں بہت چاہتے تھے۔ جب بھی وہ ملتے ان سے پوچھتے "کسی چیز کی ضرورت تو نہیں" عامر بن عبداللہؒ کا جواب ہمیشہ یہی ہوتا کہ "مجھے کچھ نہیں چاہیئے"۔ جب امیر معاویہؓ نے بہت مرتبہ ان سے یہی سوال پوچھا تو عامر نے ان سے کہا۔ "مجھے یہاں بصرہ کی کچھ گرمی منگوا دیجئے۔ کیونکہ آپ کے اس علاقہ میں مجھے روزہ رکھنا بہت آسان معلوم ہوتا ہے"۔

تاہم میری رائے یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کو بصرہ کے والی عبداللہ بن عامر اور شام کے والی امیر معاویہؓ کے سوا اور کوئی والی ایسا میسر نہ آیا جو اُن کی جانب سے رعیت کا انتظام بطرزِ احسن کرسکتا۔

ہم عراق کے دونوں صوبوں کو دیکھ چکے، آئیے اب یہ معلوم کرلینے کے بعد ہم شام کا جائزہ لیں۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ عبداللہ بن عامر سے لوگوں کو اس کے سوا کوئی شکایت نہ تھی کہ وہ حضرت عثمانؓ کے قرابت داروں میں سے تھے اور نوعمر تھے جو حضرت ابوموسیٰؓ جیسے بزرگ کے بعد آئے تھے۔ پھر یہ کہ لوگوں کے ساتھ ان کا طرزِ عمل قریش نوازی لئے ہوئے تھا جو شائد اصحاب رسول اللہ کے طرزِ عمل سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ لیکن مضریوں کے تعصب، فتوحات میں ان کی بلند نگاہی اور مالِ غنیمت سے متعلق ان کی شدید حرص سے وہ ضرور مطابقت رکھتا تھا۔

شاید عبداللہ بن عامر جانتے تھے کہ لوگ ان کی گورنری پر کیوں خفا ہیں اور اسی لئے وہ مخالفین پر یہ ظاہر کرنے کی امکانی کوششیں کرتے تھے کہ وہ حکومت کی ان ذمہ داریوں کو اٹھانے کے اہل اور قابل ہیں۔ اس کوشش میں بعض اوقات وہ دین کی حدود بھی پھاند جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار وہ علاقہ فتح کرتے ہوئے دور اپنے مطلوبہ مقام تک نکل گئے اس پر ان سے کہا گیا کہ آپ کے برابر وسیع پیمانے پر اب تک کسی نے فتح نہیں کی تو انہوں نے کہا، واقعتہً

یہ بالکل صحیح ہے اور میں نے طے کر لیا ہے کہ جہاں پہنچ کر رکوں گا وہیں سے خدا کا شکریہ ادا کرنے کے لئے عمرہ کا احرام باندھ لوں گا۔ چنانچہ اس بات پر کہ انھوں نے فارس کے دور دراز علاقوں سے ہی احرام باندھ لیا تھا حضرت عثمانؓ نے انھیں ملامت بھی کی تھی، کیونکہ احرام باندھنے کے لئے مختلف علاقوں سے آنے والوں کے لئے مختلف مقامات متعین ہیں اور اُن مقامات پر پہنچنے سے پہلے جو آدمی احرام باندھ لے وہ اپنے آپ پر زیادتی کرتا ہے، یہ واقعہ خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عبداللہ بن عامر دنیا اور دین دونوں اعتبار سے لوگوں کو اپنا مداح بنانے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

باب دہم

شام کے وسیع علاقہ پر حضرت معاویہؓ کا اقتدار

عہدِ عثمانؓ کے تمام والیوں میں ہر اعتبار سے امیر معاویہ سب سے خوش نصیب والی تھے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں دمشق کا والی مقرر کیا تھا۔ جب ان کا بھائی یزید بن ابی سفیان جو اُردن کا والی تھا فوت ہو گیا تو حضرت عمرؓ نے اس کا علاقہ بھی امیر معاویہؓ کے سپرد کر دیا۔ اس پر ابوسفیان نے حضرت عمرؓ کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے مدنظر نہ تو امیر معاویہ کی طرفداری تھی نہ وہ ابوسفیان کے ایک بیٹے کے مرنے پر اس کا علاقہ دوسرے بیٹے کو دے کر اس کی تعزیت وتسلی کا سامان کر رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کے طریق کار سے خوش تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت معاویہؓ قابل اور محتاط و دوراندیش ہیں۔ چنانچہ محض اس خیال سے انھوں نے حضرت معاویہؓ سے اُردن کا انتظام سنبھالنے کے لئے کہا اور حضرت معاویہؓ نے بخوبی وہاں کا انتظام سنبھال لیا۔ جب حضرت عمرؓ کی وفات ہوئی تو امیر معاویہؓ ان دونوں صوبہ کے والی تھے۔ اور حضرت عثمانؓ نے انہیں ان دونوں علاقوں پر بحال رکھا جیسا کہ اپنی خلافت کے پہلے سال میں انہوں نے حضرت عمرؓ کے مقرر کردہ تمام عمال کو بحال رکھا تھا۔ بعد میں جب عبدالرحمٰن بن علقمہ کنانی جو حضرت عمرؓ کی جانب سے فلسطین کے والی تھے فوت ہوئے تو حضرت عثمانؓ نے فلسطین کا علاقہ بھی امیر معاویہؓ کے حوالے کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد حضرت عمرؓ کے مقرر کردہ والی حمص بیمار ہو گئے اور انھوں نے حضرت عثمانؓ سے سبکدوشی کی درخواست کی۔ انھوں نے وہ درخواست قبول کر کے حمص بھی امیر معاویہ کے حوالے کر دیا۔ اس طرح سارا ملک شام امیر معاویہ کے زیرنگین آگیا۔ اور وہ عہد عثمانؓ کے تمام عمال میں سب سے زیادہ اہمیت اور بلند مرتبہ والے عامل بن گئے۔ کیونکہ ان کے زیر اقتدار چار صوبے جمع ہو گئے تھے اور اپنے جغرافیائی مرکز کے نقطۂ نظر سے وہ غیر معمولی طور پر طاقتور بن گئے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی مملکت حجاز اور مصر کے درمیان واقع تھی۔ حجاز میں آستانۂ امیرالمؤمنین ومرکزِ خلافت تھا اور مصر وہ مملکت تھی جو قوت و دبدبہ کے اعتبار سے شام کا مقابلہ کر رہی تھی۔ ویسے شادابی و زرخیزی میں تو شام سے بڑھی ہوئی تھی ہی۔

مزید برآں شام کی مملکت ساحل بحرِ روم اور رومن حکومت کی سرحد پہ واقع تھی لہٰذا امیر معاویہؓ خلیفہ سے مدد لے بھی سکتے تھے اور دے بھی سکتے تھے۔ اسی طرح وہ مصر کو مدد دینے اور وہاں سے مدد لینے پر بھی قادر تھے۔ پھر ان کے سامنے جہاد کے دو بڑے دروازے وا تھے۔ ایک طرف سمندر اور دوسری طرف خشکی میں رومن حکومت کی سرحد۔ چنانچہ وہ سلطنت کی شان بھی بڑھا سکتے تھے اور اپنی بھی۔ اسلام کا بول بھی بلند کر سکتے تھے اور اپنے لئے بھی ایک ایسی مجد و عظمت کی بنیاد ڈال سکتے تھے جس کا مقابلہ اور کوئی عامل نہ کر سکتا تھا۔

امیر معاویہ کا دورِ حکومت مدتِ دراز تک شام پر رہا۔ انھوں نے تمام عہدِ فاروقی وہیں گزارا اور عہدِ عثمان میں بھی مملکت شام کا بخوبی جائزہ لیا۔ انھیں اہلِ شام سے اور اہلِ شام کو ان سے محبت ہو گئی تھی۔ دونوں خلیفہ بھی ان سے راضی تھے، مدتِ دراز تک حکومت کرتے رہنے اور رعیت کے دلوں میں اثر و رسوخ پیدا کر لینے کی وجہ سے امیر معاویہؓ گورنر سے زیادہ بادشاہ معلوم ہوتے تھے۔ تاریخ خلافت میں کوئی والی ایسا نظر نہیں آتا جو اتنی طویل مدت تک مسلسل اتنے وسیع علاقہ کی حکومت پر فائز رہا ہو اور جس کا علاقہ اس طرح بتدریج پھیلتا رہا ہو جیسے کہ حضرت معاویہ کا علاقہ پھیلتا رہا۔ لہٰذا، اگر حضرت معاویہؓ کو اپنی طرف سے اطمینان اور اپنے اوپر ناز تھا تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی جب کہ وہ آئے دن اپنے اردگرد کے صوبوں کے والیوں کو عہدِ فاروقی و عثمانی میں وقتاً فوقتاً معزول ہوتے دیکھ رہے تھے۔ لیکن خود کو اپنی جگہ برقرار و بحال پاتے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ بعض دوسرے علاقے بھی اپنے علاقہ میں شامل ہوتا دیکھ رہے تھے۔

اگر حضرت معاویہؓ اپنے فرائضِ منصبی میں کوتاہی کرتے یا رعایا پر ستم ڈھاتے تو حضرت عمرؓ انھیں کبھی بحال نہ رکھتے اور اگر کوئی قابلِ عقوبت فعل ان سے سرزد ہوتا تو سزا سے بھی باز نہ رہتے۔ گمان غالب یہ ہے کہ امیر معاویہؓ نے حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد عہدِ عثمانی میں بھی اہلِ شام کے ساتھ اپنے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہ کی تھی۔ جب سخت گیر اور محتاط خلیفہ ان کے طرزِ عمل سے راضی تھا تو نرم خو، عافیت پسند اور درگزر کرنے والے خلیفہ کے عہد میں اسی طرزِ عمل کو برقرار رکھنے میں انھیں کوئی حرج محسوس نہ ہوا۔ یہی باعث ہے کہ اہلِ شام دوسرے صوبوں کے باشندوں کے ساتھ عمال کے خلاف اتہام تراشی و تشہیر میں شریک نہ ہوئے اور نہ انھوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف کسی کارروائی میں حصہ لیا۔ وہ لوگ جنھوں نے حضرت عثمانؓ کا محاصرہ کیا تھا وہ کوفہ، بصرہ اور مصر سے آئے تھے ان میں شامی ایک بھی شامل نہ تھا۔ نیز یہی سبب تھا کہ حضرت عثمانؓ جب بھی اپنے مخالفوں یا اپنے عمال کے دشمنوں کو علاقہ بدر کرتے تو ہمیشہ انھیں شام ہی میں بھیجتے۔ اس حکمتِ عملی سے خود اہلِ مدینہ بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ آپ دیکھیں گے کہ جب حضرت عثمانؓ حضرت ابوذر غفاریؓ سے تنگ آ گئے تو انھیں حکم دیا کہ وہ خود کو دیوانِ شام کے ساتھ وابستہ رکھیں کیونکہ حضرت ابوذرؓ جب فارسی

کی حیثیت سے شام کی جانب گئے تھے تو اس وقت ان کا نام دیوان شام ہی میں درج کر لیا گیا تھا۔ اسی لئے حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوذرؓ کی دعوت و تبلیغ سے مدینہ والوں میں خطرہ محسوس کرتے ہوئے انھیں شام کی جانب ہی لوٹا دیا تھا۔ گویا حضرت معاویہ کا دوراندیشانہ طرزِ عمل ہی ایسا واحد ملجا تھا جس کا حضرت عثمانؓ کو اپنے اور اپنے عمال کے شدید مخالفوں کی تادیب کے وقت آسرا ہوتا تھا۔ ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ امیر معاویہؓ بہت ہی دوراندیش و محتاط تھے حتیٰ کہ خود حضرت عثمانؓ کے بارے میں بھی۔ چنانچہ جب حضرت عثمانؓ کے فرستادہ سرکش جلا وطنوں کی اصلاح و درستی سے وہ مایوس ہو جاتے تو حضرت عثمانؓ کو لکھ دیتے کہ میں ان لوگوں کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتا لہٰذا، مجھے معاف فرمایا جائے ـــــ اور حضرت عثمانؓ ان کی کسی درخواست کو رد نہ کرتے تھے۔

امیر معاویہؓ نے اپنی خوش نصیبی سے فائدہ اٹھانے میں کبھی کوتاہی نہ کی۔ انھوں نے شام میں اپنے آپ کو آرام سے محض انتظامِ سلطنت تک محدود کر ناپسند نہ کیا ان کا نفس شدّت سے انھیں فتوحات بڑھانے پر مائل کرتا تھا۔ عہد عمرؓ میں ان کی حیثیت اس گھوڑے کی سی تھی جو شوقِ ترکتاز کے جذبۂ بے اختیاری کی وجہ سے اپنی لگام چبا رہا ہو۔ مگر حضرت عمرؓ نے انھیں تھامے رکھا۔ اور آگے بڑھنے نہ دیا سمندر انھیں باصرار اپنی طرف بلا رہا تھا انھوں نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں کئی بار بحری لڑائی کے لئے اجازت طلب کی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے بڑی سختی سے انھیں روک دیا اور ایک بار تو تنبیہہ کے ساتھ انھیں آئندہ سمندر کی بابت کچھ لکھنے سے منع کر دیا۔ جب حضرت عثمانؓ مسند افروز خلافت ہوئے تو امیر معاویہؓ نے ان سے بھی وہی درخواست کی جو وہ حضرت عمرؓ سے کیا کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے انہیں اس شرط پر اجازت دے دی کہ غازیوں کا انتخاب امیر معاویہؓ خود نہ کریں اور نہ لشکروں کے لئے قرعہ اندازی کریں، بلکہ لوگوں کو آزاد و خود مختار چھوڑ دیا جائے جو آدمی بحری مہم میں شریک ہونے پر رضامند ہو۔ اسے لے جایا جائے اور جو رضامند نہ ہو اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ تھوڑی ہی مدت گذر رہی تھی کہ امیر معاویہؓ نے ایک بحری بیڑہ تیار کر لیا اور پھر پچاس یا شائد اس سے بھی زیادہ بحری جنگیں لڑیں۔ یہ دیکھ کر والیٔ مصر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی رگ حمیت بھی پھڑکی چنانچہ وہ بھی امیر معاویہ کی تقلید کرنے لگ گئے۔ یہاں تک کہ مورخین کے بیان کے مطابق شام سے امیر معاویہؓ سائپرس پر حملہ آور ہوئے اور مصر سے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح۔ غرض دونوں لشکروں کا اس جزیرہ میں اتصال ہوا۔

شام سے ملی ہوئی رومن حکومت کی بری سرحدوں کی حفاظت امیر معاویہؓ کے سپرد تھی۔ چنانچہ وہ گرما و سرما میں دشمنوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔ انھیں ان مہموں سے اتنا مالِ غنیمت وغیرہ میسر آجاتا تھا کہ لشکریوں کے دل مسرور ہو جاتے اور بیت المال معمور ہو جاتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عثمانؓ نے ہی امیر معاویہؓ کے لئے راستہ ہموار کیا کہ وہ ایک دن خلافت کو آلِ ابی سفیان میں منتقل کرنے اور اسے بنی اُمیّہ میں جما دینے پر قادر ہو گئے۔ کیونکہ حضرت عثمانؓ ہی تھے جنھوں نے حضرت امیر معاویہؓ کی مملکت کو فلسطین وحمص کے انضمام سے وسعت دے کر ان کے لئے شامی وحدت مہیّا کر دی جس کی حدود و ثغور دور دراز تک پھیلی ہوئی تھیں۔ انہی نے چار ولایتوں کو امیر معاویہؓ کے زیرِ اقتدار جمع کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کے عساکر جملہ مسلم عساکر سے قوی تر ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں امیر معاویہؓ کی مدتِ ولایت میں اسی طرح ڈھیل دی جس طرح حضرت عمرؓ نے دی تھی اور شام میں انھیں اس قدر آزادی دے دی جو حضرت عمرؓ نے نہ دی تھی۔ جب ظہورِ فتنہ ہوا تو امیر معاویہؓ نے دیکھا کہ سب سے پُرانے والی وہی ہیں۔ سب سے قوی لشکر انہی کے پاس ہیں اور رعیت کے دلوں پر سب سے زیادہ قبضہ انہی کا ہے۔

حضرت عثمانؓ اگر چاہتے تو حضرت عمرؓ کے طریقِ کار پر کاربند رہ سکتے تھے یعنی امیر معاویہؓ کو دمشق و اردن پر بحال رہنے دیتے اور حمص و فلسطین کی دونوں ولایتوں کو براہِ راست مدینہ منورہ کے ماتحت رکھتے اگر وہ ایسا کرتے تو ایک طرف حضرت عمرؓ کے طریقِ کار کو بحال رکھتے اور دوسری طرف عمر رسیدہ صحابیوں اور عرب نوجوانوں میں سے جو منصبِ حکمرانی کے خواہش مند ہوتے ان کے لئے منصب مہیّا کر سکتے اور اس طرح ان لوگوں کی بیکاری۔ ناراضگی کا ازالہ ہوتا اور بغاوت و انقلاب برپا کرنے والوں کو موقع نہ ملتا۔ علاوہ ازیں اس کا فائدہ یہ بھی ہوتا کہ ظہورِ فتنہ کے وقت امیر معاویہؓ اس خود بینی وخود پرستی کا اقدام نہ کرتے جو اُن سے ہوا، اور مسلمانوں کو اصولاً باہمی مشورہ سے اپنے مسائل کے حل کرنے کا موقع میسر آجاتا۔ لیکن اس عظیم و وسیع مملکت نے امیر معاویہ کو وہ مضبوطی عطا کی کہ انھوں نے بڑی آسانی سے لشکر بھیج کر مصر کو دارالخلافت سے الگ کر دیا، اور پھر حجاز اور بعد ازاں دیگر بلادِ عرب میں ایسے لوگوں کو روانہ کر دیا جو وہاں حکومت کرنے لگیں اور اس طرح حضرت علیؓ کی راہیں مسدود کر دیں۔ اور آخر ایک روز حضرت علیؓ نے دیکھا کہ امیر معاویہؓ نے سلطنت کے بہترین علاقوں کو اپنے زیرِ اقتدار کر لیا ہے۔ اس تمام صورتِ حال کی صرف دو چیزیں ذمہ دار تھیں اوّلاً حضرت معاویہؓ کی مہارت و پختہ کاری ثانیاً ان کی عملداری کی عظمت و وسعت۔

گیارھواں باب

مصر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں

حضرت عمرو بن العاصؓ کی معزولی اور عبداللہ بن سعد کا تقرر

شام کو چھوڑ کر مغرب کی طرف بڑھیں تو مصر آجاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی وفات کے وقت وہاں حضرت عمرو بن العاصؓ والی تھے۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت عمرؓ کے دوسرے عمال کی طرح انھیں بھی اپنے عہدہ پہ برقرار رکھا لیکن ابھی ایک برس بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ حضرت عثمانؓ کے قرابت داروں نے مصر کی طرف حریص اور قہر آلود نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کی مصر سے معزولی اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی تقرری کے مسئلہ پر مؤرخین مختلف الرائے ہیں۔ ایک جماعت کا بیان ہے کہ مصریوں نے حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حضرت عمرو بن العاصؓ کی شکایت کی تھی اس لیے انھیں معزول کر دیا گیا۔ دوسروں کا خیال ہے کہ انھیں مصریوں کی ناراضگی اور بیزاری کی وجہ سے معزول نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ حضرت عثمانؓ نے ایک پوشیدہ مقصد کے تحت ایک حاکم کو معزول کر کے اس کی جگہ دوسرا مقرر کر دیا تھا لیکن واضح امر یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو کسی عظیم فرض کی انجام دہی کے لئے عرصہ سے تیار کر رہے تھے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت عمرو بن عاصؓ نے افریقہ پہ یورش کی اور کچھ مالِ غنیمت لے کر لوٹ آئے۔ اصولاً یہ لازم تھا کہ حضرت عثمانؓ کی طرف سے ان کے والی کو ہمسایہ سرحدی علاقوں میں یورش کرنے کی آزادانہ اجازت ہوتی۔ تاکہ ان یورشوں سے اوّلاً وہاں کے حالات کا جائزہ لیا جاتا اور پھر مکمل فتح حاصل کی جاتی۔ یہی وہ طریقہ تھا جس پر والیان کوفہ و بصرہ و شام چل رہے تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت عمرو بن عاصؓ کو ایسی مہموں سے روک دیا اور افریقہ میں ایک ایسا لشکر بھیجا جو والیٔ مصر کے زیرِ اقتدار نہ تھا بلکہ اس کا تعلق خلافِ معمول حضرت عمرؓ سے بالا بالا براہِ راست مدینہ کی مرکزی حکومت سے تھا۔ حضرت عثمانؓ نے اس لشکر کا سردار عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مقرر کر کے ان سے کہا" اگر تم افریقہ فتح کر لو تو غنیمت کے خمس (۱/۵) میں سے خمس تمہارا ہے"۔

اس بات سے حضرت عمرو بن عاصؓ کا ناراض ہونا طبعی امر ہے۔ کیونکہ حضرت عثمانؓ نے اپنے اس عمل سے حضرت عمروؓ کو ان کے ہم مرتبہ دوسرے والیوں سے کمتر درجہ دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے سرحدوں کی طرف براہِ راست کبھی لشکر روانہ نہ کئے تھے۔ یہ کام عمال کا تھا۔ حضرت معاویہؓ رومیوں کے خلاف اور عامل بصرہ وکوفہ بلادِ فارس کے خلاف برسرِپیکار رہتے تھے۔ خلیفہ سے مشورہ ضرور لیتے تھے لیکن سربراہی ونگرانی انہیں کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ کوئی کام بھی ان سے بالا بالا اور ان کی رائے لئے بغیر نہیں کیا جاتا تھا۔

حضرت عثمانؓ نے فتح افریقہ کی نیت سے لشکر جمع کیا۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو اس کا سپہ سالار مقرر کر کے صحابہ کرامؓ میں سے چند بزرگ، نوجوانانِ قریش کی ایک جماعت اور بہت سے انصار کو ان کے ہمراہ کر دیا۔ نیز انہیں حکم دیا کہ جب وہ فتح افریقہ سے فارغ ہو چکیں تو بحری راستے سے لشکر کو اندلس کی مہم پر بھیج دیں۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے افریقہ فتح کر لیا۔ وہاں انہیں بڑی غنیمت ملی جو انھوں نے لوگوں میں تقسیم کر دی۔ خمس کا خمس انھوں نے اپنے لئے رکھ لیا اور باقی حضرت عثمانؓ کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ کہا گیا ہے کہ ان کے حصّہ کا یہ خمس کا پانچواں حصّہ مروان بن حکم نے ایک لاکھ یا دو لاکھ دینار میں خرید لیا جس میں سے کچھ قیمت اس نے ادا کی اور باقی قیمت حضرت عثمانؓ نے انھیں ہدیتہً دے دی۔ راویوں کا بیان ہے کہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے ساتھ حضرت عثمانؓ کے اس ترجیحی سلوک کی وجہ سے اہلِ لشکر بگڑ بیٹھے اور انہوں نے حضرت عثمانؓ کے پاس ایک وفد بھیجا کہ وہ اس معاملہ پر ان سے تبادلۂ خیال کریں۔ حضرت عثمانؓ نے اہلِ وفد سے کہا کہ عبداللہ نے جو کچھ زیادہ لیا ہے میں نے انھیں اس کی اجازت دے رکھی تھی اگر آپ اسے منظور کریں تو ٹھیک ہے بصورت دیگر وہ سب کچھ واپس لے لیا جائے گا۔ اہلِ وفد نے کہا ہم راضی نہیں ہیں۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے فرمایا "تو وہ مال واپس ہو جائے گا"۔ اہلِ وفد نے کہا آپ اسے ہماری سپہ سالاری سے معزول کر دیں کیونکہ اس واقعہ کے بعد ہمارے باہمی تعلقات اچھے نہیں رہ سکتے۔ حضرت عثمانؓ نے ان کی استدعا قبول کر لی اور عبداللہ کو مالِ غنیمت کی واپسی اور سپہ سالاریٔ افریقہ سے معزولی کا خط لکھ دیا اس کے بعد عبداللہ مصر کی طرف دل میں کچھ افسوس و نامرادی کے جذبات لئے لوٹ آئے۔ خدائے تعالےٰ نے ان کے ہاتھوں ایک بہت بڑا ملک فتح کرایا تھا لیکن انھیں اپنے اس مفتوحہ ملک سے واپس نکال لیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ انہیں حضرت عثمانؓ کی طرف سے دیا ہوا عطیہ بھی اپنے پاس محفوظ رکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت عثمانؓ کے رشتہ دار اس واقعہ پر عبداللہ کی حمایت میں برافروختہ ہوئے اور انہوں نے اس چھنے ہوئے مال سے بہتر معاوضہ دلائے بغیر چین سے بیٹھنا اپنے لئے حرام کر لیا، وہ حضرت عثمانؓ کے پیچھے پڑ گئے حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ نے انہیں مصر کا والیٔ خراج

مقرر کر دیا اور حضرت عمرو بن عاصؓ کو صلوٰۃ و حرب کا والی رہنے دیا۔ دونوں والیوں کے مابین اختلاف کا رونما ہونا لابدی امر تھا۔ ہو سکتا ہے حضرت عمرو بن عاصؓ ہی نے لوگوں کو عبداللہ بن سعد کے خلاف بھڑکایا ہو جس کی وجہ سے حضرت عثمانؓ نے ان سے اپنا عطیہ بھی واپس لے لیا تھا انہیں افریقہ کی سپہ سالاری سے بھی معزول کر دیا تھا۔ بہرحال دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جذبات بھڑک گئے۔ عبداللہ نے حضرت عثمانؓ کی خدمت میں تحریر کیا کہ عمروؓ نے میرے خراج کے معاملہ میں رخنہ اندازی کی ہے اور حضرت عمروؓ نے یہ لکھا کہ عبداللہ نے میری جنگی تیاریوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ عبداللہ کو مدینہ شریف واپس بلا لیتے اور حکومت مصر عمروؓ کے ہاتھوں میں رہنے دیتے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ آخری دم تک حضرت عمروؓ کی حکومت سے خوش تھے اور اگر تغیر و تبدل کے بغیر اور کوئی چارۂ کار نہ تھا تو حضرت عثمانؓ پر فرض تھا کہ دونوں کو معزول کر دیتے اور کسی دوسرے شخص کو خواہ وہ کوئی قریشی ہو یا غیر قریشی مصر کا حاکم مقرر کر دیتے اس طریقہ سے عمروؓ کے دل میں آتش غیرت شعلہ زن نہ ہوتی اور قریش کی باہمی منافشت بھی کچھ مدت کے لئے ٹل جاتی۔ لیکن ہوا یہ کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت عمروؓ کو معزول کر کے عبداللہ کو والی خراج کے علاوہ والی صلوٰۃ و حرب بھی بنا دیا۔ اور اس طرح انہوں نے حضرت عمروؓ کو اپنا دشمن بنا لیا۔

حضرت عمروؓ کے ساتھ حضرت عثمانؓ کا سلوک یہیں تک محدود نہ رہا۔ بلکہ انھوں نے کبھی اشارۃً اور کبھی صراحتاً ان پر بددیانتی کا الزام بھی لگایا۔ ایک دن حضرت عمروؓ روئی دار جبہ پہنے حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے انہوں نے پوچھا اس جبہ میں کیا ہے۔ حضرت عمروؓ نے جواب دیا۔ "عمرو" حضرت عثمانؓ نے کہا میں نے یہ نہیں پوچھا یہ تو میں جانتا ہوں کہ اس جبہ میں آپ ہیں۔ میں نے یہ دریافت کیا تھا کہ جبہ میں روئی بھری ہوئی ہے یا کوئی اور چیز؟

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے حضرت عثمان کو مصر سے بہت سا مال بھیجا۔ اسی اثنا میں حضرت عمرو بھی آنکلے۔ حضرت عثمانؓ نے کہا "عمرو! کیا آپ کو علم ہے کہ آپ کے بعد اس اونٹنی نے خوب دودھ دینا شروع کر دیا ہے؟ حضرت عمرو نے کہا "ہاں! لیکن اس کے بچوں کی حالت تباہ ہو رہی ہے" حضرت عثمانؓ کا مطلب یہ تھا کہ حضرت عمروؓ ان سے بالا بالا کچھ مال روک رکھتے تھے اور حضرت عمروؓ کے جواب کا مطلب یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کا عامل اہل مصر پر ناقابل برداشت بار ڈال رہا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ عبداللہ بن سعد کھرے آدمی نہ تھے۔ مسلمان ان سے خوش نہ تھے وہ ان آدمیوں میں سے تھے جنہوں نے رسول خدا کو سخت اذیت پہنچائی تھی اور آپؐ کا بہت تمسخر اڑایا تھا۔ خود قرآن نے ان کے کفر کی شہادت دی ہے اور اُن کی مذمت کی ہے[1]۔ عبداللہ قرآن کا بھی مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اور کہا کرتا تھا کہ عنقریب میں بھی خدا کے قرآن

[1] ۔ قرآن میں عبداللہ بن سعد کا نام نہیں آیا۔

کا سا ایک قرآن نازل کرنے والا ہوں۔ رسولِ خدا نے فتح مکہ کے دن ان کا خون مباح کر دیا تھا لیکن حضرت عثمانؓ انہیں مسلمان بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں لے آئے تھے[1]۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مصر میں عبداللہ کا طرزِ عمل اہلِ مصر کے لئے خوش کن نہ تھا اور جیسا کہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے کنایۃً کہا تھا وہ مصری عوام کو ان کی طاقت سے زیادہ زیر بار کرتے تھے، گمان اغلب یہ ہے کہ وہ غیر قریشی مصری عربوں سے مغرورانہ و متکبرانہ انداز میں پیش آتے تھے جس کے باعث وہ لوگ ان سے برہم و دل برداشتہ تھے۔ حتیٰ کہ انھوں نے حضرت عثمانؓ سے ان کی شکایت کی، جس پر حضرت عثمانؓ نے ایک خط میں انھیں بڑی سخت ڈانٹ پلائی اور حکم دیا کہ وہ ایسی حرکت سے باز رہیں جس سے رعیت کا دل دکھتا ہو لیکن انھوں نے اس تنبیہہ کی کوئی پرواہ نہ کی بلکہ شکایت کرنے والوں کو سزا دی یہاں تک کہ ایک شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ دیکھ کر مصریوں کے علاوہ اصحابِ رسولؐ بھی آگ بگولا ہو گئے۔ اور انھوں نے حضرت عثمانؓ پہ اتنا شدید دباؤ ڈالا کہ آخر انہوں نے عبداللہ کو معزول کر کے محمد بن ابی بکرؓ کو مصر کا والی مقرر کر دیا۔ نیز ان کے ہمراہ مہاجرین و انصار کی ایک جماعت بھیجی کہ وہ مصریوں اور عبداللہ کے باہمی مناقشات کی تحقیق کریں۔ اصل میں اس چیز کا مطالبہ حضرت علیؓ نے کیا تھا کہ عبداللہ کو معزول کر کے ان کے خلاف عائد کردہ الزامات قتل کی تحقیقات کی جائے۔ اگر وہ مجرم ثابت ہوں تو اُن سے قصاص لیا جائے۔ حضرت عثمانؓ کی طرف سے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کا والی مقرر ہونا مسلمان قوم کی بہت بڑی بدنصیبی تھی کیونکہ حضرت عثمانؓ کے خلاف باغیوں کا پہلا گروہ مصر ہی سے پہنچا تھا، ازاں بعد کوفہ و بصرہ کے باغی ان میں شامل ہو گئے۔ بایں ہمہ عبداللہ بن سعد بڑے بہادر، جری اور فتح مند مردِ میدان تھے۔ انھوں نے رومیوں سے افریقہ خالی کرا یا۔ سائپرس کی جنگوں میں شرکت کی۔ اور رومی بیڑے کو بمقام ذات الصواری شکست فاش دی۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ دنیا دار تھے، دیندار نہ تھے۔

---

[1] اسلام لانے کے بعد زمانہ جاہلیت کے تمام جرائم معاف ہو جاتے تھے۔

بارھواں باب

دو نوجوان

دو قریشی نوجوان مصر میں

حضرت عثمانؓ اور ان کے مصری گورنر کی سیاست کا قصہ اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک کہ ہم ان دو قریشی نوجوانوں کا ذکر نہ کریں جن کا اس سیاست کو بغاوت کے انجام تک پہنچانے میں بڑا ہاتھ تھا۔ وہ نوجوان محمد بن ابی حذیفہ اور محمد بن ابی بکرؓ ہیں۔ محمد بن ابی حذیفہ معزز باپ کا معزز بیٹا تھا۔ اس کے والد قبیلۂ قریش میں عالی نسب اور قریشی سرداروں میں بلند رتبہ سردار تھے۔ ابو حذیفہ کا باپ عتبہ بن ربیعہ ہند کا باپ تھا جو ابوسفیان کی بیوی اور امیر معاویہؓ کی ماں تھی۔ ابو حذیفہ ان افراد میں سے تھے جو پہلے پہل نبی اکرمؐ کے دارالارقم میں داخل ہو کر دعوتِ اسلام دینے سے قبل مسلمان ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنی اہلیہ سہلہ بنت سہیل بن عمرو کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی اور وہاں سے دوسرے مہاجرین کے ہمراہ مدینہ شریف پہنچے۔ پہلے پہل اسلام لانے، حبشہ اور پھر وہاں سے مدینہ شریف کی جانب ہجرت کرنے کے باعث وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اسلام کی راہ میں سخت آزمائشوں کا نہایت ثابت قدمی اور خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ وہ جنگ بدر میں شریک ہوئے اور بڑی مردانگی یقین و ایمان کے ساتھ صف آراء ہوئے۔ حتیٰ کہ انھوں نے اس کارزار میں خود اپنے والد کو دعوتِ مبارزت دی۔ اسی طرح مابعد کی تمام جنگوں میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے دوش بدوش شریک رہے۔ آخر انھوں نے حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں یمامہ کی جنگ لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ ان کا یہ لڑکا محمد حبشہ میں پیدا ہوا تھا اور ابھی یہ نوعمر ہی تھا یعنی بمشکل چودہ برس کا سن ہوگا کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

باپ کی وفات کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس کے کفیل و مربی ہو گئے جوانی میں بھی محمد حضرت عثمانؓ کی زیر نگرانی رہے۔ جب حضرت عثمانؓ مسند آرائے خلافت ہوئے تو اسے گمان تھا کہ دوسرے قریشی نوجوانوں خصوصاً حضرت عثمانؓ کے قرابت داروں کی طرح اسے بھی جلد ہی چھوٹے بڑے حکومت کے کسی منصب پر متعین کر دیا جائے گا۔ لیکن یہ نوجوان

جیساکہ راویوں کا بیان ہے دین پر سختی سے کاربند نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے شراب پی تھی اور حضرت عثمانؓ نے اسے شراب نوشی پر سزا دی تھی۔ یہ بات مبنی بر حقیقت ہو یا نہ ہو ۔ بہر حال اہم امر یہ ہے کہ ایک روز اس نے حضرت عثمانؓ سے مطالبہ کیا کہ اسے کسی منصب پر متعین کیا جائے۔ حضرت عثمانؓ نے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ اگر مجھے تم میں اہلیت نظر آتی تو کہیں حاکم مقرر کر دیتا لیکن تم اس معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ اس پر نوجوان نے حضرت عثمانؓ سے سیر و سیاحت کے لئے مدد مانگی۔ حضرت عثمانؓ نے اعانتاً کچھ مال دے دیا اور اجازت دی کہ دوسروں کی طرح جہاں چاہے چلا جائے یہ نوجوان مصر چلا گیا اور اس میں شک نہیں کہ حضرت عثمانؓ کے پاس سے ناراض ہو کر نکلا تھا۔ یا تو اس لئے کہ انھوں نے اسے شراب نوشی کی سزا دی تھی یا اس وجہ سے کہ انھوں نے اسے حکومت کے عہدے دینے میں بخل کیا، جبکہ یہ بخل ولید سعید اور عبداللہ بن عامر کے معاملے میں روا نہ رکھا تھا۔ مصر پہنچتے ہی اس نے سیاستِ عثمانی کی مخالفت شروع کر دی اور عبداللہ بن سعد بن سرح کے خلاف اودھم مچایا۔

دوسرا نوجوان محمد بن ابی بکرؓ ہے، اس کی بزرگی و شرافت کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہ صدیق اکبرؓ کا فرزند اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کا بھائی تھا اور ان سب باتوں کے علاوہ وہ قریشی نوجوان تھا اور اس عزّت کا مالک تھا جو قریش کو حاصل تھی۔ اسے اپنے والد بزرگوار کی منزلت پہ ناز تھا کیونکہ انھیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مردوں سے زیادہ چاہتے تھے، اپنی ہمشیرہ پر بھی فخر تھا کہ وہ آنحضورؐ کو جملہ خواتین سے زیادہ عزیز تھیں۔ بیشک اسے توقع تھی کہ حضرت عثمانؓ اس کے رتبہ کا لحاظ کریں گے اور اس کے والد بزرگوار اور ہمشیرہ مکرّمہ کی عظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسے ہی اسے بھی کہیں کی حکومت دے دیں گے جیسے وہ اپنے ان قرابت داروں کو دے رہے تھے۔ جو کسی انفرادی شخصیت یا کارکردگی کے لحاظ سے اس سے فائق نہ تھے۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی نہ اُسے کسی گنتی میں شمار کیا، حضرت عثمانؓ کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ تمام قریشی نوجوانوں کو یا قریشی نوجوانوں کی اکثریت کو والی بنا دیں۔ اسامیاں محدود تھیں۔ طلبگاروں کی کثرت تھی۔ البتہ حضرت عثمانؓ نے ایک فریق کو دوسرے فریق پر ترجیح دے کر ان نوجوانوں کے دلوں میں مختلف قسم کے غم و غصہ اور غیرت و حسد کے جذبات کو برانگیختہ کر دیا۔ چنانچہ محمد بن ابی حذیفہ کی طرح محمد بن ابی بکرؓ نے بھی مصر کا رُخ کیا۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے یا تو راستہ میں مل گئے یا پھر مصر میں ملے۔ جونہی یہ دونوں مصر پہنچے عبداللہ بن سعد نے تاڑ لیا کہ یہ کسی نیک جذبہ کے تحت نہیں آئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ان دونوں کو ڈرایا دھمکایا۔ لیکن یہ دھمکیوں اور ڈراوں سے مرعوب نہ ہوئے۔ دونوں میں سے خلیفہ اور والی کے خلاف زیادہ کھل کر علانیہ تنقید کرنے والا اور سخت مخالفت کرنے والا محمد بن ابی حذیفہ تھا۔ اس کا تو یہ حال تھا کہ وہ والی کے مُنہ پر بھی اس کی ناپسندیدہ بات کہنے میں تردّد

نہ کرتا تھا۔ راویوں کا بیان ہے کہ جب والیٔ مصر نماز سے فارغ ہو چکتے" تو محمد بن ابی حذیفہ نعرۂ تکبیر بلند کرتا۔ تاکہ اس طرح ایک طرف تو وہ لوگوں کو اپنی جانب ملتفت کرے اور دوسری طرف والی کو مقابلہ کی دعوت دے، کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بن سعد نے اسے بلا کر اس طرزِ عمل سے منع کیا۔ مگر وہ باز نہ آیا، اس پر عبداللہ بن سعد نے اسے سخت سُست کہا اور پیروں میں بیڑیاں ڈالنے کی دھمکی دی۔ اس نے کوئی پرواہ نہ کی۔ اسی اثنا میں عبداللہ کو رومیوں کے مقابلہ کے لئے ذات الصواری کی مہم پر جانا پڑا۔ محمد بن ابی حذیفہ اور محمد بن ابی بکرؓ بھی ہمراہ چل پڑے لیکن عبداللہ کو خوف دامنگیر ہوا کہ یہ دونوں لشکر کو بہکائیں گے۔ لہٰذا، اس نے دونوں کو ایک ایسی کشتی میں سفر کرنے پر مجبور کیا جس میں ان کے سوا کوئی مسلمان موجود نہ تھا سامان کے ہمراہ صرف قبطی باشندے تھے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ محمد بن ابی بکرؓ بیمار ہو گیا لہٰذا، مصر میں مقیم رہا اور مہم کے ہمراہ فقط محمد بن ابی حذیفہ گیا تھا گمان اغلب یہ ہے کہ ان میں ایک اس لئے ٹھہر گیا ہوگا کہ عبداللہ کے پسِ پشت لوگوں کو بہکائے اور ایک اس لئے چلا گیا ہوگا کہ وہ لشکر میں اپنے خیالات کو نشر کرے۔

اس مہم میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور عبداللہ رومی بیڑے پر غالب ہو کر فاتحانہ شان سے مصر کی طرف لوٹا۔ لیکن اس وقت تک محمد بن ابی حذیفہ اہلِ لشکر کے دلوں کو اس کے اور خلیفہ کے خلاف تنقید اور اعتراضات سے زہر آلود کر چکا تھا۔ وہ فوجیوں سے کہا کرتا تھا کہ تم یہاں مصروفِ جہاد ہو حالانکہ میدانِ جہاد تو تمہارے پیچھے مدینہ شریف میں ہے۔ جہاں حضرت عثمانؓ بیٹھے خلاف قرآن و سنت اور حضرات صدیق و فاروقؓ کے طرزِ عمل سے ہٹ کر کسی اور قسم کی سیاست پر کاربند ہیں، جو اصحابِ رسول اللہ رضوان اللہ علیہم کو معزول کر کے ان کی جگہوں پر فاسقوں اور مسخروں کو مسلمانوں کے امور پر مسلط کر رہے ہیں۔ ذرا اپنے حاکم اور قائدِ جہاد کو دیکھو۔ یہ وہ آدمی ہے جس کے کفر پر قرآن شاہد ہے۔ جس کا خون نبی اکرمؐ نے مباح قرار دیا تھا لیکن حضرت عثمانؓ نے اس کو تمہارا حاکم مقرر کر دیا ہے کیونکہ وہ ان کا رضائی بھائی ہے۔ ذرا دیکھو تمہارے بارے میں اس کا کیا طرزِ عمل ہے۔ کیا آپ کے خیال میں وہ اسی راہ پر گامزن ہے جس پر نبی اور ان کے دونوں ساتھی گامزن رہے ؟ کیا آپ اس کی بدلی ہوئی سیاست نہیں دیکھتے اور کیا آپ کو احساس نہیں ہو رہا کہ اس کی طرف سے عائد کردہ عملی اور مالی پابندیاں آپ کے لئے ناقابلِ برداشت ہیں ؟ ابن ابی حذیفہ ان خیالات کو لشکر میں اور ابن ابی بکرؓ شہر میں پھیلاتے رہے۔ چنانچہ مصریوں نے اس لشکر کی واپسی کے بعد ان دونوں کے پاس جمع ہونا اور ان کی باتوں پر کان دھرنا شروع کر دیا۔ عبداللہ بن سعد کو ان دونوں کی طرف سے خدشہ لاحق ہوا اور حضرت عثمانؓ سے شکایت کر کے ان کے خلاف سخت کارروائی کرنے کی اجازت چاہی۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے عمار بن یاسر کو مصر بھیجا تاکہ وہ ان دونوں کے حالات سے آگاہی کے بعد انھیں مطلع کریں، ان دونوں کو سمجھا بجھا کر نرم روی پر مائل کریں

ساتھ ہی عبداللہ بن سعد کے حالات کا بھی جائزہ لیں۔ لیکن بقول راویوں کے عمار بن یاسر مصر پہنچتے ہی ان دونوں کے ساتھ مل گئے اور انھوں نے سرد مہری کی معیت میں لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے خلاف برانگیختہ کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ عبداللہ بن سعد تنگ آگئے اور ان تینوں کی تعزیر کے بارے میں حضرت عثمانؓ کو لکھا۔ حضرت عثمانؓ نے جواب میں انھیں تنبیہ و ملامت کرتے ہوئے حکم دیا کہ عمار کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا جائے اور انہیں پورے احترام و عزت کے ساتھ واپس مدینہ بھیج دیا جائے ——— ابی بکرؓ سے اس کے والدؓ اور ہمشیرہؓ کی خاطر درگزر کیا جائے۔ اسی طرح محمد بن ابی حذیفہ سے بھی تعرض نہ کیا جائے کہ وہ ان کا (حضرت عثمانؓ) منہ بولا بیٹا، ان کا پروردہ اور قریشی نوجوان ہے۔

میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ عمار کو مصر نہیں بھیجا گیا۔ نہ وہ ان دونوں کے ساتھ لوگوں کو حکومت کے خلاف برانگیختہ کرنے میں شریک ہوئے یہ قصہ محض حضرت عثمانؓ کی طرف سے معذرت کرنے والے بزرگوں کی اختراع ہے تاکہ ان کے اور عمار کے مابین اس واقعہ سے قبل یا بعد ظہور پذیر ہونے والی اس صورت حال پر پردہ ڈالا جا سکے جسے ہم ابھی تھوڑی دیر بعد ملاحظہ کریں گے۔ بہر حال یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ محمد بن ابی حذیفہ اور محمد بن ابی بکرؓ نے واردِ مصر ہو کر لوگوں کو خلیفہ اور ان کے والی کے خلاف ابھارا تھا اور حضرت عثمانؓ نے ان دونوں کو نرمی اور خوش اسلوبی سے راضی کرنا چاہا تھا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے محمد بن ابی حذیفہ کو دولت و خلعت بھیجی جسے لے کر وہ مسجد میں پہنچا اور لوگوں کے سامنے اسے پیش کر کے کہا "مسلمانو! حضرت عثمانؓ کی کارستانی دیکھو وہ رشوت دے کر مجھے میرے دین سے ہٹانا چاہتے ہیں۔"

یہ دونوں بدستور مصریوں میں حکومت کے خلاف پروپگنڈا کرتے رہے تاآنکہ بہت سے لوگ ان کے ہم خیال ہو گئے۔ اور بالآخر مصری حضرت عثمانؓ کی مخالفت و نافرمانی میں تمام لوگوں سے زیادہ سخت ہو گئے۔ ان دونوں کی رنجش کا سرچشمہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے وہی بات تھی جس نے بہت سے قریشی اور غیر قریشی نوجوانوں کے دلوں میں غم و غصہ کے جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ یعنی حضرت عثمانؓ کا ایک فریق کے نوجوانوں کو دوسروں پر ترجیح دینا، صاحبِ رتبہ قابل اور آزمودہ کار اشخاص کو اعلیٰ عہدوں اور مناصب حکمرانی سے محروم رکھ کر ایسے لوگوں کو ان مناصب کے لئے مخصوص کرنا جو خواہ کیسے ہی رتبے یا کیسی ——— ہی اہلیت کے مالک کیوں نہ ہوں دوسروں سے فائق نہ تھے۔ انھیں نہ کوئی امتیازی حیثیت حاصل تھی اور نہ مستقل طور پر ان کا طرزِ عمل قابلِ تعریف تھا۔

حضرت عثمانؓ کے خط کے جواب میں کوفہ سے اشتر کا خط

ذیل کے خط کا مطالعہ جسے اشتر نے حضرت عثمانؓ کی خدمت میں بھیجا تھا اس صورتحال پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ یہ خط حضرت عثمانؓ کے اس خط کا جواب ہے جو انھوں نے اہلِ کوفہ کو نصیحت و ہدایت

کے لئے بھیجا تھا نیز اس کے ذریعہ ان سے ان کی مرضی معلوم کرنا چاہی تھی۔ یہ وہ موقع تھا جب اہلِ کوفہ نے سعید بن عاص کو اپنا حاکم تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا ـــــ اشتر کے اس خط کا مطالعہ یہ جاننے کے لئے کافی ہے کہ حضرت عثمانؓ کے خلاف عوام بالخصوص نوجوان طبقے کا غم و غصہ کس حد پہ پہنچ چکا تھا، اس لئے کہ انھوں نے (عثمانؓ) امور عامہ کی انجام ہی کے لئے اپنے اقرباء کے ایک فریق کو مخصوص کر رکھا تھا۔ حالانکہ اس فریق کے لوگ دوسروں کے مقابلے میں ذرہ بھر امتیاز نہ رکھتے تھے۔

اشتر نے حضرت عثمانؓ کو جو خط لکھا اس کی عبارت یہ ہے:۔

"منجانب مالک بن حارث بخدمت آزمائش میں پڑے ہوئے، خطاکار و سنتِ رسول سے گریزاں اور حکم قرآنی کو پسِ پشت ڈال دینے والے خلیفۃ المسلمین۔

امابعد: ہم نے آپ کا خط پڑھا۔ آپ اپنے آپ کو اور اپنے حکام کو ظلم و زیادتی سے باز رکھیں اور نیک سیرت افراد کی جلاوطنی سے رُک جائیں تو ہم آپ کے تابع فرمان بن جائیں گے، آپ نے کہا ہے کہ ہم نے اپنے نفوس پر زیادتی کی ہے یہ آپ کی وہ خوش خیالی ہے جس نے آپ کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اسی کی وجہ سے آپ کو جور، عدل اور باطل حق دکھائی دیتا ہے۔ اگر آپ ہماری محبت چاہتے ہیں تو وہ اسی شکل میں ممکن ہے کہ آپ اپنے طرزِ عمل سے باز آجائیں، تائب ہوں اور آپ نے ہمارے جن نیک چلن افراد پر ظلم و زیادتی کی ہے اور ہمارے جن نیک اشخاص کو بے گھر کر کے جلاوطن کیا ہے اس پر خدا کے سامنے معافی کے طلبگار ہوں، ہم پر کل کے لونڈوں کو حاکم نہ بنائیں۔ ہمارے علاقہ کا انصرام حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت حذیفہؓ کے سپرد کر دیں کہ ہم ان دونوں سے راضی ہیں۔ ہمیں اپنے ولید، سعید اور اپنے خاندان کے دیگر محبوبِ نظر افراد سے بچایئے۔ آگے جو خدا کی مرضی[1]۔ والسلام۔

آپ نے دیکھ لیا کہ اشتر نے حضرت عثمانؓ کی اطاعت سے روگردانی نہیں کی۔ نہ ان کی امامت سے انکار کیا۔ البتہ اس نے جور و ستم، سُنت سے انحراف۔ احکام قرآنی سے اعراض۔ مناصب حکومت پر نوخیزوں کی تقرری اور مسلمانوں کی جلاوطنی کا الزام لگا کے ان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس طرزِ عمل سے باز آجائیں اور یہ استدعا کی ہے کہ ابوموسیٰ اشعریؓ کو والئ صلوٰۃ و حرب اور حذیفہ بن یمانؓ کو والئ خراج مقرر کر دیں۔ اور بتایا ہے کہ اگر یہ مطالبات مان لئے جائیں تو اہلِ کوفہ ان کی اطاعت کرتے رہیں گے۔

---

[1] انساب الاشراف از بلاذری صفحہ ۴۶ مطبوعہ قدس۔

اشتر کے ان الفاظ کو دیکھئے "ہمیں اپنے ولید وسعید اور اپنے خاندان کے دیگر محبوب نظر افراد سے بچائیے۔ آگے جو خدا کی مرضی" ان الفاظ میں اس نے اس حقیقت کی تصویر کشی کی ہے جس نے اہلِ کوفہ کی رگِ حمیت کو بھڑکا کر انھیں غضب ناک کر دیا تھا۔ یہ حقیقت کیا تھی؟ حضرت عثمانؓ کی کنبہ پروری اور حضرات ابوموسیٰؓ اور حذیفہؓ جیسے عالی قدر اشخاص کی ناقدری۔ راوی کا بیان ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے یہ خط پڑھا تو کہا "اے خدا میں توبہ کرتا ہوں" اور اس کے بعد حضرات ابوموسیٰ اور حذیفہ رضی اللہ عنہما کو لکھا "تم دونوں کو اہلِ کوفہ کی خوشنودی اور ہمارا اعتماد حاصل ہے۔ لہٰذا، آپ دونوں حضرات وہاں کی عنانِ حکومت سنبھال لیں۔ خدا ہمیں اور آپ کو بخشے۔ مزید برآں حضرت عثمانؓ کو عتبہ بن وغل کا یہ شعر بھی پہنچا تھا: ؎

تَصَدَّقْ عَلَيْنَا يَا ابْنَ عَفَّانَ وَاحْتَسِبْ
وَأَمِّرْ عَلَيْنَا الْأَشْعَرِيَّ لَيَالِيَا

"اے عثمان بن عفانؓ! ہمیں خیرات دیجئے اور محض لوجہ اللہ صرف چند روز کے لئے ہی ابوموسیٰ اشعری کو ہمارا والی مقرر کر دیجئے۔ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے یہ شعر سن کر فرمایا "ضرور چند روز کے لئے ہی نہیں بلکہ مہینوں کے لئے اگر میں زندہ رہا تو۔[1]

---

[1] انساب الاشراف از بلاذری صفحہ ۴۷ مطبوعہ قدس۔

تیرھواں باب

عبداللہ بن سبا

عبداللہ بن سبا کا قصہ اس ضمن میں ایک مشہور قصہ کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جسے بعد میں آنے والے راویوں نے بہت اہمیت دی ہے اور خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ یہاں تک کہ بہت سے قدیم و جدید مؤرخین نے اس قصہ کو حضرت عثمانؓ کے خلاف رونما ہونے والی بغاوت کا سرچشمہ قرار دے لیا ہے جو مسلمانوں میں ایک ایسے افتراق کا باعث ہوئی کہ تاحال مٹ نہیں سکا۔ یہ قصہ عبداللہؓ بن سبا کا ہے جو عربی دنیا میں ابن السودا کے نام سے مشہور ہے۔

راویوں کا بیان ہے کہ عبداللہ بن سبا صنعا کے یہودیوں میں سے تھا۔ اس کی ماں حبشن تھی۔ اس نے حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں اسلام قبول کیا اور پھر شہر بہ شہر گھوم گھوم کر خلیفہ کے خلاف سازشوں کا جال پھیلانے اور لوگوں کو برانگیختہ و آمادۂ بغاوت کرنے میں مصروف ہوگیا۔ نیز وہ لوگوں میں ایسے انوکھے نظریات اور غیر اسلامی افکار کی اشاعت کرنے لگا جن کے باعث دین و سیاست کے بارے میں لوگوں کے خیالات پراگندہ ہو کر رہ گئے۔ کہتے ہیں کہ وہ بصرہ گیا لیکن ابھی وہاں زیادہ ٹھہرنے نہ پایا تھا کہ عبداللہ بن عامر کو اس کی اطلاع دے دی گئی، چنانچہ ابن عامر نے اسے بصرہ سے نکال باہر کیا۔ پھر وہ شام گیا۔ وہاں حضرت ابوذرؓ سے ملا۔ اور ان کے سامنے امیر معاویہؓ کو مالِ مسلمین کو مالِ خدا کہنے پر برا بھلا کہا، ازاں بعد اس نے حضرت عبادۃ بن الصامتؓ سے ملاقات کی اور ان سے بھی ایسی ہی باتیں کرنا چاہیں جیسی وہ حضرت ابوذرؓ سے کر چکا تھا۔ مگر حضرت عبادہؓ اسے پکڑ کر امیر معاویہؓ کے پاس لے گئے اور انھیں بتایا کہ اس شخص کی موجودگی شام کے لئے خطرہ ہے۔ چنانچہ امیر معاویہؓ نے اسے شام بدر کر دیا۔ شام سے نکل کر اس نے مصر کی راہ لی۔ مصر میں اسے اپنی سازش مکاری اور بدعت کی نشو و نما کے لئے بڑی شاداب و زرخیز زمین میسر آگئی —— وہ اس بات کا پرچار کیا کرتا تھا کہ حضرت عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام کے مقابلے میں رسولِ خدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں دوبارہ آنے کے زیادہ مستحق ہیں اور سند میں

یہ آیتیں پیش کیا کرتا تھا۔

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ (۲۸/۸۵)۔

بیشک جس خدا نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے وہی آپ کو آپ کے مقام محمود کی طرف بھی لوٹائے گا۔

(یہ آیت سفرِ ہجرت کے دوران میں اتری تھی لہٰذا، بعض مفسرین یہ مفہوم لیتے ہیں کہ اس سے مکّے کی جانب فتح مندانہ مراجعت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے)۔

وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ ہر نبی کا ایک وصی (جس کو وصیتیں کی جائیں اور ہدایات دی جائیں) ہوتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی حضرت علیؓ ہیں اور حضرت علیؓ اسی طرح خاتم الاوصیا ہیں جس طرح محمدؐ خاتم الانبیاء ہیں۔ ان روایات کے پیش نظر سب لوگ خلافت عثمانیؓ میں رونما ہونے والے تمام فسادات و اختلافات کو ابن السوداہی سے منسوب کرتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ اس نے اپنی سازش کا نہایت مستحکم پروگرام تیار کیا۔ پھر اس کے مطابق اس نے بڑے بڑے شہروں میں خفیہ جماعتیں قائم کیں جو پوشیدہ طور پر سرگرم رہتی تھیں اور اپنے مقاصد کے تحت لوگوں کو فتنۂ وجدال کی طرف دعوت دیتی رہتی تھیں۔ اور پھر جونہی موافق حالات میسر آئے۔ یہ جماعتیں خلیفہ کے خلاف اٹھ گئیں اور اسی کے نتیجہ میں بغاوت محاصرہ اور قتلِ امام تک نوبت پہنچی۔

میرا خیال ہے کہ جو لوگ ابن سبا کے معاملہ کو اس حد تک اہمیت دیتے ہیں وہ نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ تاریخ پر بھی شدید ظلم کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی غور طلب چیز یہ ہے کہ اُن تمام اہم مآخذ میں جو حضرت عثمانؓ کے خلاف رونما ہونے والی شورش پر روشنی ڈالتے ہیں ہمیں ابن سبا کا ذکر ہی نہیں ملتا۔ مثلاً ابن سعد نے جہاں خلافت عثمانؓ اور ان کے خلاف بغاوت کا حال رقم کیا ہے وہاں ابن سبا کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ اسی طرح بلاذری نے بھی "انساب الاشراف" میں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ حالانکہ میرے خیال میں حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت کے واقعات معلوم کرنے کے لئے "انساب الاشراف" اہم ترین ماخذ ہے اور اس قصّہ کی سب سے زیادہ تفصیل اسی کتاب میں ملتی ہے ..... ابن سبا کی یہ داستان طبری نے سیف بن عمر کی روایت سے بیان کی ہے۔ اور معلوم یہی ہوتا ہے کہ مابعد کے جملہ مؤرخین نے اس روایت کو طبری ہی سے لیا ہے۔ معلوم نہیں کہ ابن سبا کو عہدِ عثمانؓ میں کوئی وقعت حاصل ہوئی تھی یا نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اس کی کچھ وقعت ہوتی بھی تو وہ چنداں معنی نہ رکھتی تھی، حضرت عثمانؓ کے عہد کے مسلمان ایسے گئے گزرے نہ تھے کہ اہلِ کتاب میں سے ایک نومسلم جو عہد عثمان ہی میں اسلام لایا ہو یہ مقام حاصل کر لے کہ ان کی عقل و فکر اور حکومت تک سے مذاق کرنے لگے۔ وہ بھی اس طرح کہ اِدھر اسلام لائے اُدھر فتنہ و فساد پھیلانا شروع کر دے حتّٰی کہ اپنی سازشوں کو تمام

سلطنت میں نشر کردے اگر اس نومسلم کو جو محض مسلمانوں میں شر انگیزی کی خاطر اسلام لایا تھا عبداللہ بن عامر نے یا امیر معاویہؓ نے پکڑا ہوتا تو اس کے خلاف دونوں میں سے کسی ایک نے یا دونوں نے حضرت عثمانؓ کی خدمت میں ضرور تحریر کیا ہوتا ورنہ دونوں یا دونوں میں سے کوئی ایک ضرور اس کی سخت گرفت کرتا، اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ اسے سزا دیئے بغیر نہ رہتے وہ سزا جو حضرت عثمانؓ کے خوف سے وہ محمد بن ابی حذیفہ اور محمد بن ابی بکرؓ کو نہ دے سکے تھے۔ بھلا وہ شخص جو حضرت عثمانؓ سے محمد بن ابی حذیفہ اور محمد بن ابی بکرؓ اور بعض روایات کے مطابق عمار بن یاسر کو سزا دینے کی اجازت کا طلب گار ہو کیسے ممکن ہے کہ وہ اہلِ کتاب میں سے ایک ایسے آدمی کو سزا دیئے بغیر رہ جاتا جس کے نزدیک اسلام محض مسلمانوں کے مابین آتشِ افتراق کو ہوا دینے کا ایک ذریعہ تھا جو مسلمانوں کی نگاہوں میں ان کے امام بلکہ سارے دین ہی کو مشتبہ بنا رہا تھا۔ اور پھر ظاہر ہے کہ والیانِ مملکت کے لئے اس نومسلم کے تعاقب گرفتاری اور تعزیر سے زیادہ آسان بات کوئی نہ تھی حالانکہ وہ مخالفین کا تعاقب کر کے انھیں گرفتار کرنے یا جلاوطن کر کے انھیں امیر معاویہؓ یا عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کے پاس بھیج دینے میں کافی مہارت رکھتے تھے۔

مسلک ابوذریؓ اور عبداللہ بن سبا

عبداللہ بن سبا کے اس قصہ میں جو سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز ہے وہ یہ ہے کہ اس نے حضرت ابوذرؓ کو امیر معاویہؓ کے اس قول پر کہ بیت المال خدا کا مال ہے اعتراض و تنقید کرنے کی تلقین کی۔ اور انھیں یہ سمجھایا کہ صحیح بات یہ ہے کہ امیر معاویہؓ کو یہ مال مسلمانوں کا مال کہنا چاہیئے۔ اسی تلقین کی روایت کے باعث یہاں تک کہا جانے لگا کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا امراء و اغنیاء پر تنقید کرنے کا جو طریقہ تھا اور زر و سیم کے ذخیرہ کنندگان کو وہ جو عذاب الیم کی بشارت دیتے تھے کہ ان کی پیشانیاں، پہلو اور پشتیں آگ سے داغی جائیں گی تو انھیں یہ سارا مسلک ابن سبا ہی نے پڑھایا تھا، میرا خیال ہے کہ اس سے بڑی زیادتی اور کج فہمی کی مثال ملنی دشوار ہے۔ حضرت ابوذرؓ ہرگز اس امر کے محتاج نہ تھے کہ ایک نوارد انھیں یہ پڑھائے کہ فقراء کے اغنیاء پر بہت سے حقوق ہیں اور انھیں یہ بھی سمجھائے کہ زر و سیم جمع کر کے راہِ خدا میں خرچ نہ کرنے والوں کے لئے عذاب الیم کی بشارت ہے نیز انھیں یہ بات بھی بتلائے کہ غنیمت زکوٰۃ یا خراج کا مال جو مسلمان بیت المال میں داخل کرتے ہیں یا ذمی بطور جزیہ یا خراج بیت المال کی نذر کرتے وہ مالِ مسلمین ہے لہٰذا، واجب ہے کہ وہ مال بولنے میں بھی مسلمین ہی سے منسوب کیا جائے اور عملاً بھی انہی پر خرچ کیا جائے۔ الغرض ابوذرؓ اس سے بالاتر تھے کہ ابن سبا انھیں اسلام کے اوّلیں حقائق و مبادیات کا درس دیتا۔ حالانکہ حضرت ابوذرؓ تمام انصار اور بہت سے مہاجرین سے قبل اسلام لائے تھے۔ وہ حضور اکرمؐ کی صحبت میں تادیر رہے تھے۔ انھوں نے بطریقِ احسن قرآن مجید حفظ کیا تھا وہ سنت

پر پختگی سے کاربند رہے تھے۔ انھوں نے اموال وحقوق سے متعلق مسلک نبویؐ اور سیرت ابوبکرؓ وعمرؓ کو بچشمِ خود دیکھا تھا وہ اصولِ حرام وحلال سے اس طرح آگاہ تھے جس طرح دوسرے اصحابؓ رسول آگاہ تھے اور ان پر بطریقِ احسن عمل پیرا بھی تھے۔

بہرحال جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ابن سبا نے ابوذرؓ سے مل کر انھیں اپنے بعض خیالات کی تعلیم دی وہ اپنے آپ بھی ظلم کرتے ہیں اور حضرت ابوذرؓ پر بھی۔ ساتھ ہی وہ ابن سبا کو ایسا بلند مقام بخش رہے ہیں جس تک پہنچنے کا اسے خیال بھی نہ آیا ہوگا۔ حالانکہ یہ وہی ابوذرؓ ہیں جن کے متعلق راویوں کا بیان ہے کہ ایک روز (شام سے مدینہ شریف واپس آنے کے بعد) وہ حضرت عثمانؓ کے دربار میں کہہ رہے تھے زکوٰۃ دینے والے کو یہ نہیں چاہیئے کہ وہ اپنے ذمہ واجب الادا زکوٰۃ ادا کر کے بس کر دے اس کا فرض ہے کہ سائلوں کو دے بھوکوں کو کھانا کھلائے۔ اور اپنے مال راہِ خدا میں خرچ کرتا رہے۔ کعب الاحبارؓ اس گفتگو کے وقت موجود تھے۔ انھوں نے کہا "جس نے اپنا فریضہ ادا کر دیا اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے" اس پر حضرت ابوذرؓ کو غصہ آگیا اور کعب الاحبارؓ سے کہا "اے یہودی بچے! تمہیں اس معاملہ میں دخل اندازی کرنے کی کیا مجال ہے؟ کیا تم ہمیں ہمارا دین سکھاتے ہو!" — اور ساتھ ہی انھیں اپنی لکڑی کی نوک بھی چبھوئی — غرض ابوذرؓ وہ شخص ہیں جو کعب الاحبارؓ تک کو دین سکھانے کی اجازت نہیں دیتے نہ وہ اسے امورِ مسلمین میں اظہارِ رائے کی حد تک دخل انداز ہونے دیتے حالانکہ کعب الاحبار ابن سبا سے بہت پہلے اسلام لائے تھے اور وہ مدینہ کے پڑوس میں رہتے تھے جہاں سے صبح وشام اصحابؓ رسول کے پاس آتے رہتے تھے۔ مزید برآں یہ کہ وہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے رہتے تھے — اندریں حالات یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ابوذرؓ عبداللہ بن سبا سے اسلام کے بنیادی اصول اور احکام قرآنی میں سے کسی حکم کا سبق لینا گوارا کر لیتے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی کے لئے یہ کس قدر مقامِ تعجب ہے کہ حضرت کعبؓ کو تو دین پر بحث بھی نہ کرنے دے اور پھر وہی دین عبداللہ بن سبا سے سیکھے!

عبداللہ بن سبا کے متعلق جو روایات ہیں انھیں درست بھی مان لیا جائے تب بھی گمان غالب یہی ہے کہ اس کی تعلیم وتبلیغ اور دعوت فتنہ کے رونما ہونے اور مخالفت وبغاوت کی آگ بھڑکنے کے بعد شروع ہوئی ہے۔ لہٰذا، یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے فتنہ سے ناجائز فائدہ اٹھایا لیکن یہ غلط ہے کہ وہ اس فتنہ کو برانگیختہ کرنے والا ہے' اس طرح گمان اغلب ہے کہ شیعہ دشمن عناصر نے عہدِ امیہ وعباسیہ میں عبداللہ بن سبا کے معاملہ کو اس لئے مبالغہ کا رنگ دے دیا کہ ایک طرف تو کچھ ایسے واقعات جو حضرت عثمانؓ اور ان کے والیوں سے منسوب ہیں وہ مشکوک ہو جائیں اور دوسری طرف حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں پر زد پڑے اور یہ ظاہر کیا جائے کہ شیعہ ایک یہودی کے جھانسے میں آئے ہوئے تھے جو محض علم دشمنی کی خاطر اسلام لایا تھا ظاہر ہے کہ مخالفین شیعہ نے شیعہ پر اور رجوعاً شیعہ نے اپنے مخالفین پر جو جو اتہام والزام عائد کئے

ہیں وہ حد و حساب سے باہر ہیں۔ اس طرح وہ اتہامات بھی بہت زیادہ ہیں جو شیعہ حضرت عثمانؓ اور دیگر حضرات کے بارے میں اپنے مخالفین پر عائد کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں ان تمام حالات کا جائزہ نہایت تدبر اور احتیاط سے لینا چاہیئے۔ ہمیں صدرِ اسلام کے مسلمانوں کو اس سے بالاتر سمجھنا چاہیئے کہ ان کے دین و سیاست اور عقل و حکومت کو ایک ایسا شخص کھلونا بنالے جو صنعاء کا ہو، جس کا باپ یہودی اور ماں حبشن ہو، اور جو خود بھی یہودی ہو، جسے اسلام لائے ابھی زیادہ دن نہ گزرے ہوں۔ مزید برآں یہ کہ اس نے اسلام بھی برغبت یا بخوف قبول نہ کیا ہو بلکہ محض مکر۔ سازش اور فریب دہی کی خاطر یہ روپ دھارا ہو ـــــ پھر اسے حسب دلخواہ کامیابی ہو گئی۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کو ان کے امام کے خلاف شورش بپا کرنے پر تیار کر لیا یہاں تک کہ انھوں نے خلیفہ کو تہ تیغ کر ڈالا۔ علاوہ ازیں اس نے مسلمانوں کو اس واقعہ سے قبل یا بعد منتشر کر کے فرقہ فرقہ اور گروہ گروہ کر دیا۔

یہ تمام باتیں ایسی ہیں جو عقل کی کسوٹی پر ثابت نہیں ہوتیں نہ تنقید کی تاب لاسکتی ہیں؛ لہٰذا، ان باتوں پر تاریخی امور کی بنیاد استوار کرنا درست نہیں؛ دراصل واضح بات جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں یہ ہے کہ اس دور کی اسلامی زندگی کے حالات طبعی طور پر اختلاف آراء، افتراق اہواء اور گوناگوں سیاسی مذاہب کے ظہور کی طرف مائل تھے۔ ایک طرف تو وہ لوگ تھے جو قرآن و سُنتِ نبویؐ۔ اور سیرتِ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے وابستہ تھے اور وہ ایسے نئے امور وقوع پذیر ہوتے دیکھ رہے تھے جن سے ان کا سابقہ نہیں پڑا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان حالات کا اس طرح حزم و احتیاط، قوت و شدت۔ بے غرضی اور خوش انتظامی کے ساتھ مقابلہ کیا جائے جس طرح حضرت عمرؓ کیا کرتے تھے۔ دوسری طرف قریش اور دوسرے عرب قبائل کے نوجوان تھے جو نئی صورتِ حال سے نئے جذبات کے ساتھ دوچار ہوئے تھے ایسے جذبات جن میں طمع، مراتب عالیہ کا حصول، خود غرضی و خود پرستی۔ خوش رنگ اُمیدیں، کسی حد پر نہ ٹھہرنے والی خواہشیں ملی جلی تھیں۔ ان سب باتوں کی وجہ سے ان جذبات میں رشک و رقابت اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی تمنا بھی شامل تھی۔ یہ باہمی مقابلہ محض بلند مناصب کے حصول ہی کے لئے نہ تھا بلکہ ماحول کی ہر شے کو حاصل کرنے کے لئے موجود تھا۔ یہ نئی صورتِ حال فی نفسہٖ اس قابل تھی کہ بہنا ڈپیر کو اس دھڑے پر لگا دے جس کی جانب وہ چل پڑے تھے ـــــ ذرا غور کیجیئے کہ وسیع علاقے فتح ہو رہے تھے۔ ان علاقوں سے بے حساب دولت خراج کی شکل میں ان کے پاس وصول ہو کر پہنچ رہی تھی، اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اگر ان علاقوں میں نظم حکومت چلانے اور اس جمع شدہ مال سے مستفید ہونے کی غرض سے لوگ باہم رشک و رقابت کے جذبات میں مبتلا تھے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے! پھر دوسری طرف وہ ممالک بھی تھے جو ابھی فتح نہیں ہوئے تھے۔ اور صورتِ حال اس امر کا تقاضا کر رہی تھی کہ مسلمان

انھیں بھی دوسرے علاقوں کی طرح زیرِ نگیں کرلیں۔ تو پھر وہ لوگ فتح کے ضمن میں کیوں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش نہ کرتے؟ ان میں سے جو لوگ طالبِ دنیا تھے وہ کیوں فاتحین کی مجد و عزت اور مالِ غنیمت کے بارے میں رقیبانہ رویّہ اختیار نہ کرتے؟ جو طالبِ آخرت تھے وہ کیوں اجر و ثواب کے طلب گار نہ ہوتے؟ لہٰذا، اگر طامع و بلند نگاہ نوجوانانِ قریش ان راہوں سے داخل ہوکر جو ان کے سامنے کھلی تھیں۔ عظمت، تسلّط، اور ثروت حاصل کرنا چاہتے تھے تو یہ کون سے اچنبھے کی بات تھی۔ اسی طرح اگر انصار اور دوسرے عرب قبائل کے نوجوانوں میں مقابلہ و مسابقت کی روح بیدار ہو رہی تھی تو اس میں کون سی انوکھی بات تھی اور پھر جب یہ دیکھ کر کہ خلیفۂ اسلام ان کے اس جذبۂ مسابقت میں حائل ہو رہے ہیں یا وہ اہم معاملات میں قریش کو اور اس سے زیادہ عظیم الحیثیت امور میں صرف بنی اُمیہ کو ترجیح دے رہے ہیں ان کے دلوں میں دردِ محرومی اور غیرت و غضب کی آگ بھڑکے تو اس میں کون سا عجوبہ ہے۔

بلاشک حضرت عثمانؓ نے حضرت سعدؓ کو کوفہ کی حکومت سے معزول کرکے ان کی جگہ ولید اور سعید کو والی مقرر کیا ابو موسیٰؓ کو بصرہ سے معزول کرکے عبداللہ بن عامر کو ان کا جانشین مقرر کیا۔ تمام ملک شام متحد کرکے امیر معاویہؓ کے سپرد کرنے کے ان کے تسلّط کی حتی الامکان توسیع کی حالانکہ قبل ازیں شام کئی صوبوں میں منقسم تھا اور اس کی حکومت میں قریش کے ساتھ دوسرے عرب قبائل بھی شریک تھے۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ نے مصر سے عمرو بن العاصؓ کو معزول کرکے ان کی جگہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کا تقرر کیا۔ اور یہ سب والی حضرت عثمانؓ کے اقربا میں سے تھے۔ کوئی ماں کی طرف سے بھائی تھے اور کوئی رضاعی بھائی۔ کوئی ماموں تھے اور کوئی بنو عبد شمس سے نسبت قریبہ رکھنے کی وجہ سے ان کے ہم نسب تھے۔ یہ سب وہ حقائق ہیں جن سے مجالِ انکار نہیں ہے ـــــ یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے جن لوگوں کو مقرر یا معزول کیا تھا ابن سبا کے ایما سے نہیں کیا تھا۔ سیدھی سی بات ہے کہ جب بھی شاہوں، قیصروں، والیوں اور امراء نے امورِ حکومت میں اپنے اقرباء کو ترجیح دی ہے لوگوں نے اسے ہمیشہ ناپسند کیا ہے اس اعتبار سے حضرت عثمانؓ کی مسلم رعایا نے عامۃ الناس سے ہٹ کر کوئی انوکھی بات نہ کی تھی ـــــ چنانچہ انھوں نے بھی ہر زمانہ کے عام انسانوں کی طرح بعض معاملات کو ناپسند کیا اور بعض کو تسلیم کرلیا۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

آخر میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ حقیقتاً حضرت عثمانؓ کو جس مخالفانہ رجحان سے دوچار ہونا پڑا تھا اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور

آشنا نہ تھا۔ یہ مخالفت مرکز سے دُور کے علاقوں میں ہو رہی تھی جس کے متعلق پچھلے صفحات میں ہم تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں اسی طرح یہ مخالفت خود مدینہ میں بھی ہو رہی تھی یعنی مرکز میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قریب، جسے اب تک ہم نے نہیں بتایا ہے، اب ملک کے اہم صوبوں کی سیر کرانے اور حالات کا جائزہ لے چکنے کے بعد آئندہ صفحات میں ہم مرکزی حالات کا جائزہ لیں گے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب ہمیں پوری کوشش سے دینا چاہیئے اور وہ سوال یہ ہے کہ سیاستِ عثمانیؓ کی مخالفت شروع کس مقام سے ہوئی؟ کیا اس کی ابتداء دارالخلافت مدینہ میں ہوئی یا صوبائی دارالحکومتوں میں؟ بالفاظ دقیق تر یوں کہا جا سکتا ہے کہ "آیا اس مخالفت کی ابتداء مہاجر و انصار صحابۂ رسول کی طرف سے ہوئی اور وہاں سے دیگر شہروں میں متعینہ عساکر کی طرف منتقل ہوئی یا عساکر میں شروع ہو کر یہ مخالفت مدینہ شریف تک پہنچی؟

یہ بخوبی عیاں ہے کہ اس سوال کا جواب دینا بڑا خطرہ مول لینا ہے۔ کیونکہ اگر اس مخالفت کی ابتدا مدینہ میں بتائی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے اصحاب رسولؐ نے سیاستِ عثمانی کے بعض پہلوؤں پر اظہارِ ناپسندیدگی کیا۔ اور پھر دوسروں نے ان کا اتباع کیا پھر اس اتباع میں کسی کا رویہ معتدل تھا اور کسی کا شدید۔ اور اگر یہ مخالفت صوبائی شہروں میں شروع ہوئی تھی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس ضمن میں عساکر نے سبقت کی اور پھر اس میں اور اس کے عواقب میں اصحابِ رسول بھی شریک ہو گئے دراں حالیکہ ان میں سے بعض اس شرکت سے خوش تھے اور بعض ناخوش۔ ہم اس سوال کے جواب میں درمیانی راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس مخالفت کی ابتداء صرف مدینہ ہی میں نہیں ہوئی بلکہ مدینہ کے ساتھ ساتھ باقی مملکت میں بھی ہوئی عین ممکن ہے کہ اس کی طرح مدینہ ہی میں پڑی ہو اور پھر یہاں سے اطراف سلطنت کی ان سرحدوں تک پھیل گئی ہو جہاں مسلمان دشمنوں کے خلاف صف آراء تھے۔ اگر یہ بات صحیح ہے۔ اور اس کے غلط ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں —— تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ مخالفت قطع نظر اس سے کہ اس کی ابتداء مدینہ میں ہوئی یا مفتوحہ علاقوں میں، یہ ایک طبعی اور لازمی شکل تھی جو اولاً تو اس دور کی اجتماعی زندگی کے حالات اور ثانیاً سیاسی زندگی کے حالات سے پیدا ہوئی تھی، اور سب سے آخر میں وہ نئے نئے پیدا ہونے والے تمدنی حالات اور ایک ترقی پذیر تمدن کے طبعی تقاضے تھے جن کو اپنانے اور جن کا حل تلاش کرنے کے لئے مسلمان مجبور تھے کہ وہ انھیں دینی حقائق و اصول سے ہم آہنگ کریں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے کی یہ طاقت نہ تھی کہ وہ زندگی کے طبعی تقاضوں سے مقابلہ کر سکتے یا ان حالات کو دبا دیتے۔ یہ ناممکن تھا کہ اس قدر عظیم الشان اقتدار جو مسلمانوں کو حاصل تھا وہ حاصل ہو جائے اور اس میں کوئی حکومت اور اس کی مخالف طاقت پیدا نہ ہو اور پھر اس

مخالف طاقت اور حکومت میں ٹکراؤ نہ ہو۔ یہ ناگزیر امر آخر اس تصادم کی صورت میں رونما ہوا جس میں مبتلا ہو کر مسلمان بھی اسی راہ پر گامزن ہو گئے جس پہ اں سے قبل اور بعد کی قومیں گامزن رہیں کیونکہ اس وقت تک سیاسی اور اجتماعی نظام کی ترقی کا سلسلہ مکمل نہیں ہوا تھا ـــــ اور وہ تا حال بھی تشنۂ تکمیل ہے ـــــ لہٰذا، وہ لوگ جو دورِ حاضر میں نظامِ سیاسی و اجتماعی کی کشمکش کا تماشا دیکھ رہے ہیں انھیں یہ زیب نہیں دیتا کہ پہلی صدی ہجری یعنی ساتویں صدی عیسوی کی اس کشمکش کو بہ نظرِ حیرت دیکھیں جو عہدِ عثمانؓ میں نظامِ سیاسی و اجتماعی کے مسائل کی وجہ سے برپا تھی۔

اسلامی مفتوحہ علاقوں کی اس طویل سیاحت کے بعد اب ہم مرکز یعنی مدینہ منورہ واپس آتے ہیں اور کچھ عرصہ یہاں حضرت عثمانؓ اور ان کے ساتھیوں کے درمیان ٹھہر کر یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کا طرزِ عمل اپنے رفقاء کے ساتھ کیسا ہے؟ اور ان لوگوں کی حضرت عثمانؓ کے متعلق کیا رائے ہے۔

چودھواں باب

حضرت عثمانؓ کے ساتھ مرکزیہ میں

حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ سب سے پہلے ہم حضرت عثمانؓ اور ان پانچ حضرات کے باہمی روابط معلوم کرتے ہیں جنھوں نے ان کو خلیفہ منتخب کر کے سب سے پہلے ان کی بیعت کی تھی اور جو حضرت عمرؓ کی ہدایت کے مطابق شوریٰ میں حضرت عثمانؓ کے شریک کار تھے۔ یہ سب کے سب اولین اسلام لانے والوں یعنی السابقون الاولون میں شمار ہوتے تھے۔ ان سب نے راہِ خدا میں مردانہ وار تکالیف کا سامنا کیا اور لڑائیوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ رسولِ خدا ان سب سے تادمِ آخریں راضی رہے۔ یہ سب حضرات عشرہ مبشرہ میں سے تھے جن کے جنتی ہونے کی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت دی تھی۔ پھر قریش سے رشتہ داری، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت، لوگوں میں ان کے مدارج و مراتب اور دنیاوی حالات کے اعتبار سے ان کے درجات مختلف ہیں۔ حضرت عمرؓ، عوام الناس، اور خود ان پانچوں کی رائے کے مطابق حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کو ان افراد میں اوّلیت حاصل تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ کی والدہ مکرمہ کی جانب سے حضرت عبدالرحمنؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار تھے۔ کیونکہ حضرت آمنہ بنت وہب کی طرح یہ بھی بنی زُہرہ سے تھے۔ جاہلیت میں ان کا نام عبد عمرو یا عبدالکعبہ تھا۔ آنحضرتؐ نے ان کا نام عبدالرحمن رکھا تھا۔ عہد جاہلیت میں وہ بڑے ماہر اور خوش حال تاجر تھے۔ اسلام لانے کے بعد بھی ان کی تجارت کا یہی عالم رہا۔ وہ دولت پیدا کرنے کے بہتر طریق جانتے اور مال کے اچھے منتظم تھے۔ مال کو نفع کے کاموں میں لگانے اور اسے امور خیر میں صرف کرنے کے بھی ماہر تھے۔ جب وہ ہجرت کر کے مدینہ شریف میں پہنچے تو سعد بن ربیع انصاریؓ کے یہاں اُترے۔ حضرت سعدؓ نے ان سے کہا "میں اہلِ مدینہ میں سب سے مالدار ہوں۔ میرے مال کا نصف حصّہ آپ انتخاب کریں، میری دو بیویاں ہیں آپ انھیں دیکھ لیں جو آپ کو پسند ہو گی میں اسے آپ کے

لئے طلاق دے دوں گا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے جواب دیا "خدا آپ کو بہت دے۔ مجھے تو آپ صبح اپنے شہر کی منڈی بتا دیجئے گا اور بس"۔ صبح کو حضرت عبدالرحمٰنؓ بازار گئے۔ خرید و فروخت کر کے کچھ کما لیا۔ اور مکھن پنیر لئے سرِ شام لوٹ آئے۔ مدینہ میں کچھ مدت قیام کر چکنے کے بعد ایک روز زعفرانی لباس زیبِ تن کئے رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے اس پوشش کا سبب پوچھا۔ عرض کیا "میں نے شادی کر لی ہے"۔ آپؐ نے فرمایا، مہر کیا دیا؟ عرض کیا کھجور کی گٹھلی کے ہموزن سونا"۔ اس پر آپ نے فرمایا "تو پھر ولیمہ کیجئے خواہ وہ ایک بکری ہی کا کیوں نہ ہو" حضرت عبدالرحمٰنؓ کہا کرتے تھے "میں اپنے بارے میں یہ جانتا ہوں کہ اگر مٹی کو ہاتھ لگاتا ہوں تو سونا بن جاتی ہے"۔ مطلب یہ کہ وہ حصولِ زر کی کوشش میں بڑے صاحب توفیق تھے اور اس کی جستجو میں بڑے صاحب نظر واقع ہوئے تھے۔ مدینہ میں ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ان کا شمار اغنیاء میں ہونے لگا۔ ان کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔

اِنَّكَ غَنِيٌّ وَمَا اَرَاكَ تَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا زَحْفًا فَاَقْرِضِ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُطْلِقْ لَكَ قَدَمَيْكَ

"تم غنی ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم جنت میں بڑے بوجھل قدموں کے ساتھ داخل ہو رہے ہو۔ خدا کی راہ میں بطریقِ احسن خرچ کرو تاکہ تمہارے قدم سبک ہو جائیں"۔

اسی طرح ہم وہ حدیث بھی جو حضرت عائشہؓ کے بارے میں بیان کی جاتی ہے قبل ازیں نقل کر چکے ہیں۔ کہ کس طرح انہیں (حضرت عائشہؓ کو) یہ اطلاع دی گئی کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کا تجارتی قافلہ آیا تھا جو انھوں نے سارے کا سارا معہ ساز و سامان صدقہ میں دے ڈالا۔ ہم یہ بھی قبل ازیں بتا چکے ہیں کہ عبدالرحمٰن نے بیش بہا ترکہ چھوڑا تھا۔ جس میں ایک ہزار اونٹ۔ تین ہزار بھیڑیں بکریاں۔ ایک سو گھوڑے اور اتنی زمین بھی شامل تھی۔ جسے بیس اونٹ سیراب کرتے تھے ان کی چار بیویوں میں سے ہر ایک بیوی کا حصہ جو ترکہ کے ثمن (⅛) کا چوتھائی تھا اسی ہزار اور لاکھ کے درمیان بنا تھا۔ ان تفاصیل سے اگر کسی چیز کی عکاسی ہوتی ہے تو وہ یہی ہے کہ ان کے پاس بے شمار دولت تھی جو مسلسل خیرات و صدقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہراتؓ کی خدمت، اپنے خاندان بنی زہرہ کے اقرباء کے ساتھ سلوک، نیز عامۃ المسلمین کی دیکھ بھال کے باوجود کم نہ ہوتی تھی بلکہ بڑھتی ہی رہتی تھی[۲]۔

---

[۱] اس قسم کی روایات ہمیں وضعی نظر آتی ہیں

[۲] - یہ قرآن کے معاشی نظام قائم ہونے سے پہلے کی بات ہو سکتی ہے۔

بایں ہمہ حضرت عبدالرحمٰنؓ دولت کے معاملہ میں انتہا پسند نہ تھے۔ وہ دولت کی افزائش کا اہتمام وانتظام کرتے اس کی نگرانی اور پورا پورا خیال رکھتے لیکن سب کچھ بطریق احسن ہوتا تھا۔ ابن سعد نے حضرت عمرؓ کے حالاتِ زندگی میں بالاسناد بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کو کچھ رقم کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ انھوں نے حضرت عبدالرحمٰنؓ کے پاس آدمی بھیجا کہ وہ انھیں یہ رقم قرض دے دیں۔ لیکن حضرت عبدالرحمٰنؓ نے قاصد سے کہا، "ان سے کہو کہ بیت المال سے قرض لے لیں"۔ اس کے بعد جب حضرت عمرؓ کی ان سے ملاقات ہوئی تو حضرت عمرؓ نے اس ستم ظریفی پہ ملامت کی اور کہا "میں نے چاہا تھا کہ بیت المال سے قرض لے لوں۔ پھر خیال آیا کہ اگر میں بیت المال کا قرض ادا کئے بغیر مرگیا تو آپ لوگ کہیں گے کہ اس قرضہ کو عمر اور آلِ عمر کی خاطر معاف کر دیا جائے"۔

خدا نے زندگی کی جن نعمتوں کو مسلمانوں کے لئے مباح کیا تھا حضرت عبدالرحمٰنؓ ان سے پوری طرح متمتع ہوتے تھے۔ دین کا حق بھی بطریق احسن ادا کرتے تھے۔ مگر آخر وہ قریشی تھے اور زندگی اسی انداز سے بسر کرتے تھے جو قریش کو پسند تھا۔ وہ زہد پر کاربند نہ تھے۔ نہ خشک زندگی کے قائل تھے۔ ایک بار انھیں خارش کی شکایت ہوئی تو انھوں نے نبی اکرمؐ سے ریشمی لباس پہننے کی اجازت چاہی۔ آپؐ نے اجازت عطا فرمادی۔ اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ نے چاہا کہ ریشم کو اپنے اور اپنے لڑکوں کے لئے مباح کرلیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے انھیں اس سے روک دیا ـــــ اور جیسا کہ ہم پہلے بیان چکے ہیں حضرت عمرؓ نے وہ ریشمی ملبوس پھاڑ ڈالا تھا جو حضرت عبدالرحمٰنؓ نے اپنے ایک لڑکے کو پہنا رکھا تھا۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ اپنے دوسرے معاصرین کی طرح کثیر الازواج اور کثیر الاولاد تھے۔ ابن سعد نے دس سے اوپر ان کی بیویوں کے نام گنائے ہیں، جو لونڈیوں کے علاوہ ہیں، جن میں سے ہر ایک سے لڑکے اور لڑکیاں ہوئیں۔ جب حضرت عبدالرحمٰنؓ فوت ہوئے تو اس وقت بقول بعض چار اور بقول بعض تین بیویاں بقید حیات تھیں حضرت عبدالرحمٰنؓ نے یہ تمام شادیاں ایک قبیلہ یا دو تین قبیلوں میں نہ کی تھیں بلکہ انھوں نے بہت سے قبائل کے ساتھ رشتہ قائم کیا تھا۔ مثلاً انھوں نے قبائل یمن اور قبائل ربیعہ میں سے کئی قبیلوں میں شادیاں کی تھیں، یہی باعث ہے کہ ان کے بیٹوں بیٹیوں میں سے بعض اپنا ننھیال قریش میں بتاتے تھے اور بعض انصار میں۔ بعض اپنا ننھیال ان قبائل یمن میں شمار کرتے تھے جو یمن میں مقیم تھے اور بعض ان قبائل میں بتاتے تھے جو شام وعراق میں مقیم تھے۔ اسی طرح بعض مضر کی شاخ تمیم کی طرف اشارہ کرتے تھے اور بعض ربیعہ کی شاخ بکر اور تغلب کی جانب۔

بقول ابن سعد اگر ان جملہ عورتوں کے انساب پہ ذرا بھی نگاہ ڈالیں جن سے حضرت عبدالرحمٰنؓ نے شادیاں کی تھیں تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے ان قبائل سے رشتے قائم کئے تھے جو سب سے قوی اور

صاحبِ دبدبہ تھے۔ اس اعتبار سے اگر حضرت عمرؓ کے بعد ہی اولوالامر ہو جاتے تو وہ اپنے گرد سب عصبیتوں کو جمع کر کے ان میں باہم اعلیٰ قسم کی یک جہتی پیدا کر سکتے تھے۔ اور ممکن تھا کہ وہ ان میں سے ان قبائل کو ایک دوسرے سے قریب کر دیتے جن کے مابین شدید دوری حائل تھی۔ نیز اگر وہ خلیفہ ہو جاتے تو اموالِ عامہ کا بھی اسی طرح بندوبست کرتے جس طرح اپنے ذاتی اموال کا کرتے تھے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ وہ اسے نہایت خوش تدبیری سے کام میں لاتے۔ اس کی افزائش کا اہتمام کرتے اور حقدار کے سوا اس میں سے کسی کو کچھ نہ دیتے۔ حضرت عمرؓ نے انھیں رکن شوریٰ مقرر کیا تھا۔ اور یہ کہہ کر انھیں دوسرے ارکان سے ممتاز کر دیا تھا کہ اگر تین ایک طرف ہوں اور تین دوسری طرف تو پھر جس فریق میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ہوں اس کی رائے قبول کر لی جائے —— مساوی آراء کی صورت میں حضرت عبدالرحمٰنؓ کی رائے کو فائق قرار دے کر گویا حضرت عمرؓ نے انھیں مجلس شوریٰ میں صدر کی سی حیثیت دے دی تھی —— صحابہ کرامؓ میں کئی بزرگ انھیں خلافت کے لئے اُمیدوار بنانا چاہتے تھے کیونکہ ان کی رائے میں حضرت عبدالرحمٰنؓ کے خلیفہ بن جانے سے بہت سی خرابیوں سے نجات اور افتراق کی اس خلیج کے پٹے رہنے کی اُمید تھی جس کا انھیں حضرات علی یا عثمان رضی اللہ عنہما کے خلیفہ ہو جانے پر ظہور میں آنا متوقع نظر آتا تھا —— بلکہ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ خود ارکینِ شوریٰ میں بھی ایسے لوگ تھے جنھیں ان کے خلیفہ ہو جانے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ اگر حضرت علیؓ کو ان کے اور حضرت عثمانؓ کے انتخاب میں اختیار دیا جاتا تو وہ بنی اُمیہ کے متعلق کی وجہ سے حضرت عثمانؓ پر حضرت عبدالرحمٰنؓ کو ترجیح دیتے، اسی طرح اگر حضرت عثمانؓ کو اختیار دیا جاتا تو وہ بھی انھیں حضرت علیؓ پر ترجیح دیتے۔ کیونکہ حضرت علیؓ کا تعلق بنی ہاشم سے تھا۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ اور حضرت عثمانؓ کے مابین نسبتی تعلق تھا۔ کیونکہ حضرت عبدالرحمٰنؓ ام کلثوم کے خاوند تھے جو عقبہ بن ابی معیط کی بیٹی اور ولید بن عقبہ کی بہن تھی۔ پھر حضرت عبدالرحمٰنؓ اور قبیلہ عبدشمس کے مابین بھی نسبتی تعلق تھا۔ کیونکہ وہ عتبہ بن ربیعہ بن عبدشمس کے داماد تھے۔ اس اعتبار سے امیر معاویہؓ کی خالہ ان کے گھر میں تھیں۔ علاوہ ازیں شیبہ بن ربیعہ بن عبدشمس کے بھی داماد تھے۔ اسی طرح انھوں نے انصار میں بھی شادی کر رکھی تھی۔ ان کی ماں بنی اُمیہ سے تھیں۔ وہ خود بنی زہرہ سے تھے۔ لہٰذا حضرت عبدالرحمٰن اس قابل تھے کہ قریش و انصار کی عصبیتوں کو متحد کر کے انھیں دوسرے قبائل کی عصبیتوں کے ہمراہ جن میں انھوں نے شادیاں کر رکھی تھیں ایک نقطہ پر جمع کر دیتے۔ لیکن انھوں نے اپنے آپ کو خلافت کا اُمیدوار نہ بنایا۔ اور ان لوگوں کی ایک نہ سُنی جو انھیں خلیفہ بنانے پر مُصر تھے۔ انھوں نے تیزی سے اپنے آپ کو اس بحث سے خارج کر لیا اور دونوں مخالف گروہوں کے درمیان ثالث بن جانا پسند کیا، اور جب حضرت علیؓ نے ان سے قسم لے لی کہ وہ کسی کی نسبت یا قرابت و تعلق کا لحاظ نہ کریں گے تو پھر سب اُمیدواروں نے اُنہیں

ثالث مان لیا تھا ـــــ انھوں نے خوشی سے یہ قسم کھائی اور عقدۂ خلافت کو وا کرنے کے لئے وہ طریق کار اختیار کیا جس کا ذکر ہم سابقہ اوراق میں کر چکے ہیں۔ حضرت عبدالرحمنؓ کہا کرتے تھے کہ اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے مقابلہ میں مجھے یہ زیادہ عزیز ہے کہ کوئی برچھی میری گردن سے پار کر دی جائے۔

بہرحال وہ اپنے آپ کو حکومت اور اس کے ساتھ وابستہ شکوک و شبہات سے الگ کر کے حکومت کی ذمہ داریوں سے دست کش ہو گئے۔ اور اس کے مقابلے میں انھوں نے ایک عام آدمی کی طرح زندگی گزارنے کو ترجیح دی جو فارغ البالی کے ساتھ دین و دنیا کے فرائض انجام دیتا رہے، تاکہ ان کی دُنیا ان کے دین کا وسیلہ بنے ـــــ تاہم چونکہ حضرت عبدالرحمنؓ نے خلافتِ عثمانؓ کے حق میں فیصلہ صادر کیا تھا۔ انہی نے اراکین شوریٰ اور عامۃ الناس سے ان کی بیعت کرائی تھی۔ لہٰذا قدرتی طور پر حضرت عبدالرحمنؓ کا فرض تھا کہ وہ نہایت قریب سے حضرت عثمانؓ کے اعمال کا جائزہ لیتے رہتے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی ایام میں حضرت عبدالرحمنؓ ان کے مخالف نہ تھے۔ بلکہ وہ ان کی تائید و نگرانی کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے ان کے خلاف اعتراضات شروع کر دیئے۔ حضرت عبدالرحمنؓ ان کے اعتراضات کو سُنتے اور حضرت عثمانؓ کی مزید سختی سے نگرانی کرنے لگے۔ آخر ایک روز لوگوں نے دیکھا وہ دین و سیاست ہر دو معاملوں میں حضرت عثمانؓ کے مخالف ہو گئے ہیں۔ پھر وہ دن بھی لوگوں نے دیکھا کہ حضرت عبدالرحمنؓ نے صرف مخالفت ہی پر بس نہ کی بلکہ حضرت عثمانؓ سے قطع تعلق بھی کر لیا۔ نہ ان سے ملاقات کا سلسلہ باقی رکھا نہ بات چیت کا۔ بعض راویوں نے مبالغہ سے کام لیتے ہوئے یہ خیال کیا ہے کہ حضرت عبدالرحمنؓ حضرت عثمانؓ کو خلیفہ بنانے پر اظہارِ ندامت کیا کرتے تھے، نیز انھوں نے ایک روز حضرت علیؓ سے کہا "اگر منظور ہے تو آپ اپنی تلوار سنبھالیں اور میں اپنی۔ اور آیئے ہم حضرت عثمانؓ کے خلاف جہاد کریں" اس راوی نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت عبدالرحمنؓ نے اپنی موت سے ذرا پہلے حاضرین سے کہا "حضرت عثمانؓ کو اتنی مہلت نہ دو کہ وہ تم پر اور اپنے آپ پر ستم ڈھا سکیں" لیکن یہ روایات تکلّف و تصنع سے خالی نہیں ہو سکتیں۔ بہرحال اس میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ حضرت عبدالرحمنؓ نے اس وقت بھی حضرت عثمانؓ کی مخالفت کی تھی جب انھوں نے اپنے قرابت داروں کو دولت عطا کی تھی۔

پندرھواں باب

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی طرح حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بھی بنی زہرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک روز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعدؓ کو آتے دیکھا تو فرمایا "یہ میرے ماموں ہیں" یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حضرت سعدؓ ان اشخاص میں سے تھے جو سب سے پہلے اسلام لائے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اسلام لانے والوں میں میرا تیسرا نمبر ہے۔ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ میں اس وقت اسلام لایا جب کہ خدائے تعالےٰ کی طرف سے نماز بھی فرض نہ ہوئی تھی۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح انھوں نے بھی راہِ خدا میں مردانہ وار سختیاں جھیلیں، راہِ خدا میں سب سے پہلا تیر آپ ہی نے چلایا۔ جنگ احد میں وہ جوہر دکھائے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا "اے سعد! تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں" حضرت سعدؓ اپنے بھائی عمیر بن ابی وقاصؓ کا قصہ سنایا کرتے تھے جو کم سنی ہی میں مدینہ ہجرت کر آئے تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگ بدر میں شریک ہونے والے مجاہدین کا معائنہ فرما رہے تھے تو حضرت سعدؓ نے دیکھا کہ ان کے بھائی عمیرؓ لوگوں کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کر رہے ہیں، حضرت سعدؓ نے اس کا سبب پوچھا تو حضرت عمیرؓ نے جواب دیا کہ مجھے ڈر ہے کہ رسولِ خدا مجھے چھوٹا خیال فرما کر واپس نہ کر دیں۔ میں شریکِ جنگ ہونا چاہتا ہوں شائد مجھے شہادت نصیب ہو جائے۔ رسولِ خدا نے حضرت عمیرؓ کو دیکھ لیا اور ان کی کم سنی کی وجہ سے انھیں واپس کر دیا۔ حضرت عمیرؓ نے رونا شروع کر دیا تو آپؐ نے انھیں جنگ میں شریک ہونے کی اجازت دے دی۔ حضرت عمیرؓ اتنے چھوٹے تھے کہ ان کی تلوار کا پرتلا حضرت سعدؓ باندھا کرتے تھے۔ حضرت عمیرؓ کو شہادت کی تمنا تھی۔ خدا نے وہ تمنا پوری کر دی۔ چنانچہ شہدائے بدر میں ایک وہ بھی تھے۔

رسولِ خدا کے دربار میں حضرت سعدؓ کو بڑی برتری حاصل تھی، جب فتح مکّہ کے بعد حضرت سعدؓ وہاں بیمار پڑے

گئے تو آپؐ نے ان کی عیادت فرمائی اور خدا سے ان کی شفا کے لئے دعا مانگی تاکہ انھیں اس سرزمین میں موت نہ آئے جہاں سے وہ ہجرت کر چکے تھے۔ آپؐ نے حضرت سعدؓ کی اسی بیماری کے دوران میں وہ وصیت والی حدیث فرمائی تھی جس کی رو سے کوئی آدمی اپنے مال کے تہائی حصّہ سے زیادہ وصیت کرنے کا مجاز نہیں ہےؔ۔ آپ حضرت سعدؓ کو بیماری کی وجہ سے مکّہ چھوڑکر مدینہ تشریف لے گئے۔ مگر جاتے ہوئے ایک صحابی کو ان کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کرکے اسے ہدایت فرمائی "اگر میرے بعد سعدؓ فوت ہوجائیں تو انھیں" وہاں دفن کیا جائے"۔ آپؐ کا اشارہ مدینہ کے راستہ میں ایک مقام کی طرف تھا۔ پھر حضرت سعدؓ کو مخاطب کرکے کہا مجھے خدا سے اُمید ہے کہ وہ تمھیں صحت دے کر تمہارے ہاتھوں سے ایک قوم کو نفع پہنچائے گا اور دوسری کو نقصان پہنچائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے خدا سے یہ التجا کی تھی کہ حضرت سعدؓ جو دعا مانگیں وہ قبول فرمانا۔ خدائے تعالیٰ نے آنحضرتؐ کی دعا قبول فرمائی۔ حضرت سعدؓ اس مرض سے شفایاب ہوگئے اور وہ اس وقت تک زندہ رہے کہ ان کے ہاتھوں خدا نے ایک قوم کو سخت سزا دی اور دوسری کو فائدہ پہنچایا۔ یہی جنگ قادسیہ کے ہیرو ہیں جنھوں نے کسریٰ کے عساکر کو شکست فاش دی تھی۔

حضرت عمرؓ نے جن چھ اصحابؓ کو باہمی مشورہ سے مسئلہ خلافت طے کرنے کے لئے مقرر کیا تھا ان میں ایک حضرت سعدؓ بھی تھے۔ گویا حضرت سعدؓ خود بھی خلافت کے اُمیدوار تھے لیکن حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اپنی طرح انھیں بھی اس مطالبہ سے دستبردار کرلیا۔

حضرت سعدؓ کی بہت سی بیویاں تھیں لیکن وہ سب عرب کے مختلف قبائل کی تھیں۔ خاندانِ قریش میں انھوں نے ایک ہی شادی کی تھی جو ان کی طرح قبیلہ زہرہ سے تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ان کے نسب کو مشکوک سمجھتے تھے اور اس سلسلہ میں انھیں ستاتے رہتے تھے۔ آخر ایک روز پریشان ہوکر حضرت سعدؓ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس آئے اور دریافت کیا" یارسول اللہؐ! میں کون ہوں" ؟ آپؐ نے فرمایا "تم سعد بن مالک بن وہیب بن عبد مناف بن زہرہ ہو جو اس کے سوا کچھ کہے اس پہ خدا کی پھٹکار" میرا خیال ہے کہ اسی وجہ سے حضرت سعدؓ نے قریش میں کم شادیاں کی تھیں۔ بعض راویوں کا خیال ہے کہ مجلس شوریٰ کے دوران حضرت سعدؓ حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانے کے حامی تھے، اور اس ضمن میں انھوں نے حضرت عبدالرحمٰنؓ سے تبادلۂ خیال بھی کیا تھا، اس بات کے غلط یا صحیح ہونے کے امکانات ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بعد منتخب ہونے والے خلیفہ کے لئے یہ وصیت فرمائی تھی کہ اگر حضرت سعدؓ خلیفہ نہ بن سکیں تو انھیں کسی علاقہ کا والی

؎ چونکہ یہ حدیث قرآن کے حکم خلاف ہے اس لئے صحیح نہیں ہوسکتی۔

مقرر کر دیا جائے کیونکہ انہوں نے (عمرؓ نے) حضرت سعدؓ کو کسی خیانت کی وجہ سے معزول نہیں کیا تھا حضرت عثمانؓ نے اس وصیت کو عملی جامہ پہنایا اور حضرت سعدؓ کو سال سوا سال کوفہ کا والی مقرر کئے رکھا۔ پھر انہیں معزول کر کے ان کی جگہ ولید کو متعین کیا۔ ہم پچھلے صفحات میں کہیں اس واقعہ پر اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ جو حضرت سعدؓ کی معزولی کا سبب بیان کیا جاتا ہے۔ اپنے پچھلے بیان میں ہم صرف اتنا اضافہ اور کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت سعدؓ کے بیت المال سے قرضہ لینے کی وجہ سے ان کے اور حضرت مسعودؓ کے مابین جو جھگڑا پیدا ہوا تھا اس کے متعلق یہ بھی روایت ہے کہ درحقیقت یہ جھگڑا ولید بن عقبہ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے مابین واقع ہوا تھا گمان اغلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس قصہ کو حضرت سعدؓ کی طرف منسوب کیا ہے انھوں نے سہواً یا عمداً ولید اور سعد کو باہم خلط ملط کر دیا ہے۔ کچھ بھی ہو بہرحال حضرت سعدؓ نے حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر جو بیعت کی تھی انھوں نے اسے وفاداری کے ساتھ آخر دم تک نبھایا، اپنی معزولی پر وہ غصہ ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں بہرکیف انھوں نے سخت مخالفت کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان کی مخالفت اسی حد تک تھی جہاں تک نرمی خیرخواہی اور امر بالمعروف کا تعلق ہے۔ جب یہ مخالفت شدت اختیار کر کے بغاوت کے قریب پہنچنے لگی تو حضرت سعدؓ نے علیحدگی اور غیر جانبداری اختیار کر لی۔ لہٰذا وہ نہ اس شورش میں شریک ہوئے اور نہ اس کے عواقب میں۔ ان سے جب بھی یہ بحث کی گئی کہ وہ کیوں شریکِ جنگ نہیں ہوتے تو وہ یہی جواب دیا کرتے کہ میں تو صرف اسی وقت شریکِ جنگ ہو سکوں گا۔ جب تم مجھے کوئی ایسی تلوار لا دو جو بولتی ہو اور بتاتی ہو کہ یہ مومن ہے اور یہ کافر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعدؓ اس الجھن میں بھی مبتلا تھے کہ اگر وہ حضرت عثمانؓ کے حق میں نفرت و بیزاری کا اظہار کریں گے تو لوگ ان پر الزام لگائیں گے کہ ان کی مخالفت درپردہ حضرت عثمانؓ کے خلاف انتقامی کارروائی ہے جنھوں نے انھیں کوفہ کی گورنری سے برطرف کر دیا تھا، خواہ کچھ بھی ہو حقیقت یہ ہے کہ حضرت سعدؓ اپنے اسی طرزِ عمل پر کاربند رہے جس پر وہ عہد نبویؐ میں کاربند تھے۔ جب تک انھوں نے جہاد کی روح دیکھی وہ عہد نبویؐ میں اور عہد عمرؓ میں مصروف جہاد رہے۔ لیکن جب ان کی نگاہوں میں معاملہ مشکوک ہو گیا تو انھوں نے کنارہ کشی اختیار کر لی اور لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا، ۵۰ھ یا ۵۵ھ میں جب انھوں نے وفات پائی تو امہات المؤمنین نے درخواست کی کہ ان کا جنازہ ہمارے پاس سے گزار کر لے جایا جائے۔ چنانچہ ان کا جنازہ مسجدِ نبویؐ میں لے جایا گیا اور ازواجِ رسولؐ نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ حضرت سعدؓ نے اپنے بعد کوئی بڑی دولت نہیں چھوڑی، انھوں نے دو اور تین لاکھ کے درمیان سرمایہ چھوڑا جو ان کے دوسرے ساتھیوں کی نسبت سے کوئی حیثیت نہیں رکھتا جس کی کچھ تفصیل آپ معلوم کر چکے ہیں اور کچھ آپ آیندہ صفحات میں معلوم کر لیں گے۔

سولھواں باب

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار تھے وہ آپ کی پھوپھی صفیہ بنت عبدالمطلب کے صاحبزادے تھے۔ اسی طرح ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہما سے بھی ان کی قریبی رشتہ داری تھی۔ حضرت زبیر کا شجرۂ نسب یہ ہے۔ زبیر بن عوام بن خویلد بن اسد بن عبد العزیٰ بن قصیّ۔ (خویلد حضرت خدیجہؓ کے والد تھے) یعنی حضرت خدیجہؓ ان کی پھپھی تھیں، اور وہ حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی تھے، اور حضرت فاطمہ ان کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ حضرت زبیرؓ کی حضرت ابوبکرؓ سے بھی قریبی رشتہ داری تھی وہ حضرت ابوبکرؓ کے داماد تھے کیونکہ ان کی صاحبزادی حضرت اسماء ذات النطاقینؓ ان کے عقد میں تھیں۔ اس طرح رسولِ خدا سے ان کی قرابت اور بھی بڑھ گئی تھی یعنی وہ ان کے ہم زلف بھی تھے۔ کیونکہ ام المؤمنین حضرت عائشہ اور حضرت اسماءؓ بہنیں تھیں۔ اس لحاظ سے گویا حضرت زبیرؓ آلِ بیت نبیؐ میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ ایک روز جب حضرت عثمانؓ اور حضرت زبیرؓ میں باہم جھگڑا ہوا اور حضرت زبیرؓ نے کہا "میں صفیہ کا بیٹا ہوں" تو حضرت عثمانؓ نے جواب دیا "اسی نے تو تمھیں سایہ سے قریب کر دیا ورنہ تم دھوپ میں پڑے ہوتے"۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صفیہ نے انھیں سایہ سے قریب کر دیا تھا لیکن اگر وہ نہ ہوتیں تب بھی حضرت زبیرؓ دھوپ میں نہ ہوتے۔

حضرت زبیرؓ بچپن ہی سے قوت و شجاعت، جنگ آزمائی و پیش قدمی میں مشہور تھے۔ وہ پہلے پہل اسلام لانے والوں میں سے تھے، جنگ بدر کے صرف دو گھڑ سواروں میں سے ایک وہ تھے۔ بدر کے بعد بھی حضور اکرمؐ کے دوش بدوش ہر معرکہ میں شریک رہے آنحضورؐ انھیں اپنا حواری کہا کرتے تھے۔ چنانچہ تمام مسلمان آپ کو حواریؐ رسولؐ کہنے لگ گئے تھے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ حضرت زبیرؓ کی دولت مندی کا آغاز کیونکر ہوا۔ البتہ ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ ان کو نئی نئی دولت

نہیں ملی تھی ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ جنگ بدر میں شریک ہونے والے دو گھڑ سواروں میں سے ایک حضرت زبیرؓ تھے۔ رسولؐ خدا کی وفات کے بعد آپ مدینہ ہی کے ہو کر رہ گئے۔ وہ حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کے عہد میں مدینہ سے باہر نکلے اگر نکلے بھی تو حضرت عمرؓ کی اجازت سے یا حج کی خاطر۔ حضرت عمرؓ نے انھیں بھی مجلس شوریٰ کا رکن مقرر کیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی خلافت کے امیدوار تھے انھوں نے نہ تو حضرت علیؓ کی جانب جھکاؤ ظاہر کیا نہ حضرت عثمانؓ کی طرف۔ پھر انھوں نے بلا دقت تمام اختیار حضرت عبدالرحمنؓ کو سونپ دیا حضرت عثمانؓ خلافت ملنے کے بعد انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت عثمانؓ نے انہیں چھ لاکھ درہم عطا کئے تو وہ لوگوں سے مشورہ کرتے رہتے تھے کہ کس چیز میں رقم لگانا زیادہ سودمند ہے۔ چنانچہ انہیں بتایا گیا کہ زمین پر ـــــــ لہٰذا، انھوں نے عراق کے دونوں صوبوں (کوفہ و بصرہ) اور مصر میں زمین خرید لی۔ ابن سعدؒ ہی کا بیان ہے کہ حضرت زبیرؓ یہ پسند نہ کرتے تھے کہ لوگ ان کے پاس امانتیں رکھیں۔ جب بھی کوئی آدمی ان کے پاس کوئی مال بطور امانت جمع کرانا چاہتا تو وہ کہتے یہ مال مجھ پر قرض ہوگا۔ وہ ایک طرف تو امانت کے ضائع ہونے کا خوف کھاتے تھے اور دوسری طرف ان رقوم کو قرض لے کر انھیں نفع بخش کاروبار میں لگا کر ان کا نفع اپنے لئے حلال کر لیتے تھے۔ اس طرح ایک تو ان کی دولت اتنی بڑھ گئی کہ وہ امیری میں ضرب المثل بن گئے دوسرے ان پر لوگوں کے بڑے بڑے قرضے بھی بار بن گئے جنگ جمل کے موقع پر انھوں نے اپنے فرزند عبداللہؓ کو وصیت کی کہ وہ ان کے مال سے ان کا تمام قرضہ اتار دیں۔ اور جب قرضہ سے سبکدوش ہو جائیں تو باقی میراث کا ایک تہائی اپنے لڑکے کے لئے رکھ لیں اور جو کچھ بچے اسے دیگر وارثوں میں تقسیم کر دیں۔ نیز انھیں یہ ہدایت کی کہ اگر کسی قرضہ کی ادائیگی دشوار معلوم ہو تو خدا سے استعانت کی جائے۔ چنانچہ عبداللہ بن زبیرؓ کو اپنے والدِ بزرگوار کا قرض ادا کرتے وقت جب بھی مشقت کا سامنا ہوتا وہ مولائے زبیرؓ یعنی خدائے تعالےٰ سے طالب اعانت ہوتے۔

بہت سے قرض خواہوں نے چاہا کہ وارثوں کے حق میں قرض سے دستبردار ہو جائیں۔ مگر حضرت عبداللہؓ نے اس بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور تمام قرض خواہوں کی ساری رقم ادا کر دی۔ یہ رقم چھبیس لاکھ درہم تھی عبداللہ بن زبیرؓ چار برس تک موسم حج میں منادی کراتے رہے کہ جس کو حضرت زبیرؓ سے کچھ لینا ہو وہ ہمیں اطلاع دے۔ حضرت زبیرؓ کے وارثوں کو میراث میں سے جو رقم ملی تھی اس کے متعلق لوگوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کم سے کم بتانے والوں کا خیال ہے کہ وارثوں نے ساڑھے تین کروڑ درہم باہم تقسیم کئے زیادہ سے زیادہ بتانے والوں کا کہنا ہے کہ یہ رقم سوا پانچ کروڑ درہم تھی لیکن اعتدال پسندوں کا بیان یہ ہے کہ یہ رقم کوئی چار کروڑ درہم تھی ـــــــ ـــــــ اس میں اچنبھے اور حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ حضرت زبیرؓ کی ملکیت میں کئی اقطاع فسطاط میں

تھے کئی اقطاع اسکندریہ میں کئی بصرہ میں اور کئی کوفہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ اکیس مکان مدینہ شریف میں تھے۔ علاوہ ازیں متعدد ذرائع آمدنی اور دیگر جائدادیں اور ساز و سامان بھی تھا۔

یہ عیاں ہے کہ ابتداءً حضرت زبیرؓ نے حضرت عثمانؓ کی مخالفت میں کوئی سختی اختیار نہ کی تھی کیونکہ حضرت عثمانؓ اس جھگڑے کے باوجود جو ایک زمانہ تک ان دونوں میں رہا تھا حضرت زبیرؓ کے ساتھ ترجیحی سلوک کرتے تھے اور انھیں انعامات عطا کرتے رہتے تھے۔ حضرت عثمانؓ عبداللہ بن زبیرؓ سے بھی محبت کرتے تھے اور انھیں دوسروں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ چنانچہ جب ان کے گھر کا محاصرہ ہوا تو انھوں نے حضرت عبداللہؓ ہی کو اپنے گھر کی مدافعت پر مامور کیا۔ نیز اپنا وصیت نامہ بھی حضرت عبداللہؓ کے حوالہ کیا کہ اپنے والد حضرت زبیرؓ کو پہنچا دیں۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت زبیرؓ کو کچھ وصیتیں بھی کی تھیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ حضرت زبیرؓ بھی دیگر صحابہؓ کے ساتھ حضرت عثمانؓ کی تنقید و نصیحت میں شریک تھے مگر اس مشارکت کے علاوہ اگر انھوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف کوئی سخت کارروائی کی ہے تو وہ ہمارے علم میں نہیں ہے۔

سترھواں باب

حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ

حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ کا تعلق قبیلہ بنی تیم کی اس شاخ سے تھا جس میں حضرت ابوبکرؓ تھے، دورِ جاہلیت میں وہ تجارت کرتے تھے، یہ حضرت عثمانؓ کے دوستوں میں سے تھے اور ان دونوں اصحاب نے جس سال اسلام قبول کیا۔ اسی سال بغرض تجارت اکٹھے شام کی طرف گئے۔ حضرت طلحہؓ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح السابقون الاولون میں سے تھے۔ اسلام لانے کے بعد ان کی تجارتی سرگرمیاں جاری رہیں، وہ تجارت کے سلسلے میں شام جاتے رہتے تھے۔ جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کی معیت میں مدینہ ہجرت کر کے جا رہے تھے تو حضرت طلحہؓ شام سے واپسی میں انہیں راستے میں ملے۔ حضرت طلحہؓ نے دونوں کی خدمت میں تحفے پیش کئے اور انہیں اطلاع دی کہ مدینہ کے مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں، اس پر آپؐ نے مدینہ والوں کے زحمتِ انتظار کو کم کرنے کے لئے اپنی سواری کو تیز تر کر دیا، حضرت طلحہؓ مکہ چلے گئے۔ پھر وہاں اپنا بندوبست مکمل کر کے مدینہ شریف میں رسولِ خداؐ سے آ ملے۔ اور اپنے باقی مہاجر ساتھیوں کی طرح آپؐ کے ساتھ رہنے لگے۔

حضرت طلحہؓ بدر و اُحد اور باقی تمام جنگوں میں بھی رسولِ خدا کے دوش بدوش شریک رہے۔ اور مردانہ وار کڑیاں جھیلیں جنگِ احد میں رسولِ خدا کی نہایت بہادری سے مدافعت کی۔ ایک تیر کو جو آپؐ کی طرف آ رہا تھا اپنے ہاتھ سے روکا وہ انگلی پر لگا جس سے ایک انگلی شل ہو گئی۔ اسی جنگِ احد میں حضرت طلحہؓ کے تمام جسم پر زخم لگے تھے۔ حتیٰ کہ آنحضورؐ فرمایا کرتے تھے "جسے زمین پر ایک چلتا پھرتا شہید دیکھنا ہو وہ طلحہ بن عبیداللہؓ کو دیکھے" اس سے آپؐ کی مراد یہ تھی کہ حضرت طلحہؓ جنگ احد میں موت کے منہ سے نکل کر آئے ہیں۔ لہٰذا، ان کا رتبہ شہداء کا سا ہے گمان اغلب یہ ہے کہ رسولِ خدا کے اس قول میں ان کی بیعت کی بھی شہادت ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا (۳۳/۲۳)

مسلمانوں میں بہت سے وہ افراد ہیں جنھوں نے خدا سے کیا ہوا عہد پورا کر دکھایا چنانچہ ان میں سے کچھ وہ ہیں جنھوں نے اپنی جانیں دے دیں اور کچھ وہ ہیں جو موقع کے منتظر ہیں (تاکہ وہ بھی جان دے دیں) اور انھوں نے اپنے عہد میں کوئی ردو بدل نہیں کیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ خدا حضرت طلحہؓ کو جنگ احد کے شہداء کے ساتھ جن میں حضرت حمزہؓ اور حضرت مصعب بن عمیرؓ شامل ہیں ملانا چاہتے تھے۔

حضرت طلحہؓ بدستور تجارت کرتے رہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں شرکت کے علاوہ کوئی چیز ان کی تجارتی سرگرمیوں میں حائل نہ ہو سکی۔ حضرت طلحہؓ عہد ابو بکرؓ و عمرؓ میں دوسرے جلیل القدر صحابہ کی طرح مدینہ ہی میں مقیم رہے۔ حضرت عمرؓ نے انھیں "مجلسِ شوریٰ" کا رکن مقرر کیا تھا مگر وہ اس میں شرکت نہ کر سکے کیونکہ وہ حضرت عمرؓ کی وفات کے وقت بہ سلسلۂ تجارت مدینہ شریف سے غیر حاضر تھے۔ ان کے ساتھیوں نے انھیں جلد ہی بلانے کے لئے پیغامات بھیجے۔ چنانچہ حضرت طلحہؓ بسرعت تمام مدینہ شریف پہنچ گئے۔ لیکن اس وقت تک حضرت عثمانؓ کے حق میں بیعت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

حضرت طلحہؓ کو یہ بات ناگوار گزری کہ اصحاب شوریٰ نے ان سے بالا بالا ہی مسئلہ خلافت کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ وہ گھر میں بیٹھ رہے۔ اور کہا کہ میرے جیسے شخص کو یوں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ان کے پاس دوڑے گئے اور ان سے حضرت عثمانؓ کی بیعت کرنے کو کہا اور انھیں مخالفت کے انجام بد سے ڈرایا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے خود حضرت عثمانؓ ان کے پاس گئے اور کہا کہ اگر آپ چاہیں تو میں خلافت کو واپس کر دیتا ہوں حضرت طلحہؓ نے کہا "کیا آپ اس پر تیار ہیں؟" حضرت عثمانؓ نے جواب دیا "ہاں" حضرت طلحہؓ نے کہا تو پھر میں اس فیصلہ کی تنسیخ نہیں چاہتا۔ اگر آپ چاہیں تو میں اسی مجلس میں آپ کی بیعت کر لیتا ہوں، اور اگر چاہیں تو...... ...... مسجد نبوی میں چلے چلتے ہیں۔ بنو امیہ کو خطرہ تھا کہ حضرت طلحہؓ حضرت عثمانؓ کی بیعت کرنے میں ہچکچائیں گے لیکن جب انھوں نے بیعت کر لی تو وہ مطمئن ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ حضرت طلحہؓ کی رضا جوئی بطرزِ احسن کرتے رہے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت طلحہؓ نے حضرت عثمانؓ سے پچاس ہزار درہم قرض لئے تھے ایک روز انھوں نے آکر حضرت عثمانؓ سے کہا کہ آپ کا مال حاضر ہے کسی کو بھیجئے کہ لے آئے۔ حضرت عثمانؓ نے کہا "وہ آپ کا ہو چکا، آپ اس مال کو اپنی مروت و سخاوت کے لئے اعانت سمجھیں" کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت طلحہؓ کو دو لاکھ درہم دیئے تھے۔ حضرت طلحہؓ اور

حضرت عثمانؓ کے مابین کئی تجارتی سودے طے ہوئے تھے۔ حضرت طلحہؓ اپنا مال حجاز میں بیچتے تھے اور حضرت عثمانؓ خریدتے تھے۔ عراق میں حضرت عثمانؓ اپنا مال بیچتے تھے اور حضرت طلحہؓ اسے خریدتے تھے۔ حضرت طلحہؓ بڑے مخیر دنیا میں تھے اپنے گھر میں نقد سال رکھنا انھیں کبھی پسند نہ تھا۔ جب ان کے پاس نقد مال بڑی مقدار میں جمع ہو جاتا تو وہ اس وقت تک چین نہ لیتے تھے جب تک وہ اسے اپنے تمیمی قرابت داروں اور قریشی اور انصاری احباب میں تقسیم نہ کر دیتے تھے۔ محتاج کی امداد کرنے اور قرض دار کا قرض اتارنے میں وہ نہایت مستعد اور پیش پیش رہتے تھے۔ وہ مال اور لباس بہت زیادہ تقسیم کرتے تھے اور غریبوں کو کھانا کھلانے میں بھی بڑی سخاوت سے کام لیتے تھے، ان تمام اخراجات کے باوجود ان کے پاس بڑی دولت تھی، اور ان کی دولت و سخاوت ہی کا چرچا تھا جس پر بات بڑھنے کی وجہ سے کوفہ میں سعید بن العاص کی مجلس میں ہنگامہ بپا ہو گیا تھا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

راویوں کے بیان کے مطابق حضرت طلحہؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے سرزمین حجاز میں گندم کی کاشت کرائی، جب وہ فوت ہوئے تو ان کا ترکہ تین کروڑ درہم تھا جس میں بائیس لاکھ درہم اور دو لاکھ دینار نقد تھے باقی دیگر ساز و سامان جائدادیں اور املاک وغیرہ تھیں۔

حضرت طلحہؓ جیسا کہ آپ نے دیکھا خلافت عثمانؓ کے پہلے دن سے مخالف تھے اس لئے کہ خلافت کا معاملہ ان کی غیر حاضری میں طے کیا گیا تھا لیکن حضرت عثمانؓ نے انھیں منا لیا تھا۔ اور اس طرح ان کے باہمی تعلقات سدھر گئے تھے، پھر حضرت عثمانؓ نے انھیں اچھی طرح مال و دولت سے نوازا، تو تعلقات مستحکم تر ہو گئے۔ لیکن کچھ مدت بعد جب حضرت عثمانؓ کے بارے میں مخالفانہ سرگرمیاں ظہور میں آنے لگیں تو وہ بھی ان میں شریک ہو گئے۔ جب یہ مخالفت شدت اختیار کر گئی تو حضرت طلحہؓ اس کے سرغنوں میں تھے۔ جب حضرت عثمانؓ کا محاصرہ کیا گیا تو حضرت طلحہؓ محاصرین میں شامل تھے۔ جب حضرت عثمانؓ شہید ہوئے تو حضرت طلحہؓ ان لوگوں میں سے تھے جو قتل عثمانؓ پر حضرت علیؓ کے رنج و غم کو حیرت و تعجب کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جب حضرت علیؓ کی بیعت کی گئی تو حضرت طلحہؓ بھی حضرت زبیرؓ کے ساتھ بیعت میں شریک تھے۔ مگر بعد میں حضرت علیؓ کی بیعت توڑ کر حضرت زبیرؓ کی معیت میں حضرت عثمانؓ کے خون کا مطالبہ کرتے ہوئے نکل گئے۔ حضرت طلحہؓ جنگ جمل میں کام آئے۔ راویوں کا بیان ہے کہ انھیں مروان بن حکم نے قتل کیا تھا۔ مروان نے جب انھیں اپنے تیر سے گھائل کر دیا تو اس نے کہا "مجھ طلحہؓ کے بعد اب خون عثمانؓ کا دعویٰ کبھی نہ کروں گا۔"

مروان کے خیال میں حضرت طلحہؓ قتل عثمانؓ بپا کرانے والوں کے سرغنہ تھے۔ جب حضرت طلحہؓ کو تیر لگا اور ان کا خون بہنا بند نہ ہوا تو انھوں نے کہا یہ تیر خدا کا فرستادہ ہے۔ اے خدا مجھ سے خونِ عثمانؓ کا اتنا بدلہ لے لے کہ تو راضی ہو جائے۔ بہر صورت حضرت طلحہؓ کی دشمنی ایک خاص نوعیت کی مالک تھی۔ جب تک ان کی قدر و منزلت ہوتی رہی اور انھیں دولت ملتی رہی وہ راضی رہے مگر جب طمع کا دامن دراز ہوا تو عداوت اختیار کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسروں کو بھی ہلاک کیا اور خود بھی ہلاک ہو گئے۔

اٹھارواں باب

حضرت علی بن ابی طالب رضؓ

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت علیؓ کی قرابت محتاجِ بیان نہیں۔ بلاشک حضرت علیؓ کی قدر و منزلت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی۔ ابوطالبؓ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مہربانیاں مشہور ہیں۔ انھوں نے آپؐ کی اور آپؐ کے دین کی قریش کے مقابلہ میں جو مدافعت و حمایت کی تھی وہ سب پر روشن ہے۔ ابوطالب نے رسولِ خداؐ کی ان کے بچپن میں کفالت کی تھی۔ اور جب ابوطالب کثیر الاولاد اور تنگ دست ہوگئے تو آپؐ نے حضرت علیؓ کی بچپن میں کفالت فرمائی۔ جب آپؐ کو نبوت عطا ہوئی اس وقت حضرت علیؓ بچہ تھے اور آپ ہی کے گھر میں تھے۔ اس طرح حضرت علیؓ نو برس یا گیارہ برس کی عمر میں اسلام لے آئے۔ اسلام لانے کے بعد بھی وہ آغوشِ رسول ہی میں رہے۔ چنانچہ انھوں نے آپؐ کی اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ کی نگرانی میں پرورش پائی۔ وہ بتوں کا تصور ہی نہ رکھتے تھے کیونکہ وہ سنِ شعور سے قبل ہی مسلمان ہوگئے تھے۔ انھیں السابقون الاولون میں یہ امتیاز حاصل تھا کہ ان کی نشو و نما اور پرورش خاص اسلامی ماحول میں ہوئی تھی۔ یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ انھوں نے صحیح معنوں میں خانۂ وحی میں نشو و نما پائی تھی۔

جب رسولِ خداؐ نے مدینہ ہجرت فرمائی تو اپنے پاس رکھوائی ہوئی امانتیں ان کے مالکوں کو واپس کرنے کے لئے حضرت علیؓ کو اپنا قائم مقام بناگئے۔ چنانچہ حضرت علیؓ مکہ میں تین دن رہے اور پھر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے مدینہ کے راستہ میں مقام قبا پر جا ملے۔

سیرت کے راوی بیان کرتے ہیں کہ جس رات قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کرنے کی سازش کی تھی اس رات حضرت علیؓ آپ کے بستر پر سوئے رہے۔ جب آنحضرتؐ مدینہ شریف پہنچے اور باہم مہاجرین میں اور پھر مہاجرین و انصار میں مؤاخات قائم کی تو حضرت علیؓ کی مؤاخات اپنے ساتھ اور ازاں بعد سہل بن حنیف انصاریؓ کے ساتھ قائم کی۔

اسی طرح حضرت علیؓ رشتہ میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور آپؐ کے گھر میں پرورش پائے ہوئے تھے۔ پھر وہ ہجرت میں آپؐ کے بھائی تھے آپؐ نے اپنی صاحبزادی فاطمۃ الزہراؓ کی شادی بھی ان سے کردی تھی۔ اور انہی دونوں سے آپؐ کی نسل متناسل موجود ہے۔ حضرت علیؓ ہر جنگ میں رسولِ اقدسؐ کے علمدار رہے۔ وہ بڑے شجاع جنگ میں آگے بڑھنے والے، جری اور غیر معمولی قوت کے مالک تھے۔ جب رسولِ خدا غزوۂ تبوک کے لئے نکلے تو اپنے گھر والوں کی دیکھ بھال کے لئے انھیں اپنا قائم مقام مقرر فرمایا یہ بات حضرت علیؓ کو ناگوار گذری یا لوگوں میں اس پر چہ میگوئیاں ہوئیں تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: "اے علی! کیا تم اسے پسند نہیں کرتے کہ تمہاری میرے یہاں وہی منزلت ہو جو ہارونؑ کی موسیٰؑ کے یہاں تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ میرے بعد نبی کوئی نہ ہوگا۔" جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا تو آپؐ نے خلافت کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں فرمایا تھا بے شک آپؐ نے اپنی بیماری کے دوران میں اتنا فرمایا تھا "ابوبکرؓ سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔" چنانچہ جب لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ کو منتخب کیا انھوں نے کہا تھا کہ رسولِ خدا نے ابوبکرؓ کو ہمارے دین کے لئے پسند فرمایا۔ ہم انہی کو اپنی دنیا کے لئے کیوں نہ انتخاب کرلیں میں نہیں چاہتا کہ شیعہ اور ان کے مخالفین کے مابین بیعت عمرؓ و ابوبکرؓ سے متعلق جو جھگڑا ہے اس میں دخل اندازی کروں۔ تاہم یہ حقیقت صفحاتِ تاریخ پر ثبت کرتا ہوں کہ حضرت علیؓ نے ان ہر دو بزرگوں کی بیعت بڑے خلوص کے ساتھ کی تھی، صدقِ دل سے ان کی خیر خواہی کی، اور جب بھی ان دونوں میں سے کسی کو ان کے مشورہ کی ضرورت پڑی تو انھوں نے اپنا نیک مشورہ دینے میں کبھی دریغ نہ کیا۔ اگر رسولِ خدا کی وفات کے بعد لوگ یہ کہتے کہ حضرت علیؓ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے قریبی رشتہ دار تھے، وہ آپؐ کے پروردہ یافتہ تھے۔ امانتوں کی ادائیگی کے لئے وہ آپؐ کے قائم مقام ہوئے تھے، مؤلفات کی رو سے وہ آپؐ کے بھائی بنے تھے۔ آپؐ کے داماد اور آپؐ کی آئندہ نسل کو جاری رکھنے والے تھے، آپؐ کے علمدار ——— نیز آپؐ کے اہلِ خانہ کی دیکھ بھال کے لئے آپؐ کے جانشین تھے۔ اور خود آپؐ ہی کے فرمودہ کے مطابق ان کی منزلت وہی تھی جو ہارونؑ کی موسیٰؑ کے یہاں تھی ——— غرضیکہ اگر مسلمان ان تمام باتوں کے پیشِ نظر حضرت علیؓ کو خلیفہ منتخب کر لیتے تو ان کا یہ فعل کسی غلطی یا فروگذاشت پر محمول نہ کیا جاتا ——— کہا جاتا ہے کہ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب نے حضرت علیؓ کی بیعت کرنی چاہی تھی، لیکن حضرت علیؓ نے امت میں فرقہ بندی کو ناپسند کرتے ہوئے انکار کر دیا۔ چنانچہ حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت راشدہ کے دوران میں حالات اسی نہج پر چلتے رہے۔ پھر حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کو رکنِ شوریٰ تو مقرر کر دیا مگر ان کے حق میں کوئی خصوصی وصیت نہ کی۔ تاہم انھوں نے یہ ضرور فرمایا تھا "اگر لوگ علیؓ کو خلیفہ منتخب کرلیں تو وہ انھیں راہِ راست سے منحرف نہ ہونے دیں گے۔"

حضرت عمرؓ نے دو وجوہ کی بنا پر حضرت علیؓ کے حق میں وصیت نہ کی تھی۔ ایک یہ کہ بقول خویش وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ زندگی اور موت دونوں حالتوں میں ان پر مسلمانوں کے معاملات کا بار پڑ جائے۔ دوسرا مطلب یہ تھا کہ قریش کی اکثریت اس خوف سے خلافت کو بنی ہاشم سے دور رکھنا چاہتی تھی کہ کہیں وہ وراثتاً انہی میں منتقل نہ ہوتی جائے اور پھر کبھی بھی وہ قریش کے کسی اور قبیلہ کے حصہ میں آئے۔ لہٰذا بنی ہاشم کو خلافت سے دانستہ طور پر دور رکھا گیا، قریش نے بنو ہاشم کو اس لئے خلافت سے دور رکھا کہ کہیں وہ بنو ہاشم کی رعایا نہ بن جائیں اور اس لئے بھی کہ پھر کبھی قریش کے کسی گھرانہ میں خلافت نہ آسکے گی۔

ان دو وجوہ کی بنا پر حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کے حق میں بھی وصیت نہ کی تھی، ایک تو یہ کہ وہ مسلمانوں کے معاملات کا بار زندگی اور موت دونوں حالتوں میں اٹھانے سے خائف تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انھیں حضرت عثمانؓ سے ڈر تھا کہ وہ خلافت کے معاملہ میں بنو امیہ کو دوسرے تمام قریشی قبائل پر ترجیح دیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عباس بن عبدالمطلب نے حضرت علیؓ کو اشارۃً کہا تھا کہ وہ شوریٰ میں شمولیت نہ کریں اور ذمہ لیا تھا کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو لوگ ان کو خلیفہ بنانے میں کوئی مخالفت نہ کریں گے۔ لیکن حضرت علیؓ نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور دیگر مسلمانوں کی طرح حضرت عمرؓ کی وصیت کو قبول کر لیا۔ اس طرح انھوں نے بیعت عمرؓ کا حضرت عمرؓ کی زندگی اور موت دونوں حالتوں میں ایفا کیا۔ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد تمام باتیں حضرت علیؓ کے حق میں تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی قرابت اسلام لانے میں سبقت، مسلمانوں میں ان کی عزت و منزلت، راہِ خدا میں مردانہ وار مقابلہ اور آزمائشوں میں پورا اترنا، صاف اور سید ھا طرزِ عمل، معاملات دین میں شدت کتاب و سنت کا تفقہ اور پیش آمدہ مشکلات میں استقامت رائے، غرض ہر اعتبار سے حضرت علیؓ خلافت کے مستحق تھے۔

اگر مسلمانوں کو اس میں باک تھا کہ وہ حضرت علیؓ کو حضرت ابو بکرؓ کے مقابلے میں اوّلیت دیں کیونکہ حضرت ابو بکرؓ کا رتبہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں عالی تھی۔ وہ غار کے ثانی اثنین تھے۔ اور اس لئے کہ انھوں نے نماز کی امامت میں قائم مقامی کی تھی۔ یا اگر اس میں باک تھا کہ وہ حضرت علیؓ کو حضرت عمرؓ کی بلند و بزرگ شخصیت پر ترجیح دیں جب کہ حضرت ابو بکرؓ نے بھی ان کی خلافت کے لئے وصیت فرمائی تھی تو اب یعنی حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد وہ بے کھٹکے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنا سکتے تھے۔ اس میں کوئی خرابی اور حرج واقع نہ ہوتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کو خلافت کا امیدوار قرار دیا۔ خود ان کا بلند مرتبہ بھی اس استحقاق کا متقاضی تھا۔ علاوہ ازیں ان کو بہت سے عرب قبائل کی بالعموم اور قریش کی بالخصوص تائید حاصل تھی جیسے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو حاصل تھی، اس لئے کہ حضرت علیؓ نے قریش، مضر، ربیعہ اور یمن کے قبائل میں شادیاں کی تھیں۔ اور ان سب بیویوں سے اولاد تھی۔ لہٰذا، اگر لوگوں میں افتراق ہونے سے قبل وہ خلیفہ بن جاتے تو یقیناً

وہ اہل تھے کہ مختلف اور متباعد عصبیتوں کو باہم قریب کر دیتے، لوگ ان کی اطاعت میں ایک مرکز پر جمع ہو جاتے اور بقول حضرت عمرؓ وہ اُمّت کو راہ راست سے بھٹکنے نہ دیتے۔ لیکن مسلمانوں نے انھیں دو باتوں کی وجہ سے منتخب نہ کیا ایک تو یہ کہ اگر خلافت بنی ہاشم میں کسی کو مل گئی تو پھر وہیں جم جائے گی۔ حالانکہ واقعات سے یہ ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ خلافت کو وراثتاً منتقل کرنے کے خواہشمند نہ تھے۔ ان کا طرزِ عمل وہی تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمرؓ کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے بعد کسی کی خلافت کے لئے وصیت نہ کی تھی۔

دوسری بات یہ تھی کہ حضرت علیؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی پیش کردہ شرط کہ وہ قرآن، سنت رسول اللہ اور طریقہ ابوبکرؓ و عمرؓ سے کسی معاملہ میں بھی انحراف نہ کریں گے قبول نہ کی تھی۔ انھیں خطرہ تھا کہ مبادا حالات انھیں اتنا مجبور کر دیں کہ وہ کاملاً ایفائے عہد نہ کر سکیں۔ لہٰذا، انھوں نے اس اقرار پر بیعت چاہی کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر نیز حتی المقدور سیرت شیخین پر کاربند رہیں گے۔ ذمہ داری قبول کرنے میں ان کی یہ احتیاط اس قابل تھی کہ لوگ ان کی طرف مائل ہوتے ان کے بارے میں حسن ظن رکھنے لگے اور ان پر پورا پورا بھروسہ کرتے کیونکہ انھوں نے صرف اتنی ہی ذمہ داری قبول کرنے کا عہد کیا جس سے عہدہ برآ ہونے کی ان میں طاقت تھی۔

لیکن حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ دوسرے مسلمانوں کی طرح خلافت سے متعلق امور میں نہایت محتاط و دقیق النظر واقع ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید انھیں حضرت علیؓ کی اس صاف گوئی اور احتیاط میں کبر و خود رائی کا شائبہ نظر آیا ہو۔ یہی باعث ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے انھیں قرآن، سنت اور طریقہ شیخین پر پوری طرح کاربند رہنے کا عہد دیا تو انھوں نے اطمینان کے ساتھ ان کی بیعت کر لی۔ مگر بعد کے واقعات سے یہ عیاں ہو گیا کہ حضرت عثمانؓ وہ طاقت نہ رکھ سکے جو حضرات شیخین رکھتے تھے۔ لہٰذا، وہ ان بزرگوں کی سیرت کے مطابق عمل پیرا نہ ہو سکے۔ اسی طرح بعد کے واقعات سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضرت علیؓ نے اپنی قلیل المدت خلافت میں اسی طاقت کا اظہار کیا جو حضرات صدیق و فاروقؓ کو حاصل تھی۔ بلکہ حضرت علیؓ نے اس سے بھی کچھ زیادہ کر دکھایا۔ کیونکہ حضرت علیؓ نے عمرؓ کا طرز عمل اس رعیت کے ساتھ روا رکھا جو حضرت عمرؓ کی رعیت کے مقابلے میں زیادہ سرکش و تند خو اور دنیا دار تھی۔ وہ حضرت عمرؓ کے طریق پر اس وقت کاربند رہے جب اُمّت میں انتشار و افتراق اور نظریات میں اختلاف پیدا ہو چکا تھا فتنہ و فساد کا بازار گرم تھا اور پے بہ پے جنگیں لڑی جا رہی تھیں۔

حضرت علیؓ کا طرزِ زندگی فتوحاتِ اسلامیہ کے بعد بھی وہی رہا جو اس سے قبل تھا۔ یعنی ایسی زندگی جو راحت طلبی اور تن آسانی کی بہ نسبت خشونت و جفاکشی سے قریب تر تھی۔ انھوں نے نہ تجارت کی اور نہ مال و دولت کو بڑھایا ہمیشہ اپنے وظیفہ پر گزارہ کیا اس میں سے خود بھی کھایا اور اہل و عیال کے نان نفقہ کا بھی بندوبست کیا۔ اپنی ضرورت سے زائد رقم

وہ اپنی اس جائیداد کو مفید بنانے میں لگاتے تھے جو انھوں نے مقام ینبع پر خریدی تھی اور اس سے زیادہ انھوں نے کچھ نہ کیا، جب وہ فوت ہوئے تو ان کا ترکہ ہزاروں میں بھی شمار نہ کیا جا سکا چہ جائیکہ لاکھوں یا کروڑوں میں محسوب ہوتا۔ ان کا ترکہ جیسا کہ حضرت حسنؓ نے ایک خطبہ میں بیان کیا تھا سات سو درہم تھے اور اس رقم سے ایک ملازم حاصل کرنے کا ارادہ تھا۔

اپنی قلیل المدت خلافت میں حضرت علیؓ موٹے جھوٹے اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے تھے، کوڑا ہاتھ میں لئے بازاروں میں گھوما کرتے، اور لوگوں کو اسی طرح تنبیہ و نصیحت کرتے جس طرح حضرت عمرؓ کیا کرتے تھے اس سے حضرت عمرؓ کی صحیح مردم شناسی کی تائید ہوتی ہے جبکہ انھوں نے فرمایا تھا "اگر لوگ علیؓ کو خلیفہ بنا لیں تو وہ انھیں راہِ راست سے اِدھر اُدھر نہ ہونے دیں گے"۔

یہ بخوبی واضح ہے کہ حضرت علیؓ طبعاً بنی ہاشم کے علاوہ کسی اور قبیلہ میں خلافت جانے کے مخالف تھے۔ لیکن وہ ان صحیح معنوں میں جمہوریت پسند تھے جن پر آج اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ کیونکہ خلافت ان کی نظر میں کوئی موروثی جاگیر نہ تھی۔ ان کی رائے میں خلافت ایک ایسی ذمہ داری تھی جس کا بار مسلم قوم کے ارباب حل و عقد کی باہمی رضامندی کے ساتھ کسی شخص کے کاندھوں پر ڈالا جانا چاہیئے۔ یہی سبب ہے کہ جب قوم کے ارباب حل و عقد نے خلافت ان کے حوالے کرنے کی بجائے حضرت ابوبکرؓ اور پھر حضرت عمرؓ کو دے دی تو انھوں نے قوم کے اس فیصلہ کو قبول کر کے شیخین کی بیعت کر لی اور وفاداری کے ساتھ اس بیعت پہ قائم رہے اور وہ حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کے خیرخواہ رہے۔ اور ہمیشہ جو مشورہ دیا خلوص خاطر دیا۔ جب حضرت عمرؓ فوت ہو گئے اور اصحاب شوریٰ باہم مشورہ کرنے لگے تو حضرت علیؓ نے لوگوں کو اپنی طرف توجہ دلانی چاہی۔ لیکن اتنا بھی انھوں نے بڑی شرم و حیاء کے ساتھ کیا ـــــ اور پھر جلد ہی اس سے بھی باز آگئے اور ایک عام فرد کی حیثیت اختیار کر لی۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰنؓ سے مسلمانوں کی خیرخواہی کا عہد لے کر اپنی طرف سے انھیں تسلیم و اطاعت کا یقین دلا دیا۔

بعض تحقیق پسند راویوں کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کی بیعت کرنے میں پس و پیش سے کام لیا۔ یہاں تک کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو انھیں ڈرانا پڑا۔ لیکن راویوں کی ایک اور جماعت کا قول ہے اور یہی حضرت علیؓ کی سیرت و اخلاق کے شایانِ شان اور مناسب تر ہے کہ جب انھوں نے حضرت عبدالرحمٰنؓ کا مطلوبہ عہد دینے سے انکار کر دیا اور وہ عہد حضرت عثمانؓ نے دے دیا تو انھوں نے حضرت عبدالرحمٰنؓ سے کہا "ابوعبداللہ (حضرت عثمانؓ) نے آپ کو آپ کی مرضی کے مطابق عہد دے دیا ہے" اور پھر حضرت عثمانؓ کی بیعت کر لی۔ اگر انھوں نے بیعت کرنے میں پس و پیش کیا ہوتا یا بامر مجبوری بیعت کی ہوتی تو ضروری تھا کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے خواہ کم ہو یا زیادہ اپنے گھر میں بیٹھ رہتے اور حضرت عثمانؓ اور اہل شوریٰ سے قطع تعلق کر لیتے۔ لیکن [illegible] بیعت کے بعد [illegible] اور انھیں کی

ہرمزان کے متعلق حضرت عبید اللہ بن عمرؓ سے قصاص لینے کا مشورہ دیا۔

ویسے حضرت علیؓ تینوں خلفاء کے مدِ مقابل تھے۔ مگر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے ہاتھوں کوئی فعل ایسا سرزد نہ ہوا جو سخت تنقید تو ایک طرف رہی معمولی سی تنقید کا بھی متقاضی ہوتا، لہٰذا، ان دونوں کے خلاف حضرت علیؓ کی مخالفت ظاہر نہ ہو سکی۔ بلکہ ان کے ساتھ ان کا طرزِ عمل بہی خواہوں اور مشیروں کا سا رہا۔ وہ بھی دیگر مہاجرین و انصار کی طرح ان کے احکامات سنتے اور انھیں بجالاتے رہے۔ حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو اثنائے شوریٰ میں حضرت علیؓ کسی حد تک شدید مخالفت پر اتر آئے تھے مگر وہی طور اختیار کر لیا جو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے ساتھ تھا۔ یعنی خلیفہ کی خیر خواہی کرنا اور بہتر مشورہ دینا، حکم سننا اور اس کی اطاعت کرنا، لیکن سیاستِ عثمانؓ نے انھیں شدید مخالفت پر مجبور کر دیا کیونکہ وہ حضرت عبید اللہ بن عمرؓ کو معاف کرنے میں حضرت عثمانؓ کے ہم خیال نہ تھے، پھر برابر اس قسم کے واقعات ہوتے رہے، جنھوں نے ان کی مخالفت کو شدید تر کرنا شروع کر دیا۔ لیکن بہرحال یہ مخالفت سنجیدگی و راستی کی حدود سے متجاوز نہ ہوئی۔ گو کبھی نرم ہو جاتی اور کبھی سخت، تاہم کبھی بھی خیر خواہی، مشورہ اور عتابِ الٰہی سے ڈرانے کے علاوہ انھوں نے کوئی مخالفانہ اقدام نہ کیا۔

واقعات مسلسل شدید اور ہولناک صورت اختیار کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ایک دن حضرت علیؓ کو مجبوراً لوگوں کی ایک جمعیت کے سامنے حضرت عثمانؓ کی مخالفت کرنا پڑی، ایسا اس وقت ہوا جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غیر ذمہ دارانہ طور پر یہ اعلان کیا کہ معترضین جس قدر بھی چاہیں ناک بھوں چڑھاتے رہیں وہ اپنی جملہ ضروریات بیت المال ہی سے پوری کریں گے۔ حضرت علیؓ نے یہ سن کر کہا "یہ بات ہے تو پھر آپ کو اس مال سے محروم کر دیا جائے گا" بہرحال حضرت علیؓ کبھی بھی خیر خواہی مشورہ اور وقتاً فوقتاً سخت تنقید سے آگے نہ بڑھے۔ وہ حضرت عثمانؓ اور ان کے مخالف باغیوں کے مابین واسطہ بن جاتے تھے اور حضرت عثمانؓ کو ہمیشہ حق شناسی کی، اور لوگوں کو فتنہ پردازی سے باز رہنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ حضرت عثمانؓ اپنے رشتہ داروں کے ہاتھوں مجبور و بے بس ہو چکے ہیں، تو مایوس ہو کر خانہ نشین ہو گئے اور اس کے بعد انھوں نے حضرت عثمانؓ اور عوام کے مابین ثالثی اور صلح صفائی کی کوشش نہ کی۔ مگر بایں ہمہ وہ دورانِ محاصرہ بھی حضرت عثمانؓ کی خیر خواہی کرتے رہے۔ انھوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر میں پانی پہنچایا اور اپنے دو صاحبزادوں کو محاصرین کا مقابلہ کرنے کے لئے بھیجا۔ تاہم اس سے کسی کو بھی مجالِ انکار نہیں کہ حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کے مابین تمام دورِ عثمانی میں برابر کشمکش جاری رہی، اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حضرت عثمانؓ کے رشتہ داروں نے لگاتار کہہ سن کر حضرت عثمانؓ کو حضرت علیؓ سے انتہائی ممکن حد تک خائف کر دیا تھا، اگر حضرت عثمانؓ سیرتِ عمرؓ پر کاربند رہتے اور ان کے اعزہ ان کے اور رعیت کے درمیان حائل نہ ہوتے تو یقیناً حضرت علیؓ کا برتاؤ ان کے ساتھ بھی وہی ہوتا جو ان سے قبل حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ

کے ساتھ تھا۔ لیکن اگر حضرت عثمانؓ سیرتِ عمرؓ پر کاربند رہتے اور ان کے اعزہ اور رعیت کے درمیان دیوار نہ بن جاتے تو نہ یہ فتنہ بپا ہوتا اور نہ ہمیں یہ کتاب املا کرانے کی ضرورت پڑتی۔

اس بات کا ثبوت کہ حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کے مابین رونما ہونے والا بگاڑ حضرت عثمانؓ کے اقربا کا پیدا کردہ تھا اور جو بالآخر اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ ایک روز حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ کو سزا دینے کی ٹھان لی۔ بلاذری کی تصنیف "انساب الاشراف" کا یہ واقعہ ہے کہ حضرت عباسؓ نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان ثالثی کرتے ہوئے حضرت عثمانؓ سے کہا: "میں آپ کو آپ کے چچا زاد، ماموں زاد بھائی اور رسولِ خدا کی دامادی و صحبت میں آپ کے ساتھی کے متعلق آپ کو خدا کا خوف دلاتا ہوں، مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ آپ حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا "قبل اس کے کہ میں کچھ اور کہوں اپنے درمیان آپ کو سفارشی اور ثالث بنانا قبول کرتا ہوں۔ حضرت علیؓ اگر چاہتے تو میرے نزدیک ان کا ہم رتبہ کوئی بھی نہ ہوتا مگر وہ من مانی کرتے ہیں۔" اس کے بعد حضرت عباس نے حضرت علیؓ سے بھی ایسی ہی بات کہی جو انھوں نے حضرت عثمانؓ سے کہی تھی۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے کہا "اگر حضرت عثمانؓ مجھے گھر چھوڑ دینے کا حکم دیں تو میں اپنے گھر سے بھی نکل جاؤں گا۔"[1]

لیکن اس ثالثی کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ حضرت عثمانؓ کی سیاست کا رنگ نہ بدلا۔ اور حضرت علیؓ کی مخالفت بدستور قائم رہی، ادھر حضرت عثمانؓ کے اقرباء حسبِ معمول دونوں کے تعلقات کو بگاڑنے میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ معاملہ نازک صورت اختیار کر گیا۔ بلاذریؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے اس صورتِ حال کو یوں بیان کیا ہے کہ "حضرت عثمانؓ نے حضرت عباسؓ سے حضرت علیؓ کے خلاف شکایت کی اور کہا "ماموں جان! علیؓ نے مجھ سے رشتہ داری کے تعلقات قطع کر لئے ہیں اور آپ کے فرزند (عبداللہ بن عباسؓ) لوگوں کو میرے خلاف برانگیختہ کر رہے ہیں۔ بھلا اے بنی ہاشم! اگر آپ لوگوں نے خلافت کو بنی تیم اور بنی عدی کے ہاتھوں میں گوارا کر لیا تھا تو بنو عبدمناف اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ آپ لوگ ان کے ساتھ دست و گریباں ہونے یا ان کا حسد کرنے سے احتراز کریں۔" حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ یہ سن کر میرے والد بزرگوار نے دیر تک سر جھکائے رکھا اور پھر کہا "اے میرے بھانجے! اگر آپ علیؓ کے حق میں کلمۂ خیر نہ کہیں تو وہ آپ کی تعریف کس طرح کریں۔ رہا آپ کا استحقاق باعتبار قرابت و امامت تو وہ ایسا حق ہے جسے نہ تو رد کیا جا سکتا ہے اور نہ اس سے انکار ممکن ہے۔ اگر علیؓ کی فروگزاشت پر آپ اور آپ کی فردگزاشت پر علیؓ بلند نظری کا ثبوت دیتے رہیں تو زیادہ مناسب

[1] انساب الاشراف للبلاذری، ص۱۲، مطبوعہ قدس

اور ایک دوسرے سے زیادہ قریب کا باعث ہو جاتے۔ حضرت عثمانؓ نے کہا "لیجئے یہ معاملہ میں آپ کے حوالے کئے دیتا ہوں، آپ ہماری کشیدگی دور کرادیں"۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ جونہی ہم حضرت عثمانؓ کے پاس سے اٹھے مروان ان سے ملا اور انھیں ان کی رائے سے برگشتہ کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ حضرت عثمانؓ کا قاصد میرے والد کو بلانے آیا۔ جب میرے والد حضرت عثمانؓ کے پاس گئے۔ تو حضرت عثمانؓ نے کہا "ماموں جان میں نے جو معاملہ آپ کے سپرد کیا ہے اسے ذرا ملتوی کر دیجئے میں چاہتا ہوں کہ ذرا اطمینان سے اس پر غور و فکر کر کے کسی نتیجہ پر پہنچوں۔ یہ سن کر والد وہاں سے چلدیئے اور میری طرف مڑکر کہا بیٹا! یہ شخص بے بس ہے۔ پھر کہا "اے خدا مجھے فتنوں کی بیداری سے قبل اٹھالے۔ اور مجھے ان حالات کو دیکھنے کے لئے باقی نہ رکھنا جن میں کوئی خیر نہ ہو۔ اس بات کو ابھی ایک ہفتہ بھی نہ ہو پایا تھا کہ آپ کی وفات ہوگئی[1]۔

قبل ازیں حضرت عباسؓ نے دونوں کے مابین خیر سگالی کے لئے ثالثی کے فرائض انجام دیئے تھے اور کامیاب رہے تھے۔ لہٰذا حضرت عثمانؓ نے چاہا تھا کہ وہ دوبارہ ان کے درمیان ثالثی کریں اور ضروری تھا کہ انھیں اس بار بھی پہلے کی طرح کامیابی ہوتی۔ لیکن حضرت عثمانؓ کو مروان نے اس رائے سے منحرف کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معاملات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ وہ فتنے جن کی حضرت عباسؓ کو توقع تھی معرض ظہور میں آگئے۔

آپ نے سابقہ صفحات میں پانچ اصحاب شوریٰ کا طرز عمل اور حضرت عثمانؓ کے خلیفہ ہو جانے کے بعد ان سے اختلاف کرنے میں ان کا مؤقف دیکھ لیا۔ یہ موزوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان صفحات کو اس روایت پر ختم کریں جو ان اصحاب کے متعلق حضرت عمرؓ کی رائے پر مشتمل ہے۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ روایت غلط ہو یا صحیح بہرحال یہ رائے ان خیالات کی صحیح عکاسی کرتی ہے جو ان حضرات کے متعلق عوام الناس۔ رواۃ۔ مؤرخین اور خصوصاً محدثین اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔

بلاذری نے ابن عباسؓ کی روایت سے بہ اسناد بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ امت محمدؐ کا کیا بندوبست کروں — یہ آپ پر قاتلانہ حملہ ہونے سے پہلے کی بات ہے — اس پر میں نے کہا "آپ متفکر کیوں ہیں آپ کے پاس ایسے آدمی موجود ہیں جنھیں آپ مسلمانوں کا خلیفہ بنا سکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کیا تمہارے ساتھی کو خلیفہ بنادوں؟" (یعنی حضرت علیؓ کو) میں نے کہا "ہاں، کیونکہ رسولِ خدا کے ساتھ قرابت ان کی دامادی اسلام میں سبقت

---

[1] انساب الاشراف للبلاذری ص۲۱ مطبوعہ قدس۔

اور محنت کشی ہر اعتبار سے وہ اس کے اہل ہیں ________ اس پہ حضرت عمرؓ نے کہا: "ان کی طبیعت میں بے کار وقت گزارنا اور خوش طبعی کرنا شامل ہے" میں نے کہا "پھر طلحہؓ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟" فرمایا "ان کے غرور و نخوت کا کیا علاج ہوگا؟" میں نے کہا "عبدالرحمٰن بن عوفؓ کیسے رہیں گے؟" فرمایا "وہ صالح تو ہیں مگر کمزور ہیں" میں نے کہا "پھر سعدؓ کے متعلق کیا ارشاد ہے؟" فرمایا "وہ سالارِ افواج اور مرد میدان ہیں لیکن اگر ایک قصبہ کے بھی والی مقرر ہو گئے تو اسے سنبھال نہ سکیں گے۔" میں نے کہا "پھر حضرت زبیرؓ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" فرمایا "وہ خوش ہوں تو مومن باصفا ہیں اور اگر غضب میں ہوں تو بہت تند خو ہیں۔ یہ خلافت کا معاملہ ہے اس کا اہل فقط وہی شخص ہو سکتا ہے جو قوی ہو مگر تند نہ ہو۔ نرم ہو مگر کمزور نہ ہو۔ سخی ہو مگر مسرف نہ ہو۔" میں نے کہا "تو حضرت عثمانؓ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" فرمایا "اگر وہ خلیفہ ہو گئے تو بنو ابی معیط کو لوگوں کی گردنوں پہ سوار کر دیں گے۔ اور اگر انھوں نے ایسا کیا تو لوگ انہیں قتل کر ڈالیں گے۔"

(۰)

انیسواں باب

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

بایں ہمہ ارکین "مجلس شوریٰ" کی حضرت عثمانؓ سے جو مخالفت تھی وہ نہایت خفیف تھی۔ ان اراکین کے علاوہ حضرت عثمانؓ کے کچھ اور مخالف بھی تھے جو معمولی صحابی نہیں بلکہ جلیل القدر صحابۂ رسولؐ تھے۔ ان صحابۂ کرامؓ اور حضرت عثمانؓ کے مابین کئی ناگوار واقعات رونما ہوئے جو تاریخ میں محفوظ ہیں اور جن کے متعلق لوگوں میں عجب چرچے اور چہ میگوئیاں ہوئیں۔ ان مخالفین میں حضرت عبداللہ بن مسعود ہذلی بھی شامل تھے جو بنی زہرہ کے حلیف تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی نبی اکرمؐ سے اوّلیں ملاقات اس وقت ہوئی جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ لڑکے تھے اور عقبہ بن ابی معیط کی بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ رسول اللہؐ اور حضرت ابوبکرؓ ایک دن ان کے پاس آئے اور کچھ پینے کو مانگا۔ لڑکے نے کہا "میں امانتدار ہوں آپ کو کچھ نہیں پلاؤں گا"۔ اس پر رسول اکرمؐ نے فرمایا: "تمہارے ریوڑ میں کوئی ایسی بکری ہو جسے نر نے نہ چھوا ہو تو وہ لے آؤ"۔ لڑکے نے ایک ایسی بکری آپؐ کے حوالے کی۔ آپؐ نے اس کے تھنوں کو ہاتھ لگایا تو وہ دودھ سے بھر آئے۔ حضرت ابوبکرؓ ایک پیالہ نما پتھر لے آئے۔ آپؐ نے دودھ دوہا۔ خود بھی پیا اور ابوبکرؓ کو بھی پلایا۔ اس کے بعد آپؐ نے تھنوں سے کہا "سکڑ جاؤ"۔ چنانچہ وہ اپنی اصلی حالت پر آ گئے[1]۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اسلام قبول کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وابستہ رہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اپنے ساتھیوں میں قرآن کے سب سے زیادہ حافظ، اس کے سب سے بڑے راوی اور مکہ میں قرآن مجید کو علانیہ سنانے میں سب سے زیادہ جری تھے۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے پہلے حبشہ ہجرت کی اور پھر مدینہ شریف ہجرت کی۔ رسول اللہؐ نے مہاجرین میں ان کی مؤاخاۃ حضرت زبیر بن العوامؓ اور انصار میں حضرت معاذؓ بن جبل کے ساتھ قائم کی۔ حضرت ابن مسعودؓ بدر و اُحد اور دیگر تمام جنگوں میں رسولِ خدا

---

[1] یہ روایت چونکہ قرآن کے خلاف ہے اس لئے وضعی ہے۔

کے ساتھ رہے ۔ یہی ہیں جنھوں نے جنگِ بدر میں زخمی پڑے ہوئے ابوجہل کا سر کاٹا تھا ۔ ابن مسعودؓ سفر و حضر میں ہمیشہ رسولِ خدا کے ساتھ رہے ۔ یہاں تک کہ وہ آپ کے اہلِ بیت میں شمار کئے جانے لگے ۔ وہ رسولِ خدا کے دوران قیام میں ہر دم حاضر خدمت رہتے ۔ جب آپ کہیں جانے لگتے تو وہ آپ کو پاپوش پہناتے اور عصا لئے آگے آگے چلتے ۔ جب آپ جائے نشست پر پہنچ جاتے تو وہ آپ کے پاپوش اتار کر بغل میں دبا لیتے ۔ عصا آپؐ کے حوالے کر دیتے اور منتظرِ حکم کھڑے رہتے ۔ دورانِ سفر میں رسولِ خدا کے بستر بچھونے اور وضو کا اہتمام حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی کے ذمہ ہوتا تھا ۔ آنحضورؐ کو ان سے بہت محبت تھی ۔ اور دوسروں کو بھی ان سے محبت کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے ۔ ایک روز اصحابِ رسولؐ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو درخت پر چڑھتے دیکھا تو ان کی پتلی پتلی پنڈلیاں دیکھ کر انھیں ہنسی آگئی ۔ اس پر آپؐ نے فرمایا یہ دونوں پنڈلیاں روز قیامت میزان میں جبلِ احد سے زیادہ وزنی ہوں گی ۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور مسلمان فتوحات کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئے تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ شام کی طرف چلے گئے ۔ اور حمص میں اقامت اختیار کر لی ۔ حضرت عمرؓ نے انھیں کوفہ بھیج دیا ، اور اہلِ کوفہ کو تلقین کی کہ وہ ان سے علمِ دین اخذ کریں ۔ حضرت عمرؓ نے اہلِ کوفہ کو بتایا کہ " میں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو تمہارے پاس بھیج کر تمہیں اپنی ذات پر ترجیح دی ہے ۔"

حضرت عمرؓ کی شہادت اور حضرت عثمانؓ کی بیعت کے وقت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مدینہ میں موجود تھے ۔ اس کے بعد وہ بہ سرعت تمام کوفہ چلے گئے ۔ جب وہاں پہنچے تو لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا " جو لوگ بقیدِ حیات ہیں ہم نے ان میں سے بہترین شخص کو خلافت کے لئے منتخب کیا ہے اور اس ضمن میں حتی الامکان کوئی کوتاہی نہیں کی ۔ یہ کہہ کے انھیں حضرت عثمانؓ کی بیعت کر لینے کی ترغیب دی ۔

جب حضرت سعد بن ابی وقاصؓ حاکم کوفہ تھے تو ابن مسعودؓ بیت المال کے والی تھے ۔ جب حضرت سعدؓ کوفہ کی حکومت سے معزول کر دیئے گئے تو ابن مسعودؓ ولید بن عقبہ کے ابتدائی عہد تک اپنے عہدے پر برقرار رہے ۔ ولید نے بیت المال سے کچھ قرض مانگا ۔ ابن مسعودؓ نے کچھ قرض دے دیا ۔ بیت المال سے قرض لینا کوئی غیر مالوف بات نہ تھی ۔

جب قرض کی میعاد گزر گئی تو ابن مسعودؓ نے ولید سے قرض ادا کرنے کے لئے کہا ۔ اس نے بات ٹال دی ۔ ابن مسعودؓ نے اصرار کیا اس پر ولید نے ایک خط میں حضرت عثمانؓ سے ابن مسعودؓ کی شکایت کی ۔ حضرت عثمانؓ نے ابن مسعودؓ کو لکھا " تم ہمارے خزانچی ہی تو ہو لہٰذا ، ولید نے بیت المال سے جو کچھ لیا ہے اس کے بارے میں تعرض نہ کرو ۔" اس پر عبداللہ بن مسعودؓ کو غصہ آیا اور بیت المال کی چابیاں پھینک اپنے گھر میں جاکر بیٹھ رہے اور لوگوں کو وعظ نصیحت کرنے اور تعلیمِ دین دینے میں لگ گئے ۔ اس وقت سے امور سیاست اور امور مال کے ضمن میں عبداللہ بن مسعودؓ نے حضرت عثمانؓ کی مخالفت شروع

کر دی۔ جب حضرت عثمانؓ نے مرکز کی طرف سے قرآن مجید کے نسخے اطراف مملکت میں بھیجنے کی مہم شروع کی اور اس کی کتابت زید بن ثابت کی زیر نگرانی مسلمانوں کی ایک جماعت کے ذمہ لگائی اور قرآن کے دیگر نسخوں کو جلانے کے احکامات جاری کئے تو قرآن کے نسخوں کے جلانے پر لوگوں نے حضرت عثمانؓ کی مخالفت کی اور ان پر اعتراضات کئے، اس موقع پر عبداللہ بن مسعودؓ کی مخالفت مزید شدت اختیار کر گئی اور ان کی تنقید حضرت عثمانؓ کے حق میں اور زیادہ سخت ہو گئی۔ وہ ہر جمعرات کو لوگوں سے خطاب کرتے تھے، اپنی تقریر میں وہ کہا کرتے تھے "صادق ترین قول خدا کی کتاب ہے۔ اور بہترین طرز عمل محمدؐ کا طرز عمل ہے۔ بدترین امور وہ ہیں جنھیں اپنی طرف سے دین میں ایجاد کر لیا گیا ہو (یعنی بدعتیں) اور دین میں نیا اضافہ بدعت ہے۔ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا ٹھکانا جہنم ہے"۔ ولید نے یہ سب باتیں حضرت عثمانؓ کو لکھ بھیجیں اور انھیں بتایا کہ عبداللہ بن مسعودؓ آپ کی عیب جوئی اور آپ پر تنقید کرتے ہیں۔ اور آپ کی کارروائیوں کو قابل اعتراض گردانتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے ولید کو لکھا کہ عبداللہ بن مسعودؓ کو مدینہ بھیج دیا جائے۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعودؓ کو مدینہ بھیج دیا گیا۔ جب وہ کوفہ سے نکلے تو اہل کوفہ نہایت اعزاز و احترام سے ان کو چھوڑنے کے لئے آئے اور انتہائی گرم جوشی سے انہیں الوداع کہا۔ حضرت ابن مسعودؓ جب مدینہ پہنچے اور مسجد نبویؐ میں داخل ہوئے تو اس وقت حضرت عثمانؓ منبر رسولؐ پر خطبہ دے رہے تھے۔ جب انھوں نے حضرت ابن مسعودؓ کو داخل ہوتے دیکھا تو لوگوں سے کہا "لوگو! تمہارے پاس ایک چھوٹا سا رینگ کر چلنے والا جانور آیا ہے جو اپنی خوراک کو پاؤں تلے روندتا اور اس پر بول و براز کرتا ہے"۔ یہ سن کر ابن مسعودؓ نے کہا "میں ایسا نہیں ہوں۔ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی ہوں۔ جو جنگ بدر اور بیعت رضوان کے روز رسول خدا کی رفاقت میں تھا"۔ حضرت عائشہؓ نے آواز دی "اے عثمانؓ! آپ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مصاحب کو ایسا کہہ رہے ہیں!" اس کے بعد حضرت عثمانؓ کے حکم سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو سختی کے ساتھ مسجد سے نکال دیا گیا۔ انھیں زمین پر گرا دیا گیا جس سے ان کی پسلی ٹوٹ گئی، یہ دیکھ کر حضرت علیؓ کھڑے ہوئے اور حضرت عثمانؓ کو اس حرکت پر ملامت کی اور کہا "آپ ولید کے کہنے میں آ کر ایک صاحب رسولؐ اللہ کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں!" حضرت عثمانؓ نے جواب دیا "میں نے یہ کچھ ولید کے کہنے پر ہی نہیں کیا بلکہ میں نے زبید بن کثیر کو بھیجا تھا اور اس نے اپنے کانوں سے سنا کہ عبداللہ بن مسعودؓ میرے خون کو مباح قرار دیتے ہیں"۔ حضرت علیؓ نے کہا "زبید تو ناقابل اعتبار آدمی ہے"۔ پھر حضرت علیؓ نے، حضرت ابن مسعودؓ کو اٹھوا کر ان کے گھر پہنچوا دیا۔

حضرت عثمانؓ نے اسی پر بس نہ کیا۔ بلکہ انھوں نے حضرت ابن مسعودؓ کا وظیفہ بھی بند کر دیا اور انھیں مدینہ شریف میں نظر بند کر دیا۔ حضرت ابن مسعودؓ نے مجاہدین میں شامل ہو کر شام جانا چاہا۔ مگر حضرت عثمانؓ نے اجازت دینے

سے انکار کر دیا۔ کیونکہ ان سے مروان نے کہہ دیا کہ اس شخص نے کوفہ کو آپ سے برگشتہ کر دیا ہے اب آپ اسے یہ موقع نہ دیں کہ وہ شام کو بھی آپ سے برگشتہ کر دے۔

بدیں صورت ابن مسعودؓ حضرت عثمانؓ کی مخالفت لئے کوفہ سے مدینہ منتقل ہو گئے۔ وہاں کوئی دو تین برس مقیم رہے اور اس مخالفت کو پھیلاتے رہے۔ اسی اثناء میں ان کی موت واقع ہو گئی۔ راویوں کا بیان ہے کہ مرض الموت میں حضرت عثمانؓ ان کی عیادت کے لئے گئے تھے۔ مابعد کی باتوں میں راوی باہم مختلف الرائے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے ابن مسعودؓ سے معذرت چاہ لی۔ اور دونوں نے باہم راضی ہو کر ایک دوسرے کے لئے دعائے مغفرت کی۔ چنانچہ جب ابن مسعودؓ فوت ہوئے تو ان کی نمازِ جنازہ حضرت عثمانؓ ہی نے پڑھائی۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ جب حضرت عثمانؓ عیادت کو آئے تو ابن مسعودؓ ان سے اچھی طرح پیش نہ آئے۔ حضرت عثمانؓ نے پوچھا "کیا تکلیف ہے"؟ ابن مسعودؓ نے کہا "میرے گناہ میری تکلیف ہیں"۔ حضرت عثمانؓ نے پوچھا "آپ کیا چاہتے ہیں"؟ ابن مسعودؓ نے کہا "رحمتِ خداوندی"۔ حضرت عثمانؓ نے کہا "آپ کا وظیفہ پھر سے جاری کر دوں"؟ ابن مسعودؓ نے کہا "جس وقت ضرورت تھی۔ آپ نے روک لیا۔ اب جب ضرورت نہیں تو جاری کر رہے ہیں"۔ حضرت عثمانؓ نے کہا "وہ آپ کے اہل وعیال کے کام آئے گا"۔ ابن مسعودؓ نے کہا "ان کی روزی خدا کے ذمہ ہے"۔ حضرت عثمانؓ نے کہا "اے ابوعبدالرحمٰن میرے لئے خدا سے مغفرت کی دُعا فرمائیں"۔ ابن مسعودؓ نے کہا "میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ سے میرا انتقام لے"۔

راویوں کا بیان ہے کہ جب حضرت عثمانؓ چلے گئے تو حضرت ابن مسعودؓ نے یہ وصیت کی کہ وہ ان کی نمازِ جنازہ نہ پڑھیں چنانچہ ابن مسعودؓ فوت ہوئے تو حضرت عثمانؓ کو کسی نے خبر نہ دی۔ حضرت عمارؓ بن یاسر نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور انہیں دفن کر دیا گیا۔ اگلے روز جب حضرت عثمانؓ ایک نئی قبر کے پاس سے گذرے تو پوچھا "یہ کس کی قبر ہے"؟ انہیں بتایا گیا کہ یہ ابن مسعودؓ کی قبر ہے۔ اس پر حضرت عثمانؓ کو غصہ آگیا اور کہا "مجھے خبر دیئے بغیر ہی تم نے انہیں دفن کر دیا"۔ چنانچہ حضرت عمارؓ نے بتایا کہ ان کی وصیت تھی کہ آپ ان کی نمازِ جنازہ نہ پڑھیں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اس بات کو دل میں رکھا۔ اور یہ بھی حضرت عمارؓ کے خلاف حضرت عثمانؓ کے غیظ وغضب کا ایک سبب تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ کہانی من گھڑت اور مصنوعی ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کی سیرت کے شایانِ شان یہی بات ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ کو معاف کر دیتے اور ان کے لئے دعائے مغفرت کرتے، کیونکہ ابن مسعودؓ کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے صحابہ کا قول یہ ہے کہ ابنِ مسعودؓ خوش اطواری، خوش خوئی اور خوش سلوکی میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ سے بہت زیادہ

مشابہ تھے، مزید برآں ابنِ مسعودؓ ان اشخاص میں سے تھے جو سب سے زیادہ قرآن پڑھنے والے اور قرآن پر عمل کرنے والے تھے۔
لہٰذا، یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت ابنِ مسعودؓ نے خدائے عزّ و جل کا یہ قول نہ پڑھا ہو۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ إِنَّ ذَالِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ (۴۲/۴۳)۔

(اور) جس نے صبر و استقلال سے کام لیا اور دوسرے کی کمزوری کو ڈھانپ دیا تو یہ بڑے عظیم ارادے اور ہمت کا کام ہے۔

اس لحاظ سے ابنِ مسعودؓ کے شایانِ شان یہی ہے کہ انھوں نے صبر کیا ہوگا اور عفو سے کام لیا ہوگا، اور ہمت و اولوالعزمی کو ترجیح دی ہوگی۔

———— (۰) ————

بیسواں باب

حضرت ابوذر غفاریؓ

حضرت ابوذرؓ کا تعلق بنی کنانہ کی شاخ غفار سے تھا۔ وہ عہد جاہلیت میں لوگوں سے کنارہ کش رہے لہٰذا اپنے اس اندازِ زندگی کے سبب سے درویش معلوم ہوتے تھے۔ ایک روز وہ مکہ میں آئے۔ وہاں رسولِ خداؐ کی بابت کچھ باتیں کان میں پڑیں۔ اشتیاقِ ملاقات کشاں کشاں لے گیا۔ ملاقات ہوئی۔ آپ کی باتیں سُنیں اور مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد مکہ میں زیادہ دیر نہ ٹھہرے۔ بلکہ آنحضرتؐ کی ہجرت مدینہ کے بعد خود بھی ہجرت کر کے آپؐ سے مدینہ میں جا ملے۔ اس اعتبار سے آپ پہلے پہل اسلام قبول کرنے والوں میں سے ہیں اور ان بزرگوں میں سے ہیں جنھیں رسولِ خدا بہت چاہتے تھے اور جن کی آپؐ بہت زیادہ تعریف فرماتے تھے چنانچہ آپؐ فرمایا کرتے تھے۔

مَا اَقَلَّتِ الْغَبْرَاءُ وَلَا اَظَلَّتِ الْخَضْرَاءُ رَجُلاً اَصْدَقَ لَهْجَةً مِنْ اَبِيْ ذَرٍّ

زمین کے اوپر اور گنبدِ نیلوفری کے سایہ تلے کوئی فرد بھی ابوذرؓ سے زیادہ صاف گو اور بے باک نہیں ہوا۔

اسی طرح آپؐ یہ بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے :۔

يُبْعَثُ اَبُوْذَرٍّ اُمَّةً وَحْدَهٗ

ابوذر تنہا ایک اُمت کی شکل میں اُٹھایا جائے گا۔

حضرت ابوذرؓ کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا تھا کہ جب مدینہ کی آبادی بڑھ کر مقام سلع تک پہنچ جائے تو مدینہ کو خیرباد کہہ دینا۔۔۔۔ وہ عہدِ ابوبکرؓ و عمرؓ اور آغازِ خلافت عثمانؓ میں مدینہ ہی میں رہے پھر انہوں نے دیکھا کہ آبادی سلع تک پہنچ گئی ہے۔ لہٰذا، انھوں نے حضرت عثمانؓ سے شام کی طرف بارادۂ جہاد ہجرت کر جانے کی اجازت چاہی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ عہدِ عمرؓ ہی میں شام چلے گئے تھے۔ اور وہاں کے سرکاری وظائف کے رجسٹر میں ان کا اندراج تھا۔

حضرت ابوذرؓ حج کے لئے آتے تو مدینہ کی زیارت بھی کرتے ۔ اور حضرت عثمانؓ سے کچھ وقت روضۂ رسولؐ کی ہمسائیگی میں ٹھہرنے کی اجازت طلب کر لیتے اور حضرت عثمانؓ انھیں اجازت دے دیا کرتے، ایک روز حضرت ابوذرؓ کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ مروان بن حکم کو بہت سا نقد و مال اور اس کے بھائی حارث بن حاکم کو تین لاکھ درہم دے رہے ہیں؛ اسی طرح کہ حضرت یہ بھی دیکھا کہ وہ حضرت زید بن ثابت انصاریؓ کو ایک لاکھ درہم عطا کر رہے ہیں؛ انھیں یہ بخشش قابلِ اعتراض معلوم ہوئی ان کی نظر میں بخشش کی یہ مقدار بھی بہت زیادہ تھی ۔ چنانچہ حضرت ابوذرؓ سے نہ رہا گیا اور انھوں نے کہا " دولت جمع کرنے والوں کو عذابِ دوزخ کی بشارت دے دو " اور ساتھ یہ آیۂ کریمہ تلاوت کی ۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۹/۳۴)۔

اور جو لوگ سونے چاندی کے ذخیرے جمع کر رکھتے ہیں اور انھیں راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے انھیں المناک عذاب کی بشارت دے دو ۔

مروان نے حضرت ابوذرؓ کے اس قول کا شکوہ حضرت عثمانؓ سے کیا ۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے ان کے پاس اپنا ملازم بھیج کر انھیں ایسی باتوں سے منع کیا ۔ اس پر حضرت ابوذرؓ نے کہا : " کیا حضرت عثمانؓ مجھے کتاب اللہ کی قراءت اور حکمِ خداوندی کی نافرمانی کرنے والوں کی نکتہ چینی سے منع کرتے ہیں ؟ اگر حضرت عثمانؓ ناراض ہو جائیں اور خدا راضی رہے تو یہ بات مجھے زیادہ عزیز ہے ۔ بہ نسبت اس کے کہ حضرت عثمانؓ راضی ہوں اور خدا ناراض ہو جائے " حضرت عثمانؓ نے ان کے بارے میں تحمل سے کام لیا ۔ لیکن حضرت ابوذرؓ اپنی تنقید و تنقیص پر باصرار قائم رہے ۔ اقتصاد و قناعت کی بدستور دعوت دیتے رہے ۔ اور مال و دولت کی ذخیرہ اندوزی کے خلاف متواتر لوگوں کو متنفر کرتے رہے ۔ یہاں تک کہ ایک روز جب وہ حضرت عثمانؓ کے پاس بیٹھے تھے اور وہاں کعب الاحبار بھی موجود تھا تو اثنائے گفتگو میں حضرت عثمانؓ نے پوچھا " کیا امام کے لئے بیت المال سے اس شرط پر قرض لینا جائز ہے کہ جب ہاتھ کھلا ہو تو واپس کر دے " ؟ کعب الاحبار نے کہا " میرے خیال میں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے " یہ سن کر حضرت ابوذرؓ کو غصہ آگیا اور کعبؓ سے کہا " اے یہودی زادے ! کیا تم ہمیں ہمارا دین سکھاتے ہو ! " حضرت عثمانؓ اس پر غضب ناک ہوئے اور انھوں نے حضرت ابوذرؓ کو حکم دیا کہ وہ شام چلے جائیں ۔ بعض دیگر راوی بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوذرؓ حضرت عثمانؓ سے کہہ رہے تھے کہ وہ لوگ جو زکوٰۃ دیتے ہیں انھیں صرف ادائیگی زکوٰۃ پر ہی اکتفا نہ کرنا چاہیئے ، بلکہ انھیں چاہیئے کہ وہ بھوکوں کو کھانا کھلائیں سائل کو خیرات دیں اور ہمسایوں سے سلوک کریں " یہ سن کر کعب الاحبارؓ نے کہا " جس نے فریضہ ادا کر دیا وہ سبکدوش ہو گیا " اس پر ابوذرؓ نے کعبؓ کی

دست وزبان سے خاصی تواضع کی۔ اسی لئے حضرت عثمانؓ نے انھیں حکم دیا کہ وہ اپنے شام کے دفتر سے ملحق ہو جائیں۔

کوئی صورت بھی ہو بہرحال حضرت ابوذرؓ شام چلے گئے لیکن وہاں بھی وہ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔ انھوں نے شام میں بھی وہی کچھ کہنا شروع کیا جو مدینہ شریف میں کہا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں حضرت معاویہؓ کے نسبت سے اقدامات پہ اعتراضات اٹھانے شروع کر دیئے، انھوں نے حضرت معاویہؓ کے اس قول کی تردید کی کہ بیت المال کا مال خدا کا مال ہے اور کہا کہ وہ مسلمانوں کا مال ہے۔ انھوں نے امیر معاویہؓ کے تعمیر خضراء پر بھی اعتراضات کئے۔ اور کہا "اگر تم نے اسے مال مسلمین سے تعمیر کیا ہے تو خیانت کی ہے اگر اپنے مال سے تعمیر کرایا ہے تو فضول خرچی کا ارتکاب کیا ہے"۔

حضرت ابوذرؓ یہ بھی کہا کرتے تھے:۔ "اغنیاء کو فقراء کے حقوق تلف کرنے سے ڈرتے رہنا چاہیئے"۔۔۔ لوگ حضرت ابوذرؓ کے گرد جمع ہو جایا کرتے تھے۔ ان کے ارشادات گوش توجہ سے سنتے اور ان کی دعوت قبول کرتے تھے۔ حتیٰ کہ امیر معاویہؓ کو اس دعوت سے اہلِ شام کے برگشتہ ہو جانے کا خطرہ دامنگیر ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے حضرت عثمانؓ کی خدمت میں شکایت نامہ ارسال کیا۔ حضرت عثمانؓ نے جواباً تحریر کیا ابوذرؓ کو سخت بے پالاں سواری کے ذریعے مدینہ بھیج دیا جائے۔ حضرت معاویہؓ نے تعمیلاً بڑی درشتی و بے مروّتی کے ساتھ انھیں مدینہ کی طرف روانہ کر دیا۔۔۔ مدینہ پہنچنے پہ وہاں بھی انھوں نے اپنی تبلیغ جاری رکھی۔ اور یہ کہتے رہے کہ اصحابِ زر کو ان آتشیں سلاخوں کی بشارت دے دو جن سے ان کی پیشانیاں۔ پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی۔ ساتھ ہی وہ حضرت عثمانؓ پر بھی طعن و اعتراضات کرنے لگ گئے کیونکہ انھوں نے مسلمانوں کے مال میں آزادانہ تصرف شروع کر دیا تھا۔ نوعمر افراد کو عامل بنا رہے تھے اور طلقاء (فتح مکہ کے موقع پہ معافی دیئے ہوئے مغلوبین کے فرزندوں کو مناصبِ حکومت عطا کر رہے تھے۔۔۔ یہاں تک کہ ان باتوں سے حضرت عثمانؓ تنگ آ گئے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، راوی اس کے بارے میں مختلف الرّائے ہیں۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوذرؓ کو حکم دیا کہ وہ مدینہ سے نکل جائیں اور جہاں چاہیں جا کر مقیم ہو جائیں۔ البتہ شام، کوفہ، بصرہ اور مکہ میں اقامت گزیں ہونے سے منع کر دیا۔ حضرت ابوذرؓ نے "ربذہ" کو منتخب کیا اور حضرت عثمانؓ نے انہیں وہاں مقیم ہونے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ حضرت ابوذرؓ تادمِ مرگ ربذہ ہی میں مقیم رہے۔۔۔ دوسرے گروہ کا بیان ہے کہ ربذہ کا انتخاب حضرت ابوذرؓ نے خود نہیں کیا تھا بلکہ حضرت عثمانؓ نے شہر بدر کر کے ربذہ کی طرف نکال دیا تھا۔۔۔ لہٰذا، وہ وہاں مقیم رہے حتیٰ کہ مرگِ غربت نے انہیں قیدِ حیات سے نجات دلائی۔ ان کی اہلیہ محترمہ کے پاس ان کے دفن کے لئے بھی کچھ نہ تھا۔

ان کے دفن کا انتظام اہلِ عراق کی ایک جماعت نے کیا جو حج یا عمرہ کی نیت سے اتفاقاً وہاں سے گزر رہی تھی حضرت عثمانؓ کو جب حضرت ابوذرؓ کی موت کا علم ہوا تو ان کے لئے دعائے مغفرت کی۔ اور ان کے اہل و عیال کو اپنے اہل و عیال میں شامل کر لیا۔

حضرت عمار بن یاسرؓ نے حضرت ابوذرؓ کی اس مسکنت پر رنج و قلق اور رحم و مہربانی کا اظہار کیا جس کا مطلب حضرت عثمانؓ نے یہ لیا کہ عمار انہیں حضرت ابوذرؓ کی جلا وطنی پر ملامت کر رہے تھے۔ لہٰذا، حضرت عثمانؓ حضرت عمارؓ سے ناراض ہو گئے اور حکم دیا کہ وہ بھی جلا وطن ہو کر ربذہ چلے جائیں۔ جب حضرت عمار ربذہ جانے کے لئے تیار ہو گئے تو ان کے حلیف بنو مخزوم کو طیش آ گیا۔ حضرت علیؓ بھی غضب ناک ہو گئے اور حضرت ابوذرؓ کی جلا وطنی پر حضرت عثمانؓ کو برا بھلا کہا نیز حضرت عمارؓ کے بارے میں باز رہنے کی ہدایت کی اس موقع پر دونوں بزرگوں میں جھڑپ بھی ہو گئی حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ سے کہا آپ حضرت عمارؓ سے افضل نہیں ہیں۔ آپ بھی اس سے کم جلا وطنی کے مستحق نہیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے دعوت مبارزت دیتے ہوئے کہا "آپ کی مرضی ہو تو یہ بھی کر دیکھیں" —— یہ رنگ دیکھ کر مہاجرین اٹھے اور انھوں نے بھی حضرت عثمانؓ کو ملامت کی اور کہا "جب بھی آپ کسی سے ناراض ہوتے ہیں تو اسے جلا وطن کر دیتے ہیں۔ یہ کوئی مناسب اقدام نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ باز آ گئے اور حضرت عمارؓ یا حضرت علیؓ سے کوئی تعرض نہ کیا۔

جیسا کہ آپ نے دیکھا حضرت ابوذرؓ کی مخالفت کا تعلق بنیادی طور پر نظامِ اجتماعی کی وجہ سے تھا۔ وہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ دولتمند اتنا دولتمند ہو جائے کہ سونے چاندی کے انبار لگنے لگے اور غریب اتنا غریب ہو جائے کہ اس کے پاس خرچ کے لئے پھوٹی کوڑی نہ رہے۔ پھر وہ اس امر کو بھی ناپسند کرتے تھے کہ امام مسلمانوں کا مال بلا استحقاق دولت مندوں کو عطا کر کے انھیں دولت مند تر اور محتاجوں کو محتاج تر بنا دے۔ انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ سخاوت کا مورد ان لوگوں کو بنایا جائے جنھیں اس کی ضرورت نہیں یا اس مال کو عوام کی رفاہ و بہبودی کے علاوہ کسی اور کام پر خرچ کیا جائے۔ علاوہ ازیں وہ خلیفہ کو ہرگز اس بات کا حقدار نہ سمجھتے تھے کہ انھیں تنقید سے روکے یا اعتراض اٹھانے پر سزا دے۔ انھیں رضائے الٰہی جو غضب سلطانی کی مستلزم ہو اس رضائے سلطانی سے زیادہ محبوب تھی جو غضب الٰہی کی مستوجب ہو۔

پھر ابوذرؓ کی مخالفت پیچیدہ تر ہو کر سیاسی شکل اختیار کر گئی۔ انھوں نے خلیفہ اور گورنروں کو مال مسلمین کے ناحق صرف کرنے پر ملامت کرنے پر بس نہ کی بلکہ وہ گورنروں کی تقرری اور معزولی کے بارے میں بھی حضرت عثمانؓ کی سیاست پر گرفت کرتے اور نوجوانوں اور طلقاء کے بیٹوں کے انتخاب پر انگشت نمائی کرنے لگ گئے۔ لیکن اس تمام مخالفت اور تنقید کے باوصف نہ حضرت ابوذرؓ نے علم بغاوت بلند کیا اور نہ اطاعت سے دست کش ہوئے نہ انھوں نے خلیفہ کی

سزا قبول کرنے سے انکار کیا نہ اس کی طرف سے کسی پہنچائی جانے والی تکلیف کی کبھی مدافعت کی، حضرت ابوذرؓ کی مخالفت سلبی تھی جو شدید تنقید اور چبھنے والی سخت نصیحت پر منحصر تھی۔ یہی باعث ہے کہ جب انھیں شام جانے کا حکم دیا گیا تو وہ شام چلے گئے۔ ربذہ کا حکم ملا تو وہ ربذہ چلے گئے۔ اور یہی کہتے رہے کہ مجھے تو اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ خواہ میرا امیر کوئی ناک کٹا ہوا غلام ہی کیوں نہ ہو ——— جو لوگ یہ چاہتے تھے کہ حضرت ابوذرؓ ایجابی مقابلہ میں ان کی قیادت کریں۔ انھیں وہ یہ جواب دیا کرتے تھے کہ اگر حضرت عثمانؓ مجھے کسی اونچے کھجور کے تنے سے لٹکا دیں تب بھی میں نافرمانی نہیں کروں گا۔

گویا حضرت ابوذرؓ یہ اپنا جائز حق سمجھتے تھے کہ امکانی حد تک مخالفت کرتے رہیں لیکن یہ کچھ دائرۂ اطاعت میں رہ کر امام کی بغاوت سے بچتے ہوئے کریں۔

———(٥)———

اکیسواں باب

حضرت عمار بن یاسرؓ

حضرت عمار بن یاسرؓ درماندگانِ مکہ میں سے تھے، ان کے والد یاسر یمنی النسل اور بنی مخزوم کے حلیف تھے۔ والدہ سمیہ بنی مخزوم کی باندیوں میں سے تھیں۔ حضرت عمارؓ حضرت صہیبؓ کے ساتھ رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کر لیا۔ اس وقت تک چونکہ اسلام قبول کر چکے تھے ان کی تعداد کچھ اوپر تیس تھی۔ ان کے اسلام لانے کے بعد ان کے والدین بھی مسلمان ہو گئے۔ اس پر قریشی اس پورے خاندان کو عجیب تکلیفیں پہنچانے لگے، حضرت عمارؓ کو کبھی چلچلاتی دھوپ میں مکہ کی ریتلی زمین پر لٹایا جاتا اور کبھی آگ سے جلایا جاتا۔ قریش انہیں مبتلائے عذاب کرتے اور کہتے کہ اس وقت تک معاف نہ کریں گے جب تک کہ تم اپنے نبی کو برا بھلا نہ کہو اور ہمارے بتوں کی تعریف نہ کرو۔ حضرت عمارؓ نے زیادہ [illegible] رسول اکرمؐ کے حضور [illegible] فرمایا:

اِنْ عَادُوْا فَعُدْ

اگر وہ دوبارہ ایسا کریں تو تم بھی دوبارہ کہنا۔

خدائے عزوجل نے قرآن مجید میں حضرت عمارؓ کے بارے میں کئی آیات نازل کیں۔ حضور اکرمؐ کو ان کی اور ان کے والدین کی حالتِ زار پر سخت رنج ہوتا تھا۔ آپؐ ان پر اور ان کے والدین پر ترس کھاتے اور جب کبھی ان کے پاس سے ایسی حالت میں گزرتے کہ ان کو تکلیفیں دی جا رہی ہوں تو ان پر رحم کا اظہار فرماتے ان کے لئے مغفرت کی دعا کرتے اور انہیں جنت کی بشارت دیتے۔ حتیٰ کہ ایک روز آپؐ نے فرمایا: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِآلِ یَاسِرٍ وَ قَدْ فَعَلْتَ الٰہی خاندانِ یاسر کی مغفرت فرما، اور تو نے ایسا کر دیا ہے۔ حضرت عمارؓ نے پہلے حبشہ اور پھر مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے مکہ میں اپنے گھر میں نماز کی جگہ بنا کر وہاں نماز ادا کی۔ مسجدِ نبوی کی تعمیر میں بھی آپ نے بطرزِ احسن مشارکت کی۔ ہر مسلمان ایک ایک اینٹ اٹھاتا تھا اور حضرت عمارؓ دو دو اینٹیں اٹھاتے تھے۔ اور زبان پر یہ نغمہ جاری تھا" نحن

المسلمون یبنی المساجدا" رسولِ خدا بھی اس نغمے کا آخری حصّہ " المسَاجدا " ان کی آواز میں آواز ملا کر دہراتے جاتے تھے ۔ اسی طرح خندق کھودنے میں بھی حضرت عمارؓ نے بہت بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ۔ یہاں تک کہ خود جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جسم سے گرد جھاڑتے تھے ۔ جنگِ بدر و احد اور دیگر تمام معرکوں میں بھی وہ نبی اکرمؐ کے شانہ بشانہ شریک رہے ۔ جنگِ یمامہ میں انتہائی بے جگری کے ساتھ لڑے ۔ اس روز بعض مسلمانوں نے انھیں ایک چٹان پر کھڑے یہ اعلان کرتے دیکھا[۱] " اے مسلمانو ! کیا تم جنّت سے بھاگتے ہو ! "

حضرت عمرؓ نے انھیں پورے صوبہ کوفہ کا گورنر مقرر کیا اور ان کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو بیت المال کا امین اور حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کو کوفہ شہر کا حاکم متعین کیا ۔ ان تینوں کو ایک بھیڑ یومیہ بطور راتب ملتی تھی ۔ جس میں نصف حضرت عمار کا اور عبداللہ اور حذیفہ رضی اللہ عنہما میں سے ہر ایک کا چوتھائی حصّہ ہوتا تھا ۔ جب حضرت عمرؓ نے انھیں کوفہ سے معزول کیا تو پوچھا " ہمارے معزولی کے حکم پر آپ نے بُرا تو نہیں مانا ؟ " حضرت عمارؓ نے جواب دیا " اب جب آپ نے یہ بات پوچھ ہی لی تو پھر بتلائے دیتا ہوں ۔ جب آپ نے مجھے گورنر متعین کیا تھا اس وقت بھی مجھے یہ بامر نا گوار لگا تھا اور جب آپ نے معزول کیا تو اس وقت بھی مجھے رنج ہوا ! "

حضرت عمارؓ نے بھی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ حضرت عثمانؓ کی بیعت کر لی ۔ لیکن جلد ہی واقعات نے ایسا رُخ اختیار کر لیا کہ حضرت عمارؓ حضرت عثمانؓ کے شدید مخالف ہو گئے ۔ وہ مسلسل ان پر اعتراضات اور تنقیدیں کرتے رہے ۔ حتّٰی کہ ایک روز جب لوگوں میں چرچا ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے بیت المال سے ایک ہیرا نکال کر اپنے گھر والوں میں سے کسی کے لئے زیور بنا دیا تو لوگ طیش میں آ گئے اور انھوں نے حضرت عثمانؓ کو اس کارروائی پر ملامت کی ۔ اس پر حضرت عثمانؓ غضب ناک ہو گئے ۔ اور لوگوں کو خطاب کر کے کہا " ہم اپنی ضروریات اسی مالِ غنیمت سے پوری کریں گے خواہ بعض لوگوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے ۔ " اس پر حضرت علیؓ نے کہا " اگر ایسا کیا گیا تو آپ کو روک دیا جائے گا اور آپ کے اور بیت المال کے درمیان آڑ کر دی جائے گی ۔ " حضرت عمارؓ بن یاسر نے کہا " میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں اس امر پر اظہار ناپسندیدگی کرنے والوں میں سرِ فہرست ہوں " جواباً حضرت عثمانؓ نے کہا ۔ " اے چاکر زادے میرے سامنے یہ گستاخی ؟ " اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے انھیں گرفتار کرا دیا ۔ جب حضرت عمارؓ کو حضرت عثمانؓ کے پاس لایا گیا تو حضرت عثمانؓ نے انھیں اتنا پیٹا کہ وہ بے ہوش ہو گئے[۲] ۔ لوگ انھیں اٹھا کر ام المومنین حضرت ام سلمہؓ

---

[۱] انساب الاشراف للبلاذری ص[؟] مطبوعہ قدس ۔

کے گھر لے گئے ۔ دن کا باقی حصہ بھی بے ہوشی میں گزرا۔ چنانچہ ظہر، عصر اور مغرب کی نماز قضا ہو گئی جب ہوش میں آئے تو وضو کیا اور نماز پڑھی اور کہا "الحمد للہ یہ پہلا موقع نہیں کہ ہم نے راہِ خدا میں تکلیفیں برداشت کی ہوں" کہا جاتا ہے کہ حضرت ام سلمہؓ یا حضرت عائشہؓ نے سرورِ کونین کے کچھ موئے مبارک، کپڑے، اور پاپوش نکال کر کہا۔ "یہ رسولِ خدا کا کپڑا۔ بال اور پاپوش ہیں جو بالکل تازہ ہیں ان میں کچھ کہنگی کے آثار نہیں ہوئے اور ابھی سے تم لوگ ان کی سنت کو معطل کرنے لگ گئے ہو" اس پر لوگوں نے شور مچا دیا۔ حضرت عثمانؓ کی حالت دِگرگوں ہو گئی اور ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہیں۔

حضرت عمارؓ نے ایک بار پھر دوسرے صحابہؓ کے ساتھ ایک خط کی تحریر میں شمولیت کی جو حضرت عثمانؓ کے نام لکھا گیا تھا جس میں انھوں نے حضرت عثمانؓ کو ملامت و نصیحت کی تھی، حضرت عمارؓ یہ خط لے کر حضرت عثمانؓ کے پاس آئے اور اس کا ابتدائی حصہ پڑھ کر سنایا۔ حضرت عثمانؓ نے انھیں گالیاں دیں۔ اور لاتیں ماریں ان کے پیروں پر چمڑی موزے تھے، حتیٰ کہ ایک لات لگنے کی وجہ سے حضرت عمارؓ کے پیٹ کا پردہ پھٹ جانے کی وجہ "فتق" کی بیماری ہو گئی، حضرت عمارؓ بوڑھے اور ضعیف تھے۔

حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابوذرؓ کے بارے میں حضرت عمارؓ کا مؤقف ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یہ بھی قلمبند کیا جا چکا ہے کہ حضرت عثمانؓ حضرت عمارؓ کو جلا وطن کرنے کا ارادہ کر چکے تھے لیکن پھر باز آگئے، بہر صورت یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت عمارؓ حضرت عثمانؓ کے شدید ترین مخالف سب سے زیادہ ان کو بدنام کرنے والے' ان کے خلاف سخت طعن و تشنیع کرنے والے تھے۔ حضرت عثمانؓ کی مخالفت میں وہ میانہ رو صحابہ کرام کے بھی شریک تھے اور مدینہ کے نو وارد غالیوں کے بھی ــــــ یہی باعث ہے کہ انھیں اس ضمن میں بار بار تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ تھے وہ لوگ جو مدینہ میں مخالفین کے سرخیل تھے۔ آپ نے دیکھ لیا کہ وہ سب کے سب صحابۂ کبار اور عظمائے مہاجرین میں سے تھے۔ رہے انصار تو وہ اس مخالفت میں اس لئے پیش پیش نہ تھے کہ وہ حکومت سے بے تعلق کر دیئے گئے تھے۔ تاہم دیگر عوام کی طرح وہ بھی اس مخالفت میں حصہ لیتے تھے، ان میں بھی اعتراض کرنے والے وقتاً فوقتاً اعتراض کرتے رہتے تھے۔ جیسا کہ زیاد البیاضی کے عبید اللہ بن عمرؓ کے بارے میں کہے ہوئے اشعار سے معلوم ہوتا ہے جو ہم نے پہلے درج کئے ہیں۔ انصار کی اکثریت حضرت عثمانؓ کے خلاف تھی۔ ان میں بہت کم حضرت عثمانؓ کے حمایتی تھے۔ ان میں سب سے مقدم زید بن ثابتؓ۔ کعب بن مالکؓ۔ اور حسان بن ثابت تھے۔ انصار کے سربرآوردہ حضرات کبھی کبھی حضرت عثمانؓ اور ان کے معترضین کے مابین ثالثی کی کوششیں کرتے رہتے تھے۔ جیسا کہ

آیندہ صفحات میں آپ محمد بن مسلمہ کی مصریوں اور حضرت عثمانؓ کے مابین ثالثی کا تذکرہ دیکھیں گے۔

حضرت عثمانؓ کے دور میں مدینہ میں مخالفت و اعتراضات کی ایک عمومی خفیہ رَو بھی چل پڑی تھی جس کے متعلق یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ چلی کہاں سے ہے۔ لیکن عوام میں اس کا چرچا ہو جاتا تھا۔ مثلاً جب حضرت عثمانؓ نے مسجد نبوی کی توسیع کی تو لوگ کہہ رہے تھے "رسول اکرمؐ کی مسجد کو تو وسعت دے رہے ہیں لیکن آپؐ کی سنت کی فکر نہیں کرتے"۔ یا مثلاً جب مدینہ شریف میں کبوتروں کی کثرت ہو گئی اور نوجوانوں نے ان کو نشانہ بنانا شروع کیا تو حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو بغیر ذبح کئے کبوتر مارنے سے مجتنب رہنے کی ہدایات دیں اور ایک آدمی کو اس امر پر متعین کیا کہ وہ لوگوں کو کبوتروں کا نشانہ بنانے سے روک دے۔ اس موقع پر یہ کلمات زبان زدِ عام تھے "کبوتروں کو تو ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ لیکن رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جسے نکال دیا تھا اسے پناہ دے رہے ہیں"۔ یہ اشارہ حضرت عثمانؓ کے حکم بن ابی العاص اور اس کے بیٹوں کو پناہ بخشنے کی طرف تھا۔

میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کے سامنے حضرت عثمانؓ کے دور کے لوگوں نیز اطراف مملکت اور مرکزی مخالفت کے ان حالات کا تقریباً پورا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے، جب کہ حادثات رونما ہو رہے تھے۔ اور اب یہ بات مشکل نہیں رہی کہ ہم براہِ راست ان حادثات کا جائزہ لیں۔ لہٰذا، اب ہم ان واقعات و حادثات کو قدیم مؤرخین کی آراء کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور بعد ازاں، ہم ان پر اپنا تبصرہ کریں گے اور اس سلسلہ میں حتی المقدور ہم اعتدال، حق اور صواب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں گے۔

بائیسواں باب

حضرت عثمانؓ کی مخالفت کے اسباب

سلسلہ فتوحات حسبِ سابق بلا اختلاف جاری تھا

ہم سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ قدماء میں سے جن لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے طرزِ عمل پر نکتہ چینی کی ہے انھوں نے فتوحات کے ضمن میں کوئی تنقید و اعتراض نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جنگی سیاست اسی نہج پر جاری رہی جیں پر حضرت عمرؓ کے عہد میں جاری تھی اور جس پر کاربند رہنے کی حضرت عثمانؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد ایک خط کے ذریعہ جو قبل ازیں درج کیا جاچکا ہے اپنے سپہ سالاروں کو ہدایت کی تھی۔ وہ لوگ جو عہدِ عثمانؓ کی تاریخ فتوحات کا بغور مطالعہ کرتے ہیں ان پر واضح ہوجاتا ہے کہ ان کے عمال و قواد نے میدانِ جنگ میں مردانگی کے خوب جوہر دکھائے اور اس سلسلہ میں اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھا، بعض اضلاع اور صوبہ جات جو حضرت عمرؓ کے دور میں فتح ہوئے ایسے بھی تھے جہاں بغاوت ہو رہی تھی یا بغاوت کے آثار پائے جا رہے تھے اور ان کے گورنروں اور فوجی کمانڈروں نے بڑی چابکدستی سے اکثر اوقات جنگ کے ذریعے اور کبھی محض اظہارِ قوت و شوکت سے مرعوب کر کے اپنی اطاعت پر مجبور کر لیا۔

جب حضرت عمرؓ فوت ہوئے تو ایران مکمل طور پر مفتوح نہ ہو پایا تھا۔ ابھی کسریٰ یزدجرد بقیدِ حیات تھا جو شکست کھا کر ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہو رہا تھا، ایک جگہ لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے تو دوسری جگہ لوگ اس کے پاس سے منتشر ہونے جاتے تھے۔ لیکن بایں ہمہ یزدجرد اپنی موروثی بادشاہت کے گھمنڈ میں مبتلا تھا۔ وہ اپنی مغلوب رعایا، جنگجو افواج اور ان علاقوں کے باشندوں سے جہاں تک جنگ کے شعلے ابھی نہیں پہنچے تھے اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ اس کی اطاعت کا دم بھریں اور اس کی بادشاہت کا اعتراف کریں۔ لیکن حضرت عثمانؓ کے عمال اور فوجی کمانڈر مسلسل ان سرحدی علاقوں میں چھاپے مارتے رہتے جو کوفہ و بصرہ سے ملحق تھے اور فتح پر فتح حاصل کئے جاتے وہ یزدجرد کے حامیوں کا سختی سے تعاقب کرتے اور ان کی جمعیت کو منتشر کر دیتے، وہ ان علاقوں اور شہروں کو اپنے زیرِ نگیں کر لیتے تھے جہاں یزدجرد کا حقیقی یا خیالی تسلط ہوتا۔ بالآخر انھوں نے یزدجرد

کو مجبور کر دیا کہ وہ بے یار و مددگار وہاں سے نکل بھاگے۔ اور پھر اسی بے سرو سامانی کے عالم میں وہ مارا گیا اور اس طرح عہدِ عثمانؓ میں کسرائی کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ دوسری طرف حضرت عثمانؓ کے عمال اور کمانڈروں نے ترکوں کی سرزمین میں داخل ہونا شروع کر دیا، جہاں ترکوں کے ساتھ ان کی کئی جھڑپیں ہوئیں۔ آرمینیہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں فتح ہوا۔ انہی کے زمانے میں سلطنت کا اقتدار مغرب میں پھیلا۔ افریقہ زیرنگیں ہوا اور اندلس پر چڑھائی کی گئی۔ انہی کے زمانۂ خلافت میں حضرت معاویہؓ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے اس (بحری) مہم کا آغاز کیا جس پر عہدِ عمرؓ میں کوئی والی یا عامل قادر نہ ہو سکا تھا۔ چنانچہ ان دونوں سالاروں نے رومن حکومت سے بحری جنگیں کیں اور جزیرہ سائپرس ان سے چھین لیا حتیٰ کہ اسلامی بیڑہ تنگنائے قسطنطنیہ تک جا پہنچا۔ اور عبداللہ بن سعد نے جنگ ذات الصواری میں رومی بیڑے پر بڑی زبردست فتح حاصل کی۔

حضرت عثمانؓ کو وہی عسکری قوت حاصل تھی جس سے حضرت عمرؓ بہرہ مند تھے۔ بلکہ مفتوحہ علاقوں کی توسیع، سلطنت کسریٰ کا خاتمہ اور رومن حکومت پر غلبہ وہ امور ہیں جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی حاصل نہ ہوئے تھے۔ لیکن خود یہی چیزیں فتنہ و اختلاف کا باعث بن گئیں۔ یہ فتوحات بڑی مقدار میں مالِ غنیمت مسلمانوں کے قدموں پر ڈال دیتی تھیں۔ اور حضرت عثمانؓ اس مالِ غنیمت کے بعض حصوں پر اس طرح تصرف کرتے تھے کہ بسا اوقات فوج اس پر مشتعل ہو جاتی تھی۔ جیسا کہ عبداللہ بن سعد اور مروان بن حکم کے معاملہ میں فتح افریقہ کے موقع پر ہوا، کبھی ان کا یہ تصرف مہاجرین و انصار کو بھڑکا دیتا تھا جیسے کہ حضرت عثمانؓ کے بیت المال کے ہیرے کو زیور بنا لینے پر ہوا تھا۔ یہاں تک کہ عامۃ المسلمین نے حضرت عثمانؓ کو برا بھلا کہا جس پر بگڑ کر انہوں نے عوام سے خطاب کیا اور جس کا انجام حضرت عمار بن یاسر کے زدوکوب پر منتج ہوا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ دولتِ اسلامیہ کا اقتدار خارجی پالیسی کے اعتبار سے بدستور قائم رہا۔ بلکہ عہدِ عثمانؓ میں اس کے طنطنہ و دبدبہ میں کچھ اضافہ ہی ہوا۔

عہدِ عثمانی پر تنقید کرنیوالوں کے مختلف نقطہ ہائے نظر

ہم دیکھتے ہیں کہ عہدِ عثمانؓ میں رونما ہونے والے واقعات اور ان سے حضرت عثمانؓ کے تعلق کے بارے میں لوگوں کے مؤقف میں شدید اختلاف ہے۔ ایک گروہ تو یہ کہہ کر پوری طرح مطمئن ہو گیا کہ ان میں سے اکثر و بیشتر واقعات جھوٹے اور من گھڑت ہیں۔ جن کا وقوع پذیر ہونا بھی صحیح طور پر ثابت نہیں ہے۔ ان کے نزدیک یہ تمام واقعات محض افسانہ سازوں کی کارستانی تھی۔ جن سے اسلام کے خلاف سازش مقصود تھی۔ اور مختلف جماعتوں کی باہمی سخت رقابتوں اور مخالفتوں کی وجہ سے لوگ مجبوراً اس کا شکار ہو گئے۔ ان وجوہ کی بنا پر وہ اکثر حادثات کا انکار کر دیتے ہیں جن واقعات کا ہونا وہ تسلیم کرتے ہیں ان کے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے، وہ انھیں ایسے

اجتہادی امور میں شامل کرتے ہیں جن میں اگر مجتہد کا فیصلہ مبنی برصواب ہے تو وہ ثواب کا مستحق ہے اور اگر غلطی سرزد ہو جائے تو بھی اسے ایک اجر ضرور ملے گا۔ کیونکہ بہرصورت ان کے مدنظر بہتری کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ حضرت عثمانؓ اور دیگر صحابۂ کرامؓ کی باہمی چپقلش کی جن روایات کو صحیح تسلیم کرتے ہیں ان کے متعلق بھی یہی رائے رکھتے ہیں کہ اس قسم کی روایات میں سے اکثر تو جھوٹی اور من گھڑت ہیں اور ان میں سے تھوڑی سی جنھیں صحیح تسلیم کرتے ہیں تو وہ بھی اسی تاویل کے ساتھ کہ یہ اجتہاد کا نتیجہ ہیں اور بموجب حدیث اجتہاد کرنے والا اگر صحیح فیصلہ پہ پہنچ گیا تو اس کے لئے دو اجر ہیں۔ اگر غلط فیصلہ پہ پہنچا تو اس کے لئے ایک اجر ہے۔

بیشتر لوگ جو اس نقطۂ نظر کے قائل ہیں وہ اس لئے یہ روش اختیار کرتے ہیں کہ ان کی نظر میں اسلام کا وہ دور نہایت مقدس مانا جاتا ہے۔ وہ یہ گوارا نہیں کرتے کہ اصحابِ رسولؐ پر بھی وہی الزام وارد کئے جائیں جو معمولاً تمام ان لوگوں پر عائد کئے جاتے ہیں جن کا تعلق دنیوی امورؐ کے دروبست سے ہوتا ہے۔ جن کی طبیعتوں میں رقابت جاگزیں ہوتی ہے اور جو اغراضِ نفسانی پر مبنی ہیں کیونکہ ایسی باتیں ان بندگوں کے شایانِ شان نہیں جنھوں نے رسولِ خدا کی صحبتیں اٹھائی ہوں۔ راہِ خدا میں مردانہ وار کڑیاں جھیلی ہوں اور دولتِ اسلامیہ کی بنیاد رکھنے کے لئے اپنی جان و مال اور جد و جہد کی قربانی دی ہو۔ وہ غلطی کے مرتکب ہوں یا صحیح کام کریں بہرحال ان کی حیثیت مجتہدین کی سی ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ بہتری کے لئے ہی کوشاں رہتے ہیں۔ لہٰذا، یہ ممکن نہیں کہ وہ کبائر کے مجرم ہوں۔ ان سے چھوٹی چھوٹی فروگزاشتیں ہو سکتی ہیں جنھیں خدا اپنے نیک بندوں سے معاف کر دیتا ہے۔ اس رائے کے حامل لوگوں ..... میں تھوڑی سی تعداد ان کی بھی ہے جو اس رائے پر محض ذہنی کسلمندی کی وجہ سے کاربند ہیں کیونکہ وہ انہیں بحث و مطالعہ اور استیعاب سے روکتی ہے۔

دوسرا گروہ اپنے دلوں کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتا ہے کہ ایسے واقعات کا اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں سرزد ہونا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ بلکہ یہ سب عبداللہ بن سبا اور اس کے ہمنوا دشمنانِ اسلام کی حیلہ سازیاں تھیں۔ جن کے ساتھ کچھ اہلِ کتاب اور کچھ غیر اہلِ کتاب شامل ہو گئے تھے۔

بخوبی ظاہر ہے کہ ہم نہ یہ طریق اختیار کر سکتے ہیں نہ وہ۔ نہ ہم سستی پسند ہیں نہ آرام پسند، ہم لوگوں کے تقدس و احترام میں اس حد تک غلو بھی نہیں کر سکتے اور نہ ہم اصحاب نبیؐ میں وہ خصائل تسلیم کرتے ہیں جن کی موجودگی کے وہ خود بھی اپنے لئے معترف نہ تھے۔ وہ تو اپنے آپ کو بشر ہی سمجھتے تھے، اور مانتے تھے کہ جن خطاؤں اور گناہوں کا ارتکاب انسان کر سکتے ہیں وہ بھی ان کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے باہم شدید تہمت تراشیاں کیں، ایک نے دوسرے کو کافر و فاسق گردانا۔ یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضرت عمار بن یاسرؓ حضرت عثمانؓ کو کافر بتلاتے تھے اور ان کا خون مباح قرار دیتے تھے، نیز

انھوں نے ان کا نام نعثل (جس کے معنی ہیں لمبی داڑھی والا بے وقوف) رکھ دیا تھا۔ اسی طرح یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ قیام کوفہ کے دوران میں حضرت عثمانؓ کا خون مباح ہونے کا اعلان کیا کرتے تھے۔ وہ لوگوں سے خطاب کر کے کہتے تھے "بدترین امر وہ ہے جو غیر مسنون ہو۔ ہر غیر مسنون امر بدعت ہے ہر بدعت گمراہی ہے۔ اور ہر گمراہی کی سزا جہنم ہے" اس سے ان کا اشارہ حضرت عثمانؓ اور ان کے عامل ولید کی جانب ہوتا تھا۔

یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے حضرت علیؓ سے کہا تھا کہ اگر آپ کی مرضی ہو تو تلوار اٹھایئے میں بھی اپنی تلوار اٹھاتا ہوں۔ کیونکہ حضرت عثمانؓ نے میرے ساتھ جو عہد کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی ہے۔ اسی طرح یہ روایت بھی ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے دورانِ مرضِ موت کہا "عثمانؓ کا فوری تدارک کرو۔ انہیں اتنی مہلت نہ دینا کہ ملک میں سرکشی و بغاوت پھیل جائے"۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں سے جنھوں نے حضرت عثمانؓ کی مدد کی تھی ان کا خیال تھا کہ ان کے مخالفین دین کے باغی اور دین کی مخالفت پر کمربند ہیں۔ اس بناء پر ان سب کے لئے ایک دوسرے سے جنگ مباح ہو چکی ہے۔ جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں عملاً انھوں نے ایک دوسرے کے خلاف جنگ کی۔ حضرت سعدؓ اور ان کے قلیل ساتھی مستثنیٰ ہیں۔ جو شریک فتنہ نہ ہوئے اور نہ میدانِ جنگ میں لے جائے جا سکے۔ جب حضرت سعدؓ کے یہ الفاظ سامنے آتے ہیں تو ان لوگوں کے مؤقف کی صحیح تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے ـــــ "میں اس وقت تک جنگ میں شریک نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم مجھے کوئی ایسی تلوار نہ لا دو جو بول کر یہ بتا سکتی ہو کہ یہ مؤمن ہے اور یہ کافر ہے"۔

جب خود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں باہم اس قدر اختلاف تھا، وہ ایک دوسرے کو کبائر کے ارتکاب کا مجرم گردان رہے تھے اور اس سلسلہ میں وہ ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے تھے تو ان کے حق میں ہماری رائے کا خود ان کی اپنی رائے سے بہتر ہونا لازمی نہیں ہے۔ ہمیں ان لوگوں کی روش بھی اختیار نہیں کرنی چاہیئے جو فتنہ و اختلاف سے متعلق بیشتر روایات جھوٹی اور ناقابلِ اعتبار قرار دیتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم بعثتِ نبوی سے لے کر آخر تک ساری تاریخ اسلامی ہی کو جھٹلا دیں گے کیونکہ ان اخبار فتنہ و اختلاف کے راوی وہی لوگ ہیں جو فتوحات۔ غزوات سیرۃ النبیؐ اور سیرۃ خلفاء کے راوی ہیں۔ ہمیں یہ بھی نہیں چاہیئے کہ جو بات ہمیں پسند ہو اس کی تصدیق کر دیں۔ اور جو بات ناگوار گزرے اس کو رد کر دیں۔ یہ کسی طرح مناسب نہیں ہوگا۔ ہم محض اپنی خوشنودی یا ناراضی کے باعث ایک ہی تاریخ کے بعض حصّہ کو صحیح مانیں اور دوسرے کو غلط بتائیں۔ اسی طرح یہ بھی بجا نہ ہوگا کہ ہم ساری تاریخ اور تمام روایات کو صحیح مان لیں یا ان سب کو یکسر جھٹلا دیں۔ کیونکہ مؤرخین اور روایات بیان کرنے والے بھی آخر انسان ہی تھے۔ لہٰذا، وہ خطا و صواب اور راستی و دروغ دونوں کا مصدر ہو سکتے ہیں۔ خود قدماء کو اس امر کا اعتراف تھا۔ چنانچہ اسی لئے انھوں نے قواعد جرح و

تعدیل اور تصدیق و تکذیب مرتب کئے۔ جو بات قابلِ ترجیح نظر آئی اسے ترجیح دی جو رد کی مستحق ہوتی اسے رد کر دیا اور جو شک و شبہ کی متقاضی نظر آئی اسے مشکوک قرار دے دیا۔ اس لئے اگر ہم بھی وہی طریقہ اختیار کریں جو قدماء نے کیا تھا تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔ بلکہ ہم تنقید کے ان قدیم قواعد میں ان جدید قواعد کا اضافہ کریں گے جن سے عہدِ حاضر کے لوگ روایات و نصوص کی تحقیق و تحلیل اور تنقیح میں مدد لیتے ہیں۔[2]

یہ حقیقت ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ حضرت عثمانؓ کے بارے میں لوگوں میں اختلاف ہوا تھا یہ اختلاف بڑھ کر بغاوت کی شکل اختیار کر گیا۔ جس کا انجام شہادتِ عثمانؓ کی شکل میں نمودار ہوا۔ اور اسی بغاوت نے مسلمانوں میں وہ پھوٹ ڈالی جس کے بعد سے آج تک متحد نہیں ہو سکے۔

لازماً اس اختلاف کے کچھ اسباب ہونے چاہئیں۔ اور لازماً اس بغاوت کے کچھ مبادیات بھی ہوں گے۔ حضرت عثمانؓ نے خودکشی تو نہیں کی تھی۔ اور نہ اپنے قاتلوں کے سامنے اپنی جان بطور قربانی پیش کی تھی، یہ بھی ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے ان کی مخالفت کی اور بغاوت کر کے انہیں قتل کیا۔ انہوں نے یہ ارتکاب بے سبب اور بلا وجہ تو نہ کیا ہوگا۔ یقیناً کچھ ایسے امور و اسباب ظہور پذیر ہوئے تھے جن کو بجا یا بے جا طور پر ناپسند کیا گیا۔ اور پھر یہی عدم رضامندی موجب اختلاف و بغاوت بن کر اس غیر معمولی حادثہ کا باعث بن گئی جس سے مسلم عوام کو قبل ازاں کبھی پالا نہ پڑا تھا۔۔۔۔ وہ حادثہ تھا امام کا بزور وجبر قتل۔[3]

ان سب باتوں کے باوصف یہ بات بھی ہمارے پیشِ نظر ہے کہ حضرت عثمانؓ کی امامت بلا شک و شبہ برحق تھی۔ کیونکہ تمام مسلمانوں نے ہم نوا ہو کر ان کی بیعت کی تھی۔ ان کی امامت پر رضامندی کا اظہار کیا، اور ان کی اطاعت کا اقرار کیا تھا۔ انتخاب خلیفہ کے بارے میں مسلمانوں کے طریقہ پر بحث کرنے والے خواہ کچھ بھی کہیں حضرت عثمانؓ کا انتخاب بالکل صحیح تھا اور امت کا اس پر اجماع ہو گیا تھا، حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت پر بھی سب متفق تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے معاملے میں حضرت سعد بن عبادہ کے سوا کسی نے مخالفت نہ کی تھی۔ لیکن ان کی مخالفت کو کوئی بھی خاطر میں نہ لایا۔۔۔۔۔ حضرت عثمانؓ کی بیعت کے بارے میں تو ایک آدمی نے بھی مخالفت نہ کی۔ وہ جو بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ نے بیعت

---

[1] سوال کسی کی پسند یا ناپسند کا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ محمد رسول اللہ والذین معہ کی جو خصوصیات قرآن میں مذکور ہیں۔ اگر کوئی روایت ان کے خلاف کچھ کہتی ہے تو ہم اسے یہ کہہ کر رد کر دیں گے کہ وہ قرآن کے خلاف ہے۔ جب ظن اور حق میں تضاد ہو تو حق کو اختیار اور ظن کو مسترد کر دینا چاہیئے۔

[2] لیکن جب سوال قرآن کی طرف سے تائید یا تردید کا ہو تو پھر تاریخ کا کوئی معیار یا اصول حکم نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے ہمارے صدرِ اول کی تاریخ کا معیار منفرد ہے

[3] اور یہ نتیجہ ہوگا ایک گہری سازش کا جس طرح حضرت عمرؓ کی شہادت۔

کرنے میں پس و پیش سے کام لیا تو یہ بات نہ تو حضرت علیؓ کی سیرت و اخلاق کے شایانِ شان ہے اور نہ حضرت صدیق و فاروقؓ کے حق میں ان کے طرزِ عمل کے ساتھ موافقت رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ عہد جو انھوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو دیا تھا، نیز خود حضرت عثمانؓ کے ساتھ جو ان کا برتاؤ تھا ان سب سے اس روایت کی تردید ہوتی ہے۔ پہلے یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ حضرت طلحہؓ بگڑ کر خانہ نشین ہو گئے تھے کیونکہ بیعت کا فیصلہ ان کی عدم موجودگی میں ہو گیا تھا۔ اور انھیں یہ افسوس تھا کہ ان کی جیسی شخصیت کو کیوں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اس کے باوجود حضرت طلحہؓ نے جلد ہی بیعت کر لی اور عامۃ الناس کی طرح وفاداری و اطاعت کا اقرار کر لیا۔ بہرحال حضرت عثمانؓ کی امامت اتنی ہی صحیح اور اجماعی تھی جتنی ان کے پیشترو ہر دو اصحاب کی تھی، لہٰذا، ہر امر دینی قول و فعل جو ان سے صادر ہوا وہ ایسے امام کا تھا جس کی بیعت مبنی بر صحت ہو اور جس کی اطاعت واجب ہو۔ لیکن جیسا کہ ہم نے قبل ازیں بیان کیا، بیعت، خلیفہ اور رعیت کے مابین ایک معاہدہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا، اس معاہدہ کی پابندی نہ تنہا رعیت پر ہے نہ اکیلے خلیفہ پر، بلکہ طرفین اس کے یکساں پابند ہیں ــــ حضرت عثمانؓ اور ان کی رعیت کے درمیان معاہدہ یہ ہوا تھا کہ حضرت عثمانؓ قرآن، سنّت رسول اور طریقۂ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر کاربند رہیں گے اور ان امور میں سے کسی بات میں بھی انحراف نہ کریں گے۔ دوسری طرف رعیت پر واجب تھا کہ جب تک حضرت عثمانؓ اس عہد پر پوری طرح پابند ہیں وہ ان کی اطاعت بجا لائیں۔ ذرا دقّتِ نظر سے اس مسئلہ کا تجزیہ کیا جائے تو صورت یہ پیدا ہوتی ہے:۔

کیا حضرت عثمانؓ نے قرآن، سنتِ رسولؐ اور سیرتِ شیخینؓ سے روگردانی کی؟ یا وہ اپنے عہد پر پوری طرح ثابت قدم رہے اور اس سے کسی قسم کا کوئی انحراف نہ کیا؟ اگر پہلی صورت ہے تو پھر حضرت عثمانؓ نے عہد شکنی کی لہٰذا مسلمانوں پر ان کی اطاعت واجب نہ رہی۔ اگر دوسری صورت ہے تو مسلمانوں کو ان کی نافرمانی، ان کے احکام کی خلاف ورزی یا ان کی سیرت پر اعتراض کرنے کا بھی کوئی حق نہیں پہنچتا، چہ جائیکہ وہ ان کی مخالفت کر کے ان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر لیں اور پھر ان کا محاصرہ کر کے انھیں قتل کر ڈالیں۔

یہ ہے مسئلہ کی وہ شکل جس کے مطابق اس پر غور کرنا چاہیئے اور جس انداز سے اس کو پیش کرنا چاہیئے۔ یہی وہ شکل ہے جس کو قدماء نے پیش نظر رکھا تھا اور جس کے مطابق انھوں نے معاملہ پر غور کیا تھا، آئیے ہم دیکھیں کہ قدماء نے اس مسئلہ پر کیسے غور کیا، اور اجمالاً و تفصیلاً اسے کس شکل میں پیش کیا تھا۔

تیئیسواں باب

حضرت عثمانؓ کے مسئلہ میں قدما کا نقطۂ نظر

قدما نے ہر اس معاملہ کو جس میں حضرت عثمانؓ کی عیب چینی اور مخالفت کی گئی ہے خالصتاً دینی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ اسی طرح جیسے حضرت عثمانؓ کے معاصرین نے دیکھا تھا خواہ وہ ان کے مخالف تھے یا موافق، کیونکہ وہ امور دینی اور دنیوی میں سے ہر چیز کو فقط دینی نقطۂ نظر ہی سے دیکھتے تھے۔ یہی باعث ہے کہ انھوں نے خطا و صواب یا عوامی نفع و نقصان سے زیادہ کفر و ایمان کو موضوع بحث بنایا تھا۔ اگر ہم اس مسئلہ میں ان کی آرار معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان واقعات کو انہی کی نظر سے دیکھنا ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں ان رونما ہونے والے واقعات میں قدرے تمیز اور فرق بھی مدنظر رکھنا ہوگا۔

ان واقعات میں بعض تو ایسے تھے جن کا تعلق خالصتاً دینی معاملات سے تھا، کیونکہ اس کے بارے میں قرآن مجید کا کوئی نص یا سنتِ نبویؐ کا کوئی عمل یا فرمان پایا جاتا تھا، بعض ایسے تھے جن کا تعلق ایسے سیاسی معاملات سے تھا جن میں خلیفۂ اسلام کے لئے اجتہاد ممکن تھا۔ خواہ وہ اس میں غلط نتیجہ پر پہنچے یا صحیح نتیجہ پر۔ اگر خلیفہ اجتہادی امور میں غلطیاں کرے تو دینی نقطۂ نظر سے اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ لیکن اگر وہ ایسے اجتہادی امور میں بھی درست فیصلہ پر پہنچے تو پھر اس کے لئے فضیلت ہی فضیلت ہے۔

اسی طرح ان واقعات میں بعض امور ایسے تھے جن کا تعلق نظامِ اجتماعی سے تھا۔ یہ بھی اسی نہج پر اجتہادی مسائل سے متعلق تھا جن میں امام غلطی بھی کرسکتا ہے اور صحیح فیصلہ بھی دے سکتا ہے۔ فیصلہ غلط ہو تو اس کے لئے عذرِ اجتہاد ہے اور صحیح ہو تو فضیلت۔ سیاسی اور اجتماعی نظام سے متعلق امور میں صحت و خطا کا فیصلہ کرنے کے لئے معیار ایک پہلو سے تو عدل ہوگا اور دوسرے پہلو سے مسلمانوں کی اکثریت کی رضامندی ہوگا۔

ان واقعات میں پہلے ہم ان حوادث کا تذکرہ کرتے ہیں جن کا تعلق خالصتاً دینی معاملات سے ہے۔ حضرت عثمانؓ

کے مخالفوں نے اس امر پر اعتراض کیا کہ انھوں نے اپنی خلافت کی بسم اللہ ہی حدود اللہ میں سے ایک حد کو معطل کرنے اور احکام قرآنی کی صریح مخالفت سے کی یہ اس طرح کہ حضرت عبید اللہ بن عمرؓ سے

حضرت عثمانؓ کے خلاف دینی حیثیت رکھنے والے اعتراضات

ہرمزان، جُفینہ اور بعض روایتوں کے مطابق ابولؤلؤہ کی بیٹی کے قتل کا قصاص نہ لیا۔ ہرمزان ایک نومسلم ایرانی سردار تھا۔ دوسرے دونوں ذمی تھے۔ خدائے تعالیٰ نے مسلمانوں اور ذمیوں میں سے ہر ایک کے خون کو معصوم و محفوظ قرار دیا ہے اور اگر ان میں سے کوئی کسی پر زیادتی کرے تو اس صورت میں تین احکام صادر فرماتے ہیں، جن کے تحت سزا دی جانی چاہیئے۔

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ
وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ
بِإِحْسَانٍ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ
عَذَابٌ أَلِيمٌ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (۲: ۱۷۸-۱۷۹)

اے ایمان لانے والو تم پر مقتولین کے معاملے میں قصاص فرض کیا گیا ہے (اس کا اصول یہ ہوگا کہ) آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت ہوگی۔ تو جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دی جائے تو اسے معروف طریقہ پر اتباع کرنا چاہیئے اور احسان ملحوظ رکھتے ہوئے وارث کو معاوضہ دیا جانا چاہیئے یہ تمہارے رب کی طرف سے رعایت اور رحمت ہے۔ پھر بعد ازاں جو کوئی بھی ان حدود کو پھاندے گا اس کے لئے المناک عذاب مقرر ہے۔ اے صاحب عقل و بصیرت! تمہارے لئے قصاص میں زندگی (کا راز پوشیدہ) ہے تاکہ تم محفوظ رہو۔

سورۂ نساء میں ارشاد ہوا کہ

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ
وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ
مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ
مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ
تَوْبَةً مِنَ اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ
خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا (۴: ۹۲-۹۳)

کسی مؤمن کو یہ زیبا نہیں کہ وہ کسی مؤمن کو قتل کرے ۔ البتہ سہو وخطا کی بات الگ ہے ۔ اور جو (مومن) کسی مومن کو غلطی سے قتل کر بیٹھے تو اس پر واجب ہے کہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا ادا کرے ۔ لیکن اگر وارث معاف کر دیں تو یہ صورت جدا ہے (یعنی دیت نہ دینی پڑے گی) اگر مقتول کسی ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہو جو تمہاری دشمن ہو بشرطیکہ مقتول خود مسلمان ہو تو مسلمان غلام کا آزاد کر دینا واجب ہے (دیت واجب نہیں) اور اگر مقتول کسی ایسی قوم سے ہو جس نے تمہارے ساتھ معاہدۂ صلح کر رکھا ہو تو اس صورت میں مقتول کے وارثوں کو خون بہا بھی دیا جائے اور ایک مسلمان غلام کو بھی آزاد کر دیا جائے ۔ جس کے پاس یہ استطاعت نہ ہو وہ خدا کے حضور اظہارِ ندامت کرتے ہوئے لگاتار دو ماہ روزے رکھے ۔ خدا خوب جاننے والا اور حکمت والا ہے ۔ جو دیدہ و دانستہ کسی مؤمن کو قتل کر دے گا تو اس کے لئے جہنم کی سزا ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ مبتلا رہے گا ۔ اس پر خدا کا غضب اور پھٹکار ہوگی ۔ اور خدا نے اس کے لئے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے ۔

اسی طرح سورہ مائدہ میں آیا ہے :۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَقَدْ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۝ (۵ : ۳۲)

اسی لئے ہم نے بنی اسرائیل پر حکماً یہ بات واضح کر دی کہ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دے دراں حالیکہ اُس (مقتول) نے نہ کسی کو قتل کیا ہو اور نہ زمین میں فساد بپا کیا ہو تو گویا اس قاتل نے تمام نوعِ انسانی کو قتل کر ڈالا ۔ اسی طرح جو شخص کسی کی جان بچائے گا تو گویا اس نے تمام نوعِ انسانی کو بچا لیا ۔ ان کے (بنی اسرائیل) پاس ہمارے رسول روشن دلیلیں لے کر آئے ۔ لیکن بعد ازاں بھی ان میں سے کثیر التعداد افراد حدود و قوانین سے تجاوز کرتے رہے ۔

سورۂ اسراء میں یہ حکم ہوا کہ

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا (۱۷ : ۳۳)

اور کسی ایسی جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہو ۔ مگر قانونِ حق کے مطابق ، اور جو ظلماً قتل کر دیا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو قانونی قوت و اقتدار دے رکھا ہے (کہ وہ قصاص کا مطالبہ کرے) اُسے چاہیئے کہ قتل قصاص میں حد سے تجاوز نہ کرے ۔ اس کو (قانونی) مدد یقیناً دی جائے گی ۔

ان تمام آیات میں وہ حدود واضح کر دی ہیں جن سے تجاوز کرنا مسلمان کے لئے ناجائز ہے۔ ان میں سے بعض قتلِ عمد سے اور بعض قتلِ بر خطا سے متعلق ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عبید اللہ بن عمرؓ نے ہرمزان اور اس کے ایک ساتھی یا دو ساتھیوں کو غلطی سے قتل نہیں کیا تھا بلکہ انھوں نے بالارادہ اور بالعمد ایسا کیا تھا اور اگر ان سے تلوار چھین نہ لی جاتی تو ممکن تھا کہ وہ کچھ اور آدمیوں کو بھی قتل کر ڈالتے۔ اس پر مخالفینِ حضرت عثمانؓ نے یہ کہا کہ حضرت عبید اللہؓ پر نصِ قرآنی کی رُو سے حد قائم ہونی چاہیئے۔ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا "کل اس کے والد قتل ہوئے اور آج میں اسے قتل کر دوں"۔ کہا جاتا ہے کہ خود مہاجرین نے حضرت عثمانؓ سے یہ بات کہی تھی۔ اہم چیز یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت عبید اللہؓ کو معاف کر دیا۔ معترضین کو جن میں حضرت علیؓ بھی شامل تھے۔ حضرت عثمانؓ نے یہ جواب دیا کہ ہرمزان اور اس کے ساتھی کا کوئی وارث نہیں ہے۔ لہٰذا، میں ہی ان کا وارث ہوں۔ کیونکہ جن کا کوئی ولی وارث نہ ہو ان کا ولی امام ہوتا ہے۔ اور خدا نے وارث کو معاف کر دینے کی اجازت دی ہے اور اس معافی کے لئے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس اعتبار سے حضرت عثمانؓ نے حضرت عبید اللہؓ کو ایک تو اس لئے معاف کیا کہ انھیں ایسا کرنے کی خدا کی طرف سے اجازت تھی دوسرے اس لئے کہ یہ مصلحت کا تقاضا تھا۔ ہم نے سابقہ اوراق میں بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ اور بعض دیگر مسلمانوں کے خیال میں حضرت عثمانؓ کو اس معافی کا اختیار نہیں تھا۔ چنانچہ ان کی رائے میں وہ معافی کے مجاز نہیں تھے۔

متکلمین بعد ازاں اس مسئلہ پر بہت غور و خوض کرتے رہے۔ اہلِ سنت اور معتزلہ کا جہاں تک تعلق ہے وہ حضرت عثمانؓ کے ہم خیال تھے۔ لہٰذا، انھوں نے کہا کہ حضرت عثمانؓ پر اس معافی سے کوئی حرف نہیں آتا۔ وارث کو معاف کر دینے کا حق حاصل ہے۔ بالخصوص جب کہ عفو کا طرزِ عمل اختیار کرنا موافق مصلحت بھی ہو۔ اور اس موقع پر حضرت عبید اللہ بن عمرؓ کی معافی داخلی اور خارجی مصلحتوں کے مطابق عمل میں آئی تھی۔ داخلی مصلحت کا ذکر ہم کر چکے ہیں یعنی اس سے مہاجرین اور بالعموم قریش کی رعایت ملحوظ تھی۔ کیونکہ وہ کہنے لگے تھے "کل ان کے والد قتل ہوئے اور آج ہم انھیں قتل کر دیں"۔ رہی خارجی مصلحت تو اس ضمن میں اہلِ سنت اور معتزلہ کا بیان یہ ہے کہ اگر حضرت عثمانؓ حضرت عبید اللہؓ کو قتل کر دیتے تو دشمنانِ اسلام کی خوشی کا باعث ہوتا اور وہ کہتے کہ انھوں نے کل اپنے امام کو قتل کیا اس کے بعد اس کے بیٹے کو مار ڈالا۔ جہاں تک شیعہ حضرات کا تعلق ہے وہ حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں سے متفق ہیں وہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کو ایسے معاملہ میں جس کی وضاحت قرآن نے بہ نصِ صریح کر دی ہو اجتہاد کرنا ناجائز تھا۔ نیز یہ کہ دشمنانِ اسلام کی شماتت کا لحاظ بھی ناروا ہے بلکہ دشمنوں کو تو یہ جان کر کہ مسلمانوں کا امام اسلام کی حدود معطل کر رہا ہے خوشی منانے کا زیادہ حق ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ کہتے ہیں کہ خود حضرت عمرؓ نے وصیت کی تھی کہ اگر ثابت ہو جائے

کہ ان کے لڑکے نے ظلماً کسی کو قتل کیا ہے تو اسے شرعی سزا دی جائے۔ لہٰذا حضرت عثمانؓ کو قوت و اقتدار رکھتے ہوئے یہ حق نہ تھا کہ وہ ایک ایسے حکم کی خلاف ورزی کرتے جسے ان کے پیش رو امام نے حتمی طور پہ صادر کیا ہو۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خدا نے اگر قتل عمد کے لئے مقررہ حد کی وضاحت کی ہے تو عفو کی ترغیب و دعوت نص صریح میں دی ہے۔ لہٰذا حضرت عثمانؓ نے معافی دے کر قرآن کی حدود سے تجاوز نہیں کیا تھا بلکہ وہ قرآن ہی پہ کاربند اور اسی کی ترغیب عفو پر عمل پیرا تھے۔ مخالفین کی یہ بات درست نہیں کہ حضرت عمرؓ نے قطعی فیصلہ کر دیا تھا، لہٰذا حضرت عثمانؓ کے لئے اس کی خلاف ورزی جائز نہ تھی۔ اگر یہ روایت صحیح بھی ہو تو حضرت عمرؓ کی وصیت اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ اگر ان کے بیٹے کے خلاف قتل ظلم کا ارتکاب ثابت ہو جائے تو اسے شرعی سزا دی جائے اور اس مسئلہ کو حق و عدل کی نظر سے دیکھا جائے۔ پھر اگر امام قصاص کا فیصلہ دے تو یہ بھی حق و عدل ہے، اور اگر عفو میں مصلحت سمجھ کر معاف کر دے تو بھی بجا ہے۔ اگر حضرت عمرؓ نے صریح حکم بھی دیا ہوتا اور پھر اس کے نفاذ سے قبل ہی فوت ہو گئے ہوتے تب بھی امام مابعد کو معافی کا حق پہنچتا تھا کیونکہ معافی حکم کی خلاف ورزی نہیں ہے۔ معافی حکم کا اقرار کر کے اس کے نفاذ سے دستبرداری کا نام ہے۔

لہٰذا، یہ کہنا جائز نہیں کہ اس قضیہ میں حضرت عثمانؓ نے حد کو معطل کر دیا۔ یا حکم خداوندی کی مخالفت کی، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عثمانؓ اپنے اختیار اور عفو میں اعتدال کی حد سے بڑھ گئے۔ کیونکہ ایک تو انھوں نے خون بہا خود اپنی جیب سے ادا کر دیا، دوسرے حضرت عبیداللہؓ کو قید کی چھوٹی بڑی کوئی سزا نہ دی۔ بالفاظ دیگر نہ حضرت عبیداللہؓ کو مالی نقصان پہنچایا نہ ان کی آزادی چھینی۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبیداللہؓ کو اس کے بعد مدینہ شریف کی اقامت راس نہ آسکی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے انھیں کوفہ بھیج دیا اور وہاں انھیں کچھ زمین اور ایک رہائشی مکان دے دیا۔ اگر ان روایات کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت عثمانؓ کا یہ طرز عمل حلم و عفو میں غلو پر مبنی تھا۔ ان کے اس طرز عمل سے لوگوں کو بجا طور پہ یہ گمان گزر سکتا تھا کہ حضرت عثمانؓ نے دو مقتولوں کے خون کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے قاتل کا خون بہا خود ادا کیا اسے پناہ دی اور قید تک نہ کیا بلکہ الٹا انھیں جاگیر اور رہائشی مکان بخش دیا۔ علاوہ ازیں لوگوں کو یہ خیال بھی پیدا ہو سکتا تھا کہ حضرت عثمانؓ نے سیاسی مصلحت اور قریش کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر یہ اقدام کیا ہے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں حضرت عثمانؓ حد اعتدال سے آگے نکل گئے۔

دوسری بات جس پر حضرت عثمانؓ کے ہم عصر مسلمانوں نے ان پہ اعتراض کیا وہ حضرت عثمانؓ کی ایک مشہور و معروف سنت کی مخالفت تھی۔ حالانکہ اس پر نبی اکرمؐ شیخین اور خود اپنے ابتدائی دور خلافت میں حضرت عثمانؓ عمل پیرا رہے تھے۔

مخالفت یہ ہے کہ انھوں نے منیٰ میں نماز پوری ادا کی حالانکہ رسول اکرمؐ شیخینؓ اور اپنے عہد خلافت کے ابتدائی کئی سالوں تک خود حضرت عثمانؓ اس مقام پہ نماز قصر کرتے رہے۔ حضرت عثمانؓ کی پوری نماز ادا کرنے پر لوگوں میں ہلچل مچ گئی۔ ایک دوسرے کے پاس جاکر چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ آخر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا "کیا آپ نے رسول خداؐ کی معیت میں یہاں دو رکعتیں ادا نہیں کیں؟" حضرت عثمانؓ نے جواب دیا "ہاں" حضرت عبدالرحمٰن نے کہا "کیا آپ نے حضرات ابوبکرؓ اور عمرؓ کے ساتھ یہاں دو رکعتیں ادا نہیں کیں؟ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا" ہاں" حضرت عبدالرحمٰنؓ نے کہا "کیا خود آپ یہاں لوگوں کو دو رکعتیں نہیں پڑھاتے رہے؟" حضرت عثمانؓ نے جواب دیا" ہاں" حضرت عبدالرحمٰنؓ نے کہا "تو پھر آپ نے یہ نیا اصول کیا وضع کر لیا ہے"؟ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا "مجھے یہ اطلاع ملی تھی کہ بدوؤں اور یمنی جاہل دیہاتیوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ مقیم کی نماز بھی دو ہی رکعتیں ہیں۔ اس لئے کہ مکہ میں (شادی کر لینے کی وجہ سے) میرا گھر بن گیا ہے۔ اور طائف میں میری جائداد ہے۔ جہاں ممکن ہے میں حج سے فارغ ہو چکنے کے بعد پہنچوں۔ لہٰذا، مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ لوگ سچ مچ یہی نہ سمجھ بیٹھیں کہ مقیم کی نماز دو ہی رکعتیں ہیں۔ حضرت عبدالرحمٰن نے کہا۔ ان جاہل دیہاتی گنواروں سے آپ کا اس قسم کا اندیشہ کیا معنے رکھتا ہے۔ جب کہ خود رسولِ خداؐ نے یہاں اس وقت دو رکعتیں ادا فرمائیں جب کہ اسلام پوری طرح پھیلا بھی نہ تھا۔ اور اب جب کہ اسلام کا ڈنکا بج رہا ہے آپ کو اس قسم کے خطرہ کا لحاظ نہیں کرنا چاہیئے۔ رہا یہ کہ آپ نے مکہ میں شادی کر لی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ کی بیوی تو مدینہ شریف میں رہتی ہیں۔ آپ چاہیں تو انھیں ہمراہ لائیں یا مدینہ چھوڑ آئیں۔ اسی طرح یہ بات کہ طائف میں آپ کی جائداد ہے اس مسئلہ پر اثر انداز نہیں ہوتی کیونکہ طائف اور منا میں تین راتوں کی مسافت ہے۔ حضرت عثمانؓ نے کہا۔ یہ تو محض میرا ایک ذاتی اجتہاد تھا جسے میں نے صحیح خیال کیا تھا"

راویوں کا بیان ہے کہ یہاں سے واپسی پر حضرت عبدالرحمٰنؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ملاقات کی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا "آپ نے حضرت عثمانؓ کا اس مقام پر چار رکعتیں پڑھنا ملاحظہ فرمایا، حالانکہ نبی اکرمؐ اور حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ نیز خود حضرت عثمانؓ پچھلے سالوں میں یہاں دو دو رکعتیں پڑھتے رہے ہیں۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود میں نے تفرقہ کے خوف سے اپنے دوسرے ساتھیوں کو چار رکعتیں ہی پڑھائیں، حضرت عبدالرحمٰنؓ نے کہا کہ مجھے بھی یہ سب کچھ معلوم تھا مگر میں نے اپنے ساتھیوں کو دو رکعتیں پڑھائیں۔ لیکن اب میں بھی وہی کچھ کروں گا جو آپ کہہ رہے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بڑے جلیل القدر صحابۂ رسول نے حضرت عثمانؓ کے منیٰ میں نماز کی پوری رکعتیں ادا کرنے کو قابلِ اعتراض سمجھا اور اس ضمن میں حضرت عثمانؓ کے ساتھ بحث بھی کی لیکن جب دیکھا کہ وہ اپنی رائے بدلنے کو تیار نہیں تو انھوں نے انہی کی روش اختیار کرلی تاکہ اُمت میں اختلاف رونما نہ ہو۔

ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اصحاب رسولؐ نے حضرت عثمانؓ کے منیٰ میں پوری نماز پڑھنے پر جو اعتراضات اٹھائے تھے ان کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہ عمل سنت معروفہ کے خلاف تھا۔ دوسری وجہ اس سے بھی زیادہ اہم تھی جس نے مہاجرین کے دل میں شدید تشویش پیدا کردی تھی اور وہ یہ کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد اپنے اور اپنے اصحاب رضوان اللہ علیہم کے لیئے مدینہ کو دارالاقامت قرار دے دیا تھا۔ اور مکہ و مضافات مکہ کو پردیس قرار دے دیا تھا، آپ اپنے لیے یا اپنے صحابہ کے لیئے وہاں طویل اقامت بھی ناپسند فرماتے تھے، تاکہ انھیں وہاں واپس آنے یا اس قسم کا خیال پیدا ہونے کا بھی گمان نہ ہوسکے آپؐ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ آپ کے اصحابؓ میں سے کسی کو مکہ میں موت آئے آپؐ اس اندیشہ کا اظہار فرماتے تھے۔ اور خدا سے دعا کرتے تھے کہ انھیں اس سرزمین میں موت نہ دے جہاں سے وہ ہجرت کرچکے ہیں حضرت سعد بن ابی وقاص جب مکہ میں بیمار ہوگئے تو آپ نے جس آدمی کو ان کی نگہداشت کے لئے چھوڑا اسے یہ تلقین کی کہ اگر سعدؓ فوت ہوجائیں تو انھیں مکہ میں دفن کرنے کی بجائے مدینہ کی راہ میں دفن کرنا۔ لہٰذا جب حضرت عثمانؓ نے منیٰ میں پوری رکعتیں پڑھیں (صلوٰۃ مقیم) تو مہاجرین و انصار نے ان تمام امور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خطرہ محسوس کیا کہ کہیں حضرت عثمانؓ رسول اکرمؐ اور آپ کے صحابہ کرامؓ کی سنت (یعنی مکہ کو وطن نہیں بلکہ پردیس تصور کرنا) تبدیل نہ کردیں، لیکن ان ساری باتوں کے باوجود سب نے حضرت عثمانؓ کے طریقہ پر عمل کیا اور منیٰ میں حضرت عثمانؓ کی اقتدا کرتے ہوئے بجائے قصر کے پوری نماز ہی ادا کی تاکہ نماز سے متعلق مسلمانوں میں افتراق پیدا نہ ہوجائے۔ کیونکہ نماز ارکانِ اسلام میں ایک اہم رکن ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عثمانؓ نے مسلمانوں کی بہتری کی خاطر اجتہاد کیا تھا۔ انھیں یہ خوف لاحق ہوا تھا کہ قوم کا جاہل اور دیہاتی طبقہ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوجائے۔ ان کا اجتہاد غلط ہو یا صحیح بہر حال ان کے مدِ نظر بہتری ہی تھی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ مدینہ چھوڑ کر مکہ یا کسی اور مقام پر سکونت پذیر نہ ہوئے۔ بلکہ جب فتنہ شدید ہوگیا اور یہ پیشکش کی گئی کہ آپ مکہ میں مقیم ہوجائیں یہاں امن میں رہیں گے اور کسی مسلمان کو جرأت نہ ہوگی کہ کسی طرح بھی آپ کو تکلیف دے سکے تو بھی حضرت عثمانؓ نے یہ پیش کش قبول نہ کی کیونکہ وہ جوارِ رسول کو کسی چیز کے بدلے بھی نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو مکہ میں پناہ گزین ہوسکتے تھے حتّٰی کہ

لہ: قصر صلوٰۃ کی اجازت پردیس سے نہیں بلکہ حملۂ کفار کے خوف سے مشروط ہے۔ (م)

امداد پہنچ جاتی۔ اس میں کوئی حرج بھی نہ تھا کیونکہ پناہ کی ضرورت ناگزیر تھی۔ اگر وہ چاہتے تو شام کی طرف چلے جاتے جیساکہ امیر معاویہؓ نے دعوت دی تھی مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ مکہ کو دارِ اقامت نہیں بنانا چاہتے تھے۔ ان کے مدِنظر محض مسلمانوں کی بہبودی تھی۔ مسلمانوں نے بھی ان کی یہ بات تسلیم کر لی تھی۔ چنانچہ وہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ پوری رکعتیں پڑھتے رہے حالانکہ وہ اہتمامِ صلوٰۃ کے سلسلہ میں حضرت عثمانؓ کی پیش کردہ دلیل سے بالکل متفق نہ تھے۔

حضرت عثمانؓ کے مخالفوں نے ایک اور بات پر بھی اعتراض کیا جس کا تعلق بھی ارکانِ اسلام کے ایک رکن سے تھا۔ وہ کہنے لگے کہ حضرت عثمانؓ نے گھوڑوں پر زکوٰۃ لینا شروع کر دی ہے حالانکہ نبی اکرمؐ نے گھوڑوں اور غلاموں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا تھا۔ حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کا بھی یہی طرزِ عمل رہا مگر جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے گھوڑوں پر بھی زکوٰۃ عائد کر دی۔

اس ضمن میں سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ روایت متواتر نہیں، نہ جملہ راویوں کا اس پر اتفاق ہے، دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے زکوٰۃ میں کچھ بڑھایا تھا کم نہ کیا تھا۔ گمانِ اغلب یہ ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے دونوں خلفاء نے گھوڑوں کی قلّت کی وجہ سے نیز ان کی فوجی ضرورت کو مدِنظر رکھتے ہوئے انھیں زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا تھا کیونکہ اس وقت مسلمان حتی المقدور لشکر اور رسالے تیار کرنے میں لگے ہوئے تھے تاکہ اس کے ذریعہ خدا کے اور اپنے دشمنوں کو مرعوب کر سکیں، لیکن جب اسلام کو فتح نصیب ہوئی اور مال و دولت کی فراوانی ہو گئی تو مسلمان ملکِ عرب میں گھوڑوں کو تجارت و نفع کے لئے رکھنے لگے۔ لہٰذا حضرت عثمانؓ نے ان کے بارے میں وہی حکمِ الٰہی نافذ کر دیا جس کا اطلاق اس نفع بخش مال پر ہوتا ہے جو بغرضِ تجارت و ثروت رکھا جائے۔

ایک اور اعتراض بھی مسلمانوں کی طرف سے حضرت عثمانؓ پر ہوا۔ اور وہ یہ کہ انھوں نے چراگاہ کو مخصوص کر لیا تھا۔ حالانکہ خدا اور رسول کی جانب سے ہوا پانی اور گھاس سب کے لئے مباح تھا۔ راویوں نے اس کی تفصیلات میں اختلاف کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ انھوں نے چراگاہ کو صدقہ کے اونٹوں کی خاطر اور اپنے اونٹ گھوڑوں اور بنی اُمیہ کے اُونٹ گھوڑوں کے لئے مخصوص کر لیا تھا دوسروں کا اور خود حضرت عثمانؓ کا قول یہ ہے کہ انھوں نے چراگاہ کو محض صدقہ کے اونٹوں کی خاطر مخصوص کیا تھا۔ لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے حضرت عثمانؓ کے اس عمل پر بھی لے دے کی کہ انھوں نے چراگاہ کو صدقہ کے اُونٹوں کی خاطر کیوں مخصوص کر لیا ہے۔ جس کے جواب میں انھوں نے

یہ دلیل پیش کی کہ ان کا مقصد اس سے صرف یہ تھا کہ عوام اور حکومت کے مابین جانوروں کے چرانے پر جھگڑوں کو روکا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جھگڑے سے بچنا چاہتے تھے اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں لیکن اس کے باوجود جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمان بے چین اور کبیدہ خاطر ہو رہے ہیں تو انھوں نے کوئی سختی نہ کی بلکہ چراگاہ کو واگزار کر دیا اور خدا سے طالب مغفرت ہوئے لہٰذا، اس ضمن میں بھی ان پر کوئی حرف نہیں آتا۔

چونکہ زکوٰۃ اور شترانِ صدقہ کی بحث جاری ہے لہٰذا، مناسب ہے کہ اس ضمن میں ہم ایک اور اعتراض کا ذکر بھی کر دیں جو مخالفین حضرت عثمانؓ ان پر وارد کرتے تھے۔ اور وہ اعتراض یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ اموالِ صدقہ کو معاملات جنگ اور دوسرے رفاہِ عامہ کے امور میں خرچ کر دیتے تھے۔ معترضین نے اس پر یہ کہا کہ اموالِ صدقہ کے لئے معین مصارف ہیں جن کی خدا نے اس آیت میں وضاحت کر دی ہے:۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ٥ (۹/۶۰)

صدقات فقراء و مساکین۔ اور صدقات فراہم کرنے والوں کے لئے ہیں نیز ان کے لئے جن کی تالیف قلوب مطلوب ہو اور جو بند غلامی میں مقید ہیں۔ قرض دار ہوں۔ نیز راہِ خدا میں اور مسافر کے لئے یہ خدا کی طرف سے فرض ہے اور اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ (۹/۶۰)

اللہ تعالیٰ نے آیتِ مذکورہ کے ابتدائی حصہ میں اِنَّمَا کے ذریعہ ان مصارف کا حصر کر کے پھر آخر میں "فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ" کے ذریعہ مال صدقہ کے مصارف کو بالکل واضح طور پر محدود کر دیا ہے۔ لہٰذا، امام کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اموالِ صدقہ کو ان مصارف کے سوا جن کی خدائے عزوجل نے اس آیت میں وضاحت کر دی ہے کسی اور مصرف میں لائے۔

اس اعتراض کا جواب اہلِ سنت اور معتزلہ متکلمین نے یہ دیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے یہ سب کچھ اس وقت کیا جب انھیں مال صدقہ میں فراوانی نظر آئی اور جب انھیں جنگ میں زیادہ صرف کرنے کی شدید ضرورت درپیش ہوئی چنانچہ انھوں نے اموالِ صدقہ میں سے بطور قرض اخراجات جنگ کے لئے رقم لے لی۔ وہ بھی اس ارادہ سے کہ جب رقم زیادہ آ جائے گی تو یہ قرض اتار دیا جائے گا۔ امام کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ایک مد سے دوسرے مصرف کے لئے رقم قرض لے لے۔ اور جب تک یہ مصمم ارادہ ہو کہ اموالِ صدقہ کی رقم لوٹا دی جائے گی اس وقت تک ایسا کرنا نہ مخالفت دینی ہے اور نہ سنتِ موروثہ میں تبدیلی۔ ہم کہتے ہیں کہ دینی اعتبار سے متکلمین کا جواب صحیح ہے لیکن خرابی تو یہیں سے پیدا ہوتی

ہے۔ جب امام ایک مصرف سے دوسرے مصرف کے لئے قرض لیتا ہے، اس سے تو امام کی مالی دوں تدبیری پر دلالت ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنگ اور دیگر امور کے اخراجات میں اسراف اور بے پروائی برتی جارہی تھی۔ نیز یہ کہ بخشش کے طور پر یہ روپیہ غیر مستحق لوگوں پر صرف کیا جارہا تھا، ہم اس موضوع پر قریب ہی کسی جگہ بحث کریں گے۔

حضرت عثمانؓ کے مخالفین ان پر ایک یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ انھوں نے لوگوں کو ایک صحیفۂ قرآنی کا پابند کر دیا تھا۔ دوسرے صحیفوں کے نہ صرف پڑھنے ہی سے روکا بلکہ ان کا وجود ہی سرے سے ختم کر دیا وہ یوں کہ اس صحیفہ کے علاوہ تمام اُن صحیفوں کو جلا دیا جن میں قرآن لکھا ہوا تھا۔ معترضین نے حضرت عثمانؓ کے خلاف یہ آواز اٹھائی کہ رسولِ خدا نے فرمایا تھا کہ

نَزَلَ الْقُرْآنُ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ کُلُّهَا کَافٍ شَافٍ

یعنی خدا نے قرآن کو سات احرف میں نازل فرمایا اور ان میں سے ہر ایک کافی و شافی ہے"۔ لہٰذا جب حضرت عثمانؓ نے ان صحیفوں کی قرأت سے روکا یا انھیں جلایا تو گویا انھوں نے ان منزل من اللہ نصوص کی قرأت سے روکا جنھیں خدا نے نازل کیا تھا اور ان صحیفوں کو جلایا جو اس قرآن پر مشتمل تھے جسے مسلمانوں نے رسولِ خدا سے سنا اور حاصل کیا تھا۔ حالانکہ امام کو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ قرآن کے کسی حرف کو محو کرتا یا اس کی کسی آیت کو جلاتا۔ لیکن مسلمانوں کو ایک صحیفہ پر کاربند کرنے کا معاملہ اتنا آسان نہیں تھا جتنا کہ حضرت عثمانؓ کے مخالفین اور حمایتی حضرات تصور کرتے ہیں۔ رسولِ خدا کی طرف سے اس مضمون کی متعدد روایات نقل کی جاتی ہیں کہ انھوںؐ نے فرمایا (نَزَلَ الْقُرْآنُ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ) لیکن مسلمان اب تک اس حدیث کی مختلف تاویلیں کرتے رہے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ سات عبارتوں سے مفہوم سات مضمون ہیں جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں یعنی وعد وعید۔ امر و نہی۔ وعظ و قصص وغیرہ۔ دوسرا گروہ "احرف" کی تفسیر میں متصوفین کی روش اختیار کرتا ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ سات "احرف" سے مراد عربوں کی مختلف بولیوں کے لحاظ سے الفاظ کا اختلاف بہر حال مسلمان صحیح معنوں میں اس حدیث کی تفسیر پر آج تک متفق نہیں ہو سکے۔ لہٰذا جب تک کہ مخالفین و موافقین عثمانؓ اس حدیث کے معانی پر باہم متفق نہ ہو جائیں حضرت عثمانؓ کے خلاف یہ الزام درست نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے اس حدیث کی مخالفت کی۔ روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں میں قرأت قرآن کے متعلق خود عہد نبوی ہی میں اختلاف تھا۔ اور یہ اختلاف لہجوں کا نہ تھا بلکہ اس کا تعلق ایسے مختلف الفاظ سے تھا جن کے معانی مشترک ہوتے تھے۔ اختلاف کرنے والے اپنا جھگڑا خود رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فیصلہ کے لئے لے گئے۔ چنانچہ آپؐ نے ان سب کی قرأتوں کو جائز قرار دے دیا۔ کیونکہ ان میں معانی کا کوئی اختلاف نہ تھا۔ اختلاف

جو کچھ تھا وہ الفاظ میں تھا[1]۔

قرآن مجید حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے عہد میں جمع کیا گیا[2] حضرت عثمانؓ کے پاس یہ شکایت پہنچی کہ مرد سا اور سرحدی علاقوں میں مسلمان قرأت قرآن کے مسئلہ پر مختلف ہو کر جھگڑنے لگ جاتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کوئی شخص یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ میرا قرآن دوسروں کے قرآن پر فضیلت رکھتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے عنقریب ان میں تفرقہ پڑ جائے حتّٰی کہ ایک روز حضرت حذیفہ بن الیمانؓ حضرت عثمانؓ سے یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "امت محمدیہ کو قرآن کے مسئلہ پر افتراق پذیر ہونے سے پہلے پہلے سنبھال لیجئے"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عثمانؓ کا مرکز سے قرآن کا ایک ایک نسخہ بھیج کر اس اختلاف کا قلع قمع کر دینا اور قرأت قرآن میں مسلمانوں کو ایک عبارت یا ایک لہجہ کا پابند کر دینا بہت بڑا جرأت مندانہ اقدام تھا، لیکن اس میں جرأت مندی سے زیادہ مسلمانوں کی بہتری کارفرما تھی، اگر حضرت عثمانؓ مسلمانوں کو مختلف بولیوں اور لہجوں کے اعتبار سے متعدد قرأتوں اور متباین لفظوں میں قرآن پڑھتے رہنے دیتے تو یقیناً یہ امر افتراق امت کا باعث بن جاتا۔ اور پھر یہ یقینی امر تھا کہ فتوحاتِ اسلامیہ اور عجمیوں کے عربی قومیت اختیار کر لینے اور بدوؤں کے قرآن خواں ہونے کے بعد یہ لفظی اختلاف بڑھ کر معنوی اختلاف کی صورت اختیار کر کے اور بھی زیادہ خطرناک شکل میں باعثِ افتراق و تشتت ہو جاتا۔

یہی وجہ ہے کہ اہلِ سنت اور معتزلہ نے حضرت عثمانؓ کی کارکردگی کی بلا تردد تائید کی اور ان کے اس احسانِ عظیم کا اعتراف کیا جس کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں کو افتراق سے بچا لیا اور انھیں ایک ایسی چیز پر متحد کر دیا کہ جس میں کوئی اختلاف نہ ہونا چاہیئے تھا۔ تاریخ ہمیں نہیں بتاتی کہ حضرت علیؓ نے یا اصحابِ شوریٰ میں سے کسی نے بھی حضرت عثمانؓ کی اس کارروائی کو ناپسند کیا ہو۔ بلکہ حضرت علیؓ سے ایک روایت اس طرح ہے کہ انھوں نے اپنی خلافت کے دوران میں فرمایا اگر میں حضرت عثمانؓ کی جگہ ہوتا تو قرآن کے معاملے میں لوگوں کو اسی بات پر کاربند کرتا جس پر حضرت عثمان نے کیا"۔

لہٰذا، دینی نقطہ نظر سے اس میں بھی حضرت عثمانؓ پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ انھوں نے کتابت مصحف کا کام اصحاب رسولؐ میں سے صرف چند افراد کے سپرد کر کے ایسے بہت سے قاریوں کو نظر انداز کیوں کر دیا جنھوں نے

---

[1] یہ روایت کبھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ قرآن اپنے الفاظ میں قرآن ہے۔ اگر الفاظ کا اختلاف تسلیم کر لیا جائے تو قرآن واحد کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔

[2] یہ صحیح نہیں۔ قرآن خود رسولؐ اللہ نے جمع اور مرتب شکل میں اُمت کو دیا تھا جو آج تک اسی شکل میں محفوظ چلا آرہا ہے۔

قرآن کریم نبیؐ اکرمؐ سے سن کر حفظ کیا تھا اور جو ممالک محروسہ میں پڑھاتے رہے تھے۔ مناسب یہ تھا کہ ان سب کو دعوت دے کر جمع کرکے کتابت مصحف کا کام ان کے سپرد کیا جاتا۔ اندریں شکل ہم عبداللہ بن مسعودؓ کے غصہ کا سبب بھی سمجھ سکتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ قرآن کے جید ترین حافظ تھے اور جیسا کہ وہ خود کہا کرتے تھے انھوں نے قرآن کی ستر سورتیں خود رسولِ خدا کے دہن مبارک سے اخذ کیں اور اس وقت حضرت زید بن ثابتؓ سن بلوغ کو بھی نہ پہنچے تھے۔ اس کے باوجود حضرت عثمانؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ اور ان کے ساتھیوں کو ترجیح دی اور حضرت ابن مسعودؓ اور ان کے ساتھیوں کو جنھیں رسولِ خدا سے قرآن سُننے اور حفظ کرنے میں سبقت حاصل تھی نظر انداز کر دیا۔ اس ترجیح کی وجہ سے اُن پر کچھ اعتراض ضرور وارد ہوا۔ لیکن یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں جس کا سمجھ لینا مشکل اور دقت طلب ہو۔

ہوسکتا ہے کہ بعض مسلمانوں کو حضرت عثمان کا صحیفے جلا کر تلف کر دینے کا حکم ناگوار گزرا ہو اور انھوں نے حضرت عثمانؓ کا یہ عذر کہ ایسا فتنہ کی بیخ کنی اور اختلاف کے سدِ باب کے لئے کیا گیا ہے قبول نہ کیا ہو۔ اگر مسلمانوں میں تمدن معتدبہ حد تک ترقی کر گیا ہوتا تو ممکن تھا کہ حضرت عثمانؓ ان نذرِ آتش کئے جانے والے صحیفوں کو بہ حفاظت رکھ چھوڑتے اور انھیں محفوظ دستاویزات کی حیثیت سے نہ صرف عوام بلکہ خواص سے بھی بچا کر صرف ضائع نہ ہو جانے کے خیال سے محفوظ کر لیتے۔ لیکن مسلمان اس زمانے میں اتنے متمدن نہ تھے کہ انھیں کتب خانوں کی تنظیم اور مخطوطات کی حفاظت کا شعور ہوتا۔ بہرحال حضرت عثمانؓ کی اس کارکردگی پر نہ دینی اعتبار سے گرفت ہوسکتی ہے نہ سیاسی اعتبار سے۔ البتہ ہمیں ان صحیفوں کے نذرِ آتش ہونے کا غم ضرور ہونا چاہیئے اس لئے کہ گو حضرت عثمانؓ نے مسلمانوں کو کسی دینی مواد سے محروم نہیں کیا پھر بھی انھوں نے تحقیق اور ریسرچ کرنے والے علماء کو اس عظیم مواد سے محروم کر دیا جو قدیم عربی بولیوں اور ان کے مختلف لہجوں سے واقفیت کے لئے قیمتی سرمایہ بنتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ کی سنگینی و اہمیت عربی بولیوں اور لہجوں پر ریسرچ اور تحقیقات کرنے والے علماء کی بحث و تحقیق سے بہت بلند و بالا تر تھی۔

معترضین نے حضرت عثمانؓ کی ایک اور کارکردگی کو بھی ناپسند کرتے ہوئے اس پر اعتراض کیا، اور ہمارا خیال ہے کہ اس اعتراض کا ان کی طرف سے کوئی معقول جواب نہیں دیا جاسکتا۔ وہ اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے اپنے چچا حکم بن ابی العاص اور ان کے خاندان کو مدینہ کیوں واپس بلا لیا جبکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بڑی سختی کے ساتھ مدینہ سے نکال دیا تھا۔ عہدِ جاہلیت میں حکم بن ابی العاص کا گھر رسولؐ خدا کے گھر سے ملا ہوا تھا اور حکم اپنے کریم الخصلت ہمسائے کو شدید ترین اور قبیح ترین ایذا پہنچایا کرتا تھا۔ حکم بن ابی العاص وہی شخص ہے جس نے خود حضرت عثمانؓ کی ایمان لانے کی وجہ سے مشکیں کس دی تھیں اور یہ قسم کھالی تھی کہ جب تک وہ اپنے آبائی دین کی طرف نہ لوٹ آئیں گے انہیں نہیں چھوڑے گا۔

اور پھر نہیں اس وقت چھوڑا جب ان کی طرف سے پوری طرح مایوس ہو گیا۔ فتح مکہ کے بعد حکم مسلمان ہو کر مدینہ چلا آیا لیکن اس کا اسلام محض موت سے بچنے کا ایک حیلہ تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ رسولِ خدا کو اپنے قول و فعل سے بدستور ایذا پہنچاتا رہا۔ وہ آپؐ کے پیچھے پیچھے رہتا تھا آنکھیں مچکاتا اور آپؐ کی حرکات کی نقل اتار اتار کے آپ کا تمسخر اڑاتا تھا۔ ایک روز یہ بلا اجازت اچانک آپؐ کے کسی حجرے میں داخل ہو گیا۔ آپؐ غصے میں باہر نکلے جب آپؐ نے اسے پہچانا تو فرمایا "کوئی ہے جو مجھے اس بھیڑیے سے نجات دلائے؟" ازاں بعد آپ نے اسے مدینہ شریف سے نکال دیا اور فرمایا "اس شہر میں کبھی بھی یہ میرے ساتھ سکونت نہیں کرے گا۔" حضرت عثمانؓ نے رسولِ خدا سے اس کی واپسی کے بارے میں سفارش کی لیکن آپؐ نے اسے واپس نہ آنے دیا۔ پھر حضرت عثمانؓ نے یہی درخواست حضرت ابوبکرؓ کے سامنے پیش کی۔ انھوں نے بھی انکار کر دیا۔ پھر حضرت عثمانؓ نے یہی درخواست حضرت عمرؓ سے کی انہوں نے نہ صرف انکار کیا بلکہ حضرت عثمانؓ کو ڈانٹتے ہوئے آئندہ بھی حکم کے معاملہ میں گفت و شنید سے منع کر دیا، لیکن جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے حکم کو مدینہ واپس بلا لیا۔ اس بات پر مسلمانوں نے اعتراض کیا۔ بڑے جلیل القدر صحابہ رضوان اللہ علیہم حضرت عثمانؓ کے پاس گئے اور انہیں اس عمل پر سرزنش کی، حضرت عثمانؓ نے اُن سے کہا کہ جب میں نے حضورِ اکرمؐ سے حکم کی واپسی کے لئے کہا تھا تو آپؐ نے اس سلسلہ میں مجھے بالکل مایوس نہیں کیا تھا، اور واپسی کا حکم جاری کرنے سے پہلے ہی آپؐ فوت ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ کی طرف سے عذر پیش کرنے والے اہلِ سنت و معتزلہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے خیال میں حضورِ اکرمؐ کا حکم اور اس کے خاندان کو مدینہ سے نکال دینا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کوئی قطعی حکم نہ تھا۔ کیونکہ جلاوطن شخص کا اپنی اصلاح کر لینا ممکن ہے اور ایسی صورت میں اسے معاف کر کے وطن میں واپس آنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے علم میں یہ تھا کہ رسولِ خدا حکم کی واپسی پر رضامند تھے۔ لیکن حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت عثمانؓ کی اس بات کو تسلیم نہ کیا کیونکہ اس بات کا علم تنہا حضرت عثمانؓ کو تھا لہٰذا، صرف ان کی شہادت کافی نہ تھی۔ لیکن جب وہ خلیفہ ہو گئے تو انھوں نے اپنے علم کے مطابق فیصلہ صادر کر دیا اور امام کو اپنے علم کے مطابق فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔

دوسری طرف حضرت عثمانؓ کے مخالفین یہ کہتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت اور زمانۂ اسلام لانے کے بعد حکم کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طرزِ عمل پھر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان "کہ کوئی ہے جو مجھے اس بھیڑیے سے نجات دلائے۔" اور اسی طرح آپؐ کا یہ قول کہ "مدینے میں کبھی بھی یہ میرے ساتھ سکونت نہیں کرے گا" وہ امور ہیں جو حضرت عثمانؓ کو حکم کے واپس بلانے سے روکتے ہیں، اور امام کے لئے یہ زیبا نہ تھا کہ محض اپنے علم کے مطابق فیصلہ کر دیتا۔ بالخصوص جبکہ لوگوں کو اس فیصلہ کی وجہ سے امام پر کنبہ پروری کا شبہ بھی ہو سکتا تھا، اس لئے کہ حکم حضرت عثمانؓ کا چچا تھا۔ صرف اسی ایک شبہ کا احتمال ہی اتنا وزن رکھتا تھا کہ حضرت عثمانؓ حکم کو مدینہ واپس بلانے سے رک جاتے اور جب اس کے ساتھ

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا بھی اضافہ کر دیا جائے کہ "وہ مدینہ میں کبھی میرے ساتھ سکونت نہیں کرے گا" تو آپؐ کی حرمت کا کم از کم تقاضا یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ حکم کو جسے رسولِ اکرمؐ نے تادمِ آخر مدینہ میں اپنے سکونت پذیر نہ ہونے دیا تھا آپؐ کی وفات کے بعد وہ اسے مدینہ میں لاکر آپ کے ساتھ نہ بساتے۔

بعد میں حکم اور اس کے بیٹوں کے ساتھ حضرت عثمانؓ کے طرزِ عمل نے یہ بتا دیا کہ انھوں نے حکم کے خاندان کی سرپرستی کرنے نیز مالی اور سیاسی امور میں ان کی مدد لینے کے لئے انھیں واپس بلایا تھا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے حکم کو بہت سی دولت عطا کی اور جب حکم مرا تو انہوں نے اس کی قبر پر شامیانہ لگایا۔ انہوں نے حکم کے بیٹے حارث کو شہر مدینہ کی منڈی کا نگران مقرر کیا۔ لیکن اُس نے لوگوں پر بھی زیادتی کی اور خود اپنے آپ پر بھی۔ اس کا طرزِ عمل امانت اور پاکبازی کے بجائے حرص وطمع اور حبِ مال و زر کا آئینہ دار تھا۔

حضرت عثمانؓ نے اسی بات پر بس نہ کیا بلکہ حارث کو بہت سا مال بھی دیا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ پھر حضرت عثمانؓ نے مروان بن حکم پر خصوصی نوازشات کیں۔ اُسے مال دیا، اور مقرب بنا کر اپنا وزیر و مشیر مقرر کر لیا۔ یہ ساری باتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے حکم اور اس کے بیٹوں کو صرف رحم و کرم کی وجہ سے واپس نہیں بلایا تھا بلکہ ان کے بلانے سے مقصد یہ تھا کہ وہ حضرت عثمانؓ کے دست و بازو بن جائیں۔

یہ ہیں مخالفین کی طرف سے حضرت عثمانؓ کے خلاف دینی اعتراضات، آپ نے دیکھا کہ ان میں سے اکثر وہ ہیں جن سے حضرت عثمانؓ کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں حکم اور اس کے بیٹوں کا معاملہ ایسا ہے کہ اس میں حضرت عثمانؓ کی مدافعت مشکل ہے۔ لیکن یہ بھی بہر حال اُن امور میں سے نہیں جو حضرت عثمانؓ کے دین پر ضرب لگائیں ویسے اگر انھوں نے کبھی کسی سُنت کی مخالفت کی تو وہ اجتہادی تاویل کی بنا پر تھی خواہ وہ تاویل صحیح ہو یا غلط۔ مگر انھوں نے دین کے کسی اصل اصول یا کسی رکنِ رکین کو منہدم نہیں کیا۔ ان سب باتوں سے قطع نظر یہ بھی نگاہ میں رہے کہ حضرت عثمانؓ بھی آخر انسان ہی تھے۔ اُن کی رائے غلط بھی ہو سکتی تھی اور درست بھی۔ یہ بھی مدنظر رہے کہ ہر امام خواہ وہ لوگوں کے ساتھ اس بات کا پیمان کر بھی لے کہ اس کا طرزِ عمل وہی ہو گا جو حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا تھا۔ ان دونوں بزرگوں کی روش پر چلنے کی قدرت نہیں رکھ سکتا۔

ہمیں یقین ہے کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراضات اسی حد تک محدود رہتے تو مسلمان بھی نصیحت و خیر خواہی اور شدید تنقید کی حد سے آگے نہ بڑھتے اور ان کی روش کے نتائج و عواقب کو ان پر ڈالتے ہوئے ان کا محاسبہ خدا کے سپرد کر دیتے کہ وہ جس طرح چاہے سختی یا نرمی سے ان کا محاسبہ کرلے۔

لیکن حضرت عثمانؓ کے معاملات اس حد تک محدود نہ رہے بلکہ ان سے اور ان کے عمال سے ایسے افعال سرزد ہوئے جن کا تعلق لوگوں کے حقوق و مصالح اور ان کی آزادی سے تھا اور یہی وہ معاملات ہیں جو (بدقسمتی سے) ایک بہت بڑے فتنہ و فساد کا باعث بنے۔

چوبیسواں باب

حضرت عثمانؓ کے خلاف نظم و نسق حکومت سے متعلق اعتراضات

حکومت کے عہدوں پر تقرری و معزولی کا مسئلہ مسلمانوں کو حضرت عثمانؓ کی انتظامی حکمت عملی اور تقرری و معزولی کی روش سے اختلاف تھا۔ وہ کہتے تھے کہ حضرت عثمانؓ نے مسلمانوں کے معاملات ایسے نوجوانوں کے سپرد کر دیئے ہیں جو نہ ان کے سنبھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں نہ مقدرت۔ جنہیں نہ دین کی بھلائی مطلوب ہے نہ خدا اور اس کے رسولؐ کے ساتھ محبت۔ انہیں یہ بھی اعتراض تھا کہ حضرت عثمانؓ نے ممالک محروسہ کی عملداری سے اصحاب رسولؐ کو معزول کر دیا ہے اور حضرت عمرؓ کی وصیت کو پس پشت ڈال کر بنی ابی معیط اور بنی امیہ کو لوگوں کی گردنوں پر سوار کر دیا ہے۔ اس ضمن میں لوگوں نے ان کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا لیکن ان کی شنوائی نہ ہوئی تا آنکہ حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ عمال سے فسق و فجور اور راہ حق سے انحراف کا علانیہ ارتکاب ہونے لگا[1]، اور بالآخر جسے بھی انہوں نے معزول کیا اس کو بالکل آخری مجبوری کی شکل پیدا ہونے پر معزول کیا۔

حضرت عثمانؓ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی جگہ ولید کو کوفہ کی حکومت پر متعین کیا۔ عبداللہ بن عامر کو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی جگہ مقرر کیا اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو حضرت عمرو بن العاصؓ کا جانشین بنایا۔ اور سارا شام تنہا حضرت معاویہؓ کے حوالہ کر دیا۔

ان تمام امور کے متعلق اپنی رائے کا ہم پہلے ہی اظہار کر چکے ہیں۔ ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کی مدافعت کرنے والے سنی و معتزلہ حضرت عثمانؓ کی مدافعت میں دور از کار تاویلیں کرتے ہیں جس طرح ان کے مخالفین انہیں بدنام کرنے

---

[1] کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ صدر اوّل کے مؤمنین کی یہ حالت ہو گئی تھی ؟

کے لئے مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت عثمانؓ کی مدافعت کرنے والوں کا یہ قول کہ حضرت عثمانؓ ان اعمال کی تقرری کے وقت معذور تھے کیونکہ ان کے باطنی احوال پوشیدہ تھے۔ اور ان کا ظاہر اچھا تھا اس لئے انہیں والی بنا دینے میں کوئی حرج نہ تھا، صحیح نہیں۔ کیونکہ ولید بن عقبہ کا حال عیاں اور معروف تھا، حضرت عثمانؓ کے علم میں تھا کہ اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں اسے فاسق کہہ کر پکارا تھا۔[1] یہ بات بھی سب کو معلوم تھی کہ حضرت عمرؓ نے اسے اصلاح پذیر سمجھتے ہوئے بنی تغلب کی زکوٰۃ وصول کرنے پر متعین کیا تھا لیکن پھر جلد ہی معزول کر دیا کیونکہ انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ ابھی تک جاہلیت کی عادتوں پر قائم ہے۔ حضرت عمرؓ کی اس رائے کا خود ولید کو بھی پوری طرح علم تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ حضرت سعدؓ کی جگہ والی بن کر کوفہ میں داخل ہوا تو حضرت سعدؓ نے اس سے کہا "اے ابو وہب تم زائر کی حیثیت سے آئے ہو یا حاکم کی حیثیت سے" جواباً ولید نے کہا اے ابو اسحاق میں حاکم کی حیثیت سے آیا ہوں" حضرت سعدؓ نے کہا "بخدا میں نہیں جانتا کہ اس درمیانی عمر میں، میں بے وقوف ہو گیا ہوں یا تم عقلمند ہو گئے ہو۔" ولید نے کہا "نہ تم بے وقوف ہو گئے ہو نہ میں عقلمند ہو گیا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت ہماری قوم کے ہاتھ آگئی ہے اور وہ خویش پروری کر رہی ہے۔" حضرت سعدؓ نے کہا "تم بالکل ٹھیک کہتے ہو" معلوم ہوا کہ ولید جانتا تھا کہ اسے کوفہ کا والی اس لئے نہیں بنایا گیا تھا کہ وہ پہلے بُرا تھا اور اب اچھا ہو گیا ہے۔ یا پہلے بدچلن تھا اب نیک چلن ہو گیا ہے بلکہ اسے محض اس وجہ سے والی بنایا گیا تھا کہ حکومت اس کی قوم کے ہاتھ میں تھی اور وہ خویش پروری کر رہی تھی۔ حضرت عثمانؓ کو پوری طرح علم تھا کہ عبداللہ بن عامر ایک نوخیز جوان ہے جس کی عمر ابھی پچیس برس سے بھی متجاوز نہیں ہوئی۔ انھیں یہ بھی علم تھا کہ مہاجرین۔ انصار اور دوسرے عرب قبائل میں ایسے افراد موجود ہیں جو عبداللہ بن عامر سے عمر میں بڑے، تجربے میں فائق، اور ایمان لانے میں اس سے سابق تھے۔ حضرت عثمانؓ کو یہ بھی معلوم تھا کہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے بارے میں خدائے تعالیٰ نے قرآن میں آیات نازل کی ہیں۔ نیز یہ کہ فتح مکہ کے روز رسولِ خداؐ نے اس کا خون مباح کر دیا تھا۔ لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ ان لوگوں کا حال پوشیدہ تھا کم از کم حضرت عثمانؓ کی نگاہوں سے تو قطعاً پوشیدہ نہ تھا۔ پھر اہلِ سنت اور معتزلہ کا یہ قول بھی درست نہیں کہ جس عامل میں بھی حضرت عثمانؓ کو فسق و فساد نظر آتا وہ اسے معزول کر دیتے تھے۔ کیونکہ حضرت عثمانؓ نے ولید کو اس وقت معزول کیا جب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہ رہا تھا، ہم یہ نہیں خیال کرتے کہ حضرت عثمانؓ نے ولید کو شرعی سزا دینے سے پس و پیش کیا ہو گا تاہم یہ بات بخوبی عیاں ہے کہ انھوں نے اُسے معزول اس وقت کیا جب اس کی بدعملی رسوائی کی حد تک عام ہو چکی تھی۔ لوگوں نے اس کی شراب خوری کے متعلق شہادتیں دیں اور اہلِ کوفہ میں اس کے خلاف ہنگامہ بپا ہو گیا، مہاجرین و انصار اس کی معزولی

---

[1] قرآن مجید میں کسی کا نام نہیں لیا گیا۔

پر بند ہو چکے تھے۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ نے ولید کے بعد سعید بن عاص کو خوشی سے معزول نہیں کیا تھا بلکہ اس معزولی پر سخت اظہار ناپسندیدگی کیا تھا لیکن مجبور تھے کیونکہ اہل کوفہ نے سعید کو کوفہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا اور حضرت عثمانؓ کے لئے بغاوت یا حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی تقرری میں سے ایک کا قبول کرنا ناگزیر بنا دیا تھا، حضرت عثمانؓ نے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو بھی بہ طیب خاطر معزول نہیں کیا تھا بلکہ اس لئے معزول کیا تھا کہ مصری انہیں بغاوت کی دھمکی دے رہے تھے۔ مہاجرین و انصار اس کی معزولی پر مصر تھے اور حضرت علیؓ نے عبداللہ کے خلاف قتل کے الزام کی تحقیقات کا مطالبہ کیا تھا، اس وقت حضرت عثمانؓ نے عبداللہ بن سعد کو معزول کیا اور مصر کی حکومت محمد بن ابوبکر کے حوالے کی۔ ان میں سے کسی بات میں بھی کسی شبہ کا احتمال نہیں ہے۔ شبہ تو اس خط سے تعلق رکھتا ہے جو مصریوں کے قتل کے بارے میں بھیجا گیا تھا۔

بہر حال یہ ہرگز صحیح نہیں کہ ان عمال کے حالات پوشیدہ تھے اور نہ یہ صحیح ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ان کی کج روی سے آگاہ ہوتے ہی انہیں بلا حیل و حجت معزول کر دیا تھا۔

یہ بھی واضح ہے کہ مخالفین حضرت عثمانؓ کا یہ کہنا بھی بیجا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے مقرر کئے ہوئے کارندے اور عمال صلاحیت نہیں رکھتے تھے اور امور حکومت سے عہدہ برآ ہونے پر قادر نہ تھے یہ عمال بلاشبہ حکومت کے اہل اور اس کی ذمہ داریوں کے متحمل تھے اور اس بات پر ان کی شاندار فتوحات گواہ ہیں لیکن وہ اہل تھے اس حکومت کے جس کا نظام قوت و شوکت، دبدبہ و غرور اور جبر و استبداد پر قائم ہو۔ ایسی حکومت کے اہل نہ تھے جس کا نظام اسلامی اصولوں یعنی عدل، انصاف، مساوات اور پابندی عہد پر قائم ہو جس کا عہد حضرت عثمانؓ نے قوم سے کیا تھا، یعنی یہ کہ وہ قرآن و سنت اور سیرت ابوبکرؓ و عمرؓ پر قائم رہیں گے اور اس سے کسی قسم کا انحراف نہیں کریں گے۔

بہر حال حضرت عثمانؓ کی وہ حکمت عملی جس پر وہ عمال کی معزولی و تقرری کے ضمن میں کاربند رہے ان کے عہد و پیمان کے موافق نہ تھی۔ لہٰذا کوئی شبہ نہیں کہ جن لوگوں نے ان عمال سے تنگ آکر ان کے خلاف بغاوت کی اور ان کی تقرری کے باعث حضرت عثمانؓ سے بگڑے وہ غلطی پر نہ تھے۔

پچیسواں باب

حضرت عثمانؓ کے عہد میں نظام مالیات

حضرت عثمانؓ کی مالی سیاست جس پر وہ اپنی خلافت کے زمانہ میں کاربند رہے' ان کے بیشتر معاصرین اور اکثر مؤرخین و رواۃ کے لئے ناراضی و خفگی کا موضوع تھی گو بعد میں جاکر یہ مسئلہ متکلمین کے لئے موضوع بحث و تکرار بن گیا۔ معتزلہ اور اہلِ سنت اس سیاست کی حمایت کرتے لگے اور شیعہ و خوارج اس کی مخالفت کرتے رہے۔ ہم حضرت عثمانؓ کی مالی سیاست کے متعلق مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اموالِ عامہ میں حسبِ ضرورت و مصلحت تصرف کو امام کا حق سمجھتے تھے۔ اور چونکہ وہ خلیفہ ہونے کی وجہ سے ہمہ تن مسلمانوں کے کاموں میں منہمک ہو گئے تھے۔ لہٰذا، ان کا خیال تھا کہ جب

مالی سیاست کے متعلق حضرت عثمانؓ کی رائے

تک وہ ان کاموں میں مصروف رہیں انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے مال سے اتنی رقم لے لیا کریں جس سے وہ خود، ان کا خاندان' نیز ان کے اعزّہ و اقرباء اپنی ضروریات بافراغت پوری کر سکیں اور ایسا کرنے میں انہیں کوئی حرج یا خرابی نظر نہ آتی تھی، اس سلسلہ میں ایک چیز جس کی مؤرخین نے پوری طرح وضاحت نہیں کی قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ حضرت عثمانؓ بذاتِ خود خلافت سے پہلے بڑے سخی، فیاض اور مخیّر تھے۔ وہ بڑے صاحبِ مال تھے ان کی تجارت وسیع اور آمدنی کثیر تھی لہٰذا، ان کا مال، انہیں ان کے خاندان اور ان کے اعزّہ و اقرباء کو بافراغت ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کے لئے بالکل کافی تھا۔ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد انہیں تجارت و اکتساب کے لئے وقت نہ مل سکا، لیکن ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ سابقہ معمول کے مطابق خلافت کے بعد بھی اپنے اور اپنے قرابت داروں پر خرچ کرتے رہیں، اس سلسلہ میں بظاہر ان کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ خلافت کو ان کی مالی روش میں کسی قسم کا تغیر و تبدیل کرنے کا حق نہیں۔ لہٰذا، جب ان کے اپنے مال میں کمی واقع ہوئی تھی تو اس کا واحد سبب یہ تھا کہ وہ اموالِ عامہ کے انتظام و اہتمام میں ہمہ تن مصروف ہو کر اپنے مال کا بندوبست نہ کر سکے۔ اور اسے نفع بخش کاموں میں نہ لگا سکے۔

حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ خلیفہ بننے سے قبل حضرت عثمانؓ کی طرح صاحبِ مال نہ تھے۔ ان میں سے کسی کے متعلق ہمیں تاریخ نہیں بتاتی کہ انہوں نے "بئرِ رومہ" خریدا ہو۔ یا مسجد نبوی کی توسیع کے لئے زمین خریدی ہو یا غزوۂ تبوک کے لشکر کے لئے اپنے خرچ سے ساز و سامان فراہم کیا ہو۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ یہ دونوں حضرات بخل کرتے تھے بلکہ اصل سبب یہی تھا کہ وہ زیادہ مالدار نہیں تھے۔ اسی طرح یہ دونوں حضرات خود اپنی ذات پر نیز اپنے خاندان اور اپنے اقربا پر حضرت عثمانؓ کی سی فراخ دستی کے ساتھ خرچ بھی نہ کرتے تھے۔ کیونکہ ان دونوں کی محدود آمدنی انہیں اس کی اجازت ہی نہ دیتی لہٰذا، خلیفہ بننے کے بعد بھی ان دونوں کی روش میں کوئی فرق نہ آیا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ ظلم اور گناہ سے بچنے کے لئے انہوں نے اپنے حق میں مال و دولت سے اجتناب و احتیاط میں تشدد اختیار کر لیا تھا۔ لیکن حضرت عثمانؓ خلیفہ ہونے کے بعد بھی اپنی سابقہ روش پر قائم رہے۔ اس لئے اغلب یہی ہے کہ ان کی دولت ان کے اخراجات کو پورا نہ کر سکی۔ چنانچہ انھوں نے اموالِ عامہ میں سے اتنا روپیہ لے لینا اپنے لئے جائز سمجھا جتنا کہ وہ اپنی دولت کو نفع بخش کاموں میں لگا کر اس سے حاصل کر سکتے تھے۔ ابتداءً ان کی کیفیت یہی تھی لیکن پھر جلد ہی وہ اور کھل کر خرچ کرنے لگے بعد ازاں تسلط و اختیار نے ان کے لئے جود و سخا کی مزید راہیں کھول دیں۔ حضرت عثمانؓ کی مالی سیاست کی وضاحت کرتے ہوئے ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ خلافت کے بارے میں حضرت عثمانؓ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ مسلمانوں کو خلیفہ کے اعمال پر گرفت اور سزا دینے کا حق تو ایک طرف رہا اس کے اعمال پر نگرانی اور پابندی عائد کرنے کا بھی انھیں حق حاصل نہیں۔ لہٰذا، بخیالِ خویش انھوں نے جو عہد دیا تھا اس کے لئے وہ لوگوں کی بجائے خدا کے روبرو جواب دہ تھے۔ ان کے اس عقیدہ پر یہ بات پوری طرح شاہد ہے کہ جب لوگوں نے انہیں خلافت سے دست بردار ہو جانے کے لئے کہا تو انہوں نے ان کے اس مطالبہ کو نہایت ہی ناواجب اور عظیم الخطر مطالبہ قرار دیا۔ چنانچہ انھوں نے مطالبہ کرنے والوں اور دیگر حضرات کو یہی جواب دیا کہ "جو قمیص مجھے خدائے عز و جل نے پہنائی ہے میں اسے اتارنے کا مجاز نہیں" اسی طرح انھوں نے ان لوگوں سے یہ بھی فرمایا "مجھے یہ گوارا ہے کہ لوگ بڑھ کر میری گردن مار دیں مگر مجھے یہ گوارا نہیں کہ میں اس پوشاک کو اتار دوں جو مجھے عز و جل نے پہنائی ہے۔"

خلافت کے متعلق حضرت عثمانؓ کی رائے

گویا ان کے نزدیک خلافت کوئی ایسا قابل باز پرس منصب نہ تھا جسے انھوں نے مسلمانوں سے حاصل کیا ہو اور جسے وہ اپنی خواہش سے یا مسلمانوں کے واپسی کے مطالبہ پر انھیں واپس دے سکتے ہوں۔ بلکہ ان کی نظر میں خلافت ایک ایسا لباس تھا جو خدا نے ان کے زیب تن کیا تھا اس لئے نہ وہ خود اسے اتارنے کا حق رکھتے تھے اور نہ کسی دوسرے کو

اس کے اتار لینے کا حق تھا۔ یہ حق صرف خدائے تعالیٰ کو حاصل تھا کہ جس روز وہ انھیں لباسِ زندگی سے محروم کرے اس لباس کو بھی ان پر سے اتار دے، اس معاملہ میں حضرت عثمانؓ کا عذر یہ تھا کہ انھوں نے اپنے دو پیش رو ساتھیوں کو جو خلیفہ ہو گزرے دیکھا تھا کہ ان میں سے کسی کا منصب بھی تاحین حیات چھینا نہ گیا تھا۔ وہ بھی انہی کی طرح خلیفہ ہوئے تھے۔ اس لئے جب تک رشتۂ زندگی ان کے ہاتھ میں ہے انہیں خلافت سے بھی وابستہ رہنا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ جب خلافت اور اختیارات کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی تو پھر اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ وہ ان لوگوں کو تنگ اور مجبور کرتے جو ان کے ساتھ اختیارات کے مسئلہ میں کشمکش کرتے اور انہیں نظم و ضبط یا سیاست یا مال کے معاملے میں بعض تصرفات سے روکنا چاہتے تھے۔ کیونکہ اپنی مذکورہ بالا رائے کے مطابق وہ لوگوں کے سامنے جوابدہ نہ تھے بلکہ صرف خدا کے روبرو جوابدہ تھے۔ حضرت عثمانؓ نے یہ عقیدہ محض تصنع کی وجہ سے یا ملامت کرنے والوں کی ملامت کے ڈر سے یا غصہ اور اعتراض کرنے والوں کے غصے اور اعتراض سے بچنے کے لئے نہیں بنایا تھا، بلکہ ان کا یہ خیال صدقِ نیت اور خلوصِ بصیرت پر مبنی تھا بلکہ شاید خلافت و اختیارات کے بارے میں حضرت عثمانؓ کے بہت سے ہمعصر مسلمان بھی انہی کے ہم خیال تھے۔ اسی خیال سے اس امر کی ترجمانی ہوتی ہے کہ بعض صحابۂ کرامؓ خلیفہ کے حکم سے سرتابی کو اپنے لئے قطعاً جائز قرار نہیں دیتے تھے۔ خواہ خلیفہ اعتدال اور راہِ حق سے انحراف ہی کیوں نہ کر رہا ہو۔ وہ اس آیہ پاک کے ظاہری معنوں کے مطابق کاربند تھے۔ اور اس ارشادِ خداوندی کی کوئی تاویل نہ کرنا چاہتے تھے۔

یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ (۵۹)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولوالامر کی۔

لہٰذا، وہ امام کے ہاتھوں اس دنیا میں ظلم برداشت کر کے اس پر ثوابِ آخرت کا مستحق ہونے کو ترجیح دیتے تھے یہ بھی پسند نہ کرتے تھے کہ امام کی مخالفت اور اس سے مقابلہ کر کے کسی گناہ کے مرتکب ہوں، اور اس میں ان کا نقصان بھی کیا تھا کہ دنیا میں وہ ظلم سہ کر آخرت کا ثواب حاصل کر لیں، رہا امام تو وہ اپنے کئے کا خود ذمہ دار ہوگا اور اسے اپنے اعمال کا حساب خدا کے حضور پیش کرنا ہوگا۔

یہی وہ مسلک ہے جس پر حضرت ابوذر غفاریؓ کاربند تھے جبکہ وہ حضرت عثمانؓ کے مظالم پر معترض ہونے کے باوجود ان کی اطاعت کرتے رہے یہی مسلک حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا تھا۔ وہ حضرت عثمانؓ کے غیظ و غضب کا شکار رہ کر بھی تعمیلِ حکم سے روگرداں نہ ہوئے اور انہوں نے (بمقام منیٰ) حضرت عثمانؓ سے اختلاف کے باوجود محض اس لئے پوری نماز ادا کی کہ حضرت عثمانؓ نے پوری نماز ادا کی تھی۔ یہی حال حضرت عثمانؓ نے اپنی انتظامی جنگی و مالی سیاست میں بھی

جاری رکھا۔ وہ اجتہاد کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس اجتہاد کے لئے وہ صرف خدا کے سامنے جوابدہ ہیں؛ اور یہ کہ مسلمانوں پر ان کی فرمانبرداری واجب ہے نیز یہ کہ مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ ان کی خیر خواہی کریں اور انہیں مشورے دیتے رہیں؛ پھر ان کی مرضی ہے چاہیں تو ان کے مشورے کو قبول کرلیں جیسا کہ متعدد واقعات میں انھوں نے کیا اور چاہیں تو انہیں رد کر دیں جیسا کہ مختلف امور میں پیش آیا۔ اقتدار کے استعمال کا یہ تصور بالکل نیا تھا۔ کیونکہ حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے وہم و گمان میں یہ بات نہیں آئی ہوگی کہ وہ اقتدارِ حکومت کو مسلمانوں سے بالا بالا محض اپنی ذات تک محدود کر سکتے ہیں۔ بلکہ اس معاملہ میں حضرت عمرؓ نے بعض اوقات ایسی شدت اختیار کی کہ خود مسلمانوں کو ناگوار گزری مثلاً وہ واقعہ کہ ملکہ روم نے آپ کی زوجہ ام کلثوم بنت علی بن ابی طالب کو ہیرے جواہرات سے مرصع ہار بطور تحفہ بھیجا کیونکہ ام کلثوم نے بھی اُسے عرب کے کچھ لوادر ہدیۃً بھیجے تھے۔ مگر جب ڈاک آئی تو وہ ہار حضرت عمرؓ کو ملا اور انھوں نے اسے اپنی اہلیہ کو دینا پسند نہ کیا۔ چنانچہ ان کے حکم سے "الصلوٰۃ جامعۃٌ" کی منادی کی گئی۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے اس ہار کے بارے میں ان سے مشورہ طلب کیا۔ سب نے یہی مشورہ دیا کہ ہار ام کلثوم کو دے دیا جائے کیونکہ یہ ان کی ملک ہے۔ لیکن چونکہ وہ ہار مسلمانوں کی ڈاک میں آیا تھا اس لئے حضرت عمرؓ اسے اپنے گھر والوں کو دینے میں بارِ خاطر محسوس کر رہے تھے چنانچہ آپ نے حکم دیا کہ ہار بیت المال میں داخل کر لیا جائے اور ان کی بیوی کو اتنی رقم ادا کر دی جائے جو ملکۂ روم کو ارسال کردہ تحفہ پر خرچ ہوئی تھی۔

ہم جانتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا یہ متشددانہ طرزِ عمل جسے انھوں نے اپنے اور اپنے کنبہ کے لئے روا رکھا تھا لوگوں کے دلوں پر گراں گذرتا تھا اور یہی باعث تھا کہ عورتیں حضرت عمرؓ سے نکاح کرنا پسند نہ کرتی تھیں اور اسی چیز نے بعض عورتوں کو حضرت عمرؓ کا پیغام مسترد کر دینے پر مجبور کیا، ذرا مقابلہ کیجیے حضرت عمرؓ کے اس طرزِ عمل کا حضرت عثمانؓ کے طرزِ عمل سے جب کہ انہوں نے بیت المال کے ہیرہ کا اپنی ایک اہلیہ کو زیور پہنایا اور پھر لوگوں کے اعتراض پر انہیں یہ جواب دیا "خواہ کوئی کتنا ہی ناک بھوں چڑھاتا رہے ہم اپنی جملہ ضروریات اسی مالِ غنیمت سے پوری کریں گے"؟

ہمیں تکلیف ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کا طرزِ عمل خلافت کے بارے میں بعینہٖ وہی ہے جسے زیاد نے اپنے اس مشہور خطبہ میں پیش کیا تھا۔

أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّا قَدْ أَصْبَحْنَا لَكُمْ سَاسَةً وَعَنْكُمْ ذَادَةً نَسُوْسُكُمْ بِسُلْطَانِ اللهِ الَّذِيْ أَعْطَانَا وَنَذُوْدُ عَنْكُمْ بِفَيْئِ اللهِ الَّذِيْ خَوَّلَنَا۔

اے لوگو! ہم تمہارے حاکم و محافظ بنائے گئے ہیں۔ ہم تم پر حکومت کرتے ہیں اس اختیار کی رُو سے جو خدا نے ہمیں عطا کیا

اور تمہاری حفاظت کرتے ہیں اس مالِ غنیمت کے عوض جو خدا نے ہمیں بخشا۔

اس چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم حضرت عثمانؓ کی اس روایت کو حیرت کی نگہ سے نہیں دیکھتے کہ "حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ پر اور اپنے اقربا پر زیادتی کرتے تھے مگر میں خدا کی خوشنودی کے لئے صلہ رحمی کرتا ہوں" گویا حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کے اجتہاد نے انہیں اپنے اقربا پر ظلم و زیادتی سکھائی اور حضرت عثمانؓ کے اجتہاد نے انہیں اپنے اقربا کے ساتھ صلہ رحمی کے نتیجہ پر پہنچایا، اور اس طرح انھوں نے اپنے آپ پر ظلم نہ کیا۔ اس تجزیہ کے بعد ہمیں حضرت عثمانؓ سے متعلق ان روایات کی صحت کے بارے میں کوئی بحث کرنے کی ضرورت نہیں رہتی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مروان بن حکم کو افریقہ میں مسلمانوں کے حاصل کردہ مالِ غنیمت کا خمس (⅕) یا خمس (⅕) کا خمس ⅕ یا خمس کی قیمت میں سے جو اس کے ذمہ باقی بچی تھی بخش دی تھی۔ نیز یہ کہ انھوں نے اپنے چچا حکم کو دولت سے نوازا حکم کے بیٹے حارث کو تین لاکھ۔ عبداللہ بن خالد بن اسید اموی کو تین لاکھ اور عبداللہ بن خالد کے ہمراہ آنے والوں میں سے ہر ایک کو ایک ایک لاکھ درہم بخشے۔ حتیٰ کہ بیت المال کے خزانچی عبداللہ بن ارقم نے تعمیلِ حکم سے انکار کر دیا اور اپنے منصب سے مستعفی ہو گئے۔ عبداللہ بن ارقم کے مستعفی ہونے کے بعد خود ان کو تین لاکھ درہم بخش دیئے۔ مگر انھوں نے اپنے زہد و تقویٰ کی بنا پر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ نے حضرت زبیر بن العوام کو چھ لاکھ درہم اور حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ اور حضرت سعد بن العاصؓ کو ایک ایک لاکھ درہم دیئے۔ اپنی تین یا چار بیٹیاں قریش میں بیاہیں اور ان میں سے ہر ایک کے شوہر کو ایک ایک لاکھ درہم تفویض کئے۔

حضرت عثمانؓ اس قسم کی بخشش دینا اپنا حق سمجھتے تھے۔ وہ بیت المال کے خزانچی کو اس کا مجاز نہیں سمجھتے تھے کہ وہ اس ضمن میں ان کی حکم عدولی کرے یا ان سے بحث و تمحیص کرے۔ جب حضرت عثمانؓ اس قسم کی بخششوں کو اپنا حق سمجھتے تھے تو پھر ان کے اس حق میں تو کسی کلام کی گنجائش ہی نہیں کہ وہ ضرورت پر بیت المال سے قرض لے لیں اور فراخ دستی پر اسے واپس کر دیں۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں حضرت عثمانؓ کے عمال بھی مال کے معاملے میں اپنے امام کی اقتدا کرتے ہوں گے۔ لہٰذا، انھوں نے بھی سخاوتیں کیں، بیت المال سے قرض لئے اور ان میں سے بعض نے قرضہ کی ادائی میں ٹال مٹول بھی کی، چنانچہ جس طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کوفہ سے مستعفی ہوئے حضرت عبداللہ بن ارقم مدینہ کی خازنی سے مستعفی ہو گئے ظاہر ہے کہ جب امام اور ان کے عمال اموالِ عامہ کو اس طرح بے دریغ خرچ کر رہے ہوں تو لشکریوں کا محتاجِ مال ہونا اور محروم رہنا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ نیز یہ بھی کوئی حیرت انگیز بات نہیں کہ امام مالِ زکوٰۃ میں سے امورِ جنگ پر خرچ کرنے کے لئے مجبور ہو جائے۔ اور اس طرح خود کو عوام کی مخالفتوں اور اعتراضوں کا نشانہ بنائے جس کا ذکر

پہلے کیا جا چکا ہے اور جس سے کم از کم یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ عہد عثمانؓ میں مالی سیاست بے ضابطہ و غیر محکم تھی۔
جب امام اموالِ عامہ کو بے دریغ خرچ کرنے لگ جائے اور اس کے عمال بھی اس کی اقتدا کر رہے ہوں تو پھر اموالِ زکوٰۃ میں دست اندازی کر لینا کوئی اچنبھے کی بات نہیں، لطف یہ ہے کہ یہ رقم امورِ جنگ پہ ہی نہیں بلکہ سخاوت اور کنبہ پروری و صلہ رحمی کے لئے بھی مستعمل ہونے لگی، کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حارث بن حکم کو بنی قضاعہ کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا اور واپسی پر جو کچھ وہ لایا تھا اسی کو بخش دیا۔ جب اموالِ عامہ کو اس بیدردی سے اڑایا جا رہا ہو تو کوئی عجیب بات نہیں کہ بیت المال کو اخراجات جنگ و امن، اور امام و عمال کی سخاوتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے رعیت پر سختی اور خراج و جزیہ اور زکوٰۃ کی وصولی میں جبر اور دباؤ تک نوبت پہنچ گئی ہو، اس صورت حال سے اس روایت کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ مصریوں نے عبد اللہ بن سعد کے ظلم کا کیوں شکوہ کیا تھا۔ اور حضرت عمرو بن العاصؓ نے کیوں کہا تھا " لیکن اونٹنی کے بچے تو بھوکے مر گئے "۔ (یعنی رعیت نادار و تباہ حال ہو گئی) اسی سے اس روایت کی بھی تشریح ہو جاتی ہے کہ کس طرح حکام وصولی صدقہ و زکوٰۃ میں صحرا نشینوں اور دیہاتیوں پر ظلم کرتے تھے اور پھر وہ ظلم حضرت عثمانؓ کی طرف منسوب ہو جاتا تھا۔ نیز یہ بھی کہ جب اس کی شکائتیں حضرت عثمانؓ تک پہنچتی تھیں تو وہ اس کا کوئی تدارک نہ کرتے تھے۔ مزید برآں یہ کہ حضرت عثمانؓ کی اس سخاوت کا سلسلہ جائیداد منقولہ تک ہی محدود نہ رہا بلکہ بڑھ کر جائداد غیر منقولہ پہ بھی اثر انداز ہوا چنانچہ لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے خلاف یہ بھی شکایت تھی کہ انھوں نے محروسہ علاقوں میں بنی امیہ کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کر دی ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے اس اقدام کی حمایت میں اہلِ سنت و معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے یہ سب کچھ زمین کی اصلاح اور اسے قابلِ کاشت بنانے کے لئے کیا تھا اور اس سے مسلمانوں کی بہتری مقصود تھی۔ شیعہ حضرات اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ خود حضرت عثمانؓ نے کبھی اپنے حق میں یہ عذر پیش نہیں کیا۔ شیعہ یہ اعتراض بھی کر سکتے ہیں کہ تمام قریشیوں میں صرف بنی امیہ ہی زمین کی اصلاح کے ماہر خصوصی نہیں تھے، پھر یہ کہ سارے عرب قبائل میں صرف قریش ہی زمینوں کو زرخیز بنانے کی مہارت خصوصی نہیں رکھتے تھے، نیز یہ کہ تمام مسلمانوں میں محض عرب ہی غیر آباد زمینوں کو قابلِ کاشت بنانے میں ماہرینِ خصوصی نہیں تھے، غرضیکہ یہ تمام کا تمام سلسلہ محض حضرت عثمانؓ کے اسی تصورِ خلافت کی بدولت چل رہا تھا جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور حضرت عثمانؓ اور ان کے عمال کی یہ روش اسی تصور کے ایمان پر مبنی تھی۔

ہم حضرت عثمانؓ کے پیدا کردہ اقتصادی انقلاب کا ذکر بھی پہلے کر چکے ہیں وہ اس طرح کہ انھوں نے عربوں کو

اجازت دے دی کہ اگر وہ چاہیں تو اپنی ان جاگیروں کو جو محروسہ علاقوں میں ہیں بیچ کر ان کی جگہ جزیرۃ العرب میں زمین خرید سکتے ہیں۔ ہم یہ وضاحت بھی کر چکے ہیں کہ اس انقلاب نے اسلام میں جاگیردارانہ نظام پیدا کر دیا تھا۔ اور اگر ہم اس میں ان سخاوتوں کا بھی اضافہ کر لیں جو امام اور اس کے عمال کی طرف سے اموالِ عامہ میں سے بنی امیہ اور قریش کو ملتا تھا اور جس نے انھیں اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ مفتوحہ علاقوں میں زمینیں خرید سکیں۔ تو یہ سب کچھ اس امر پہ دلالت کرتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی مالی سیاست سے دو نتیجے برآمد ہوئے اور وہ دونوں بُرے تھے۔ ایک اموال عامہ کا غیر واجب خرچ جو مالی پریشانی اور رعیت پہ ظلم و زیادتی کا باعث ہوا۔ دوسرا اس دولت مند اور فضول خرچ طبقہ کا ظہور جس کی حرص و آز کی کوئی حد نہ تھی۔ جو اپنی ملکیت زمین کو بڑھاتے چلا جا رہا تھا۔ اور کسان کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ مزید برآں یہ کہ وہ طبقہ اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے ممتاز خیال کرنے اور اقتدار و تسلط میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے لگا تھا، اور بالآخر یہ باہمی رقابت و منافست امارت سے بڑھ کر خود خلافت میں بھی ہونے لگی اور اس کا سلسلہ ان فسادات و مصائب تک پہنچا جنھوں نے قتلِ عثمانؓ کے وقت سے لے کر بنی اُمیہ کے زوال اور بنی عباس کے آغاز تک مسلمانوں کے سارے نظام کو درہم برہم کئے رکھا۔ یہ بدیہی امر ہے کہ بیت المال میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ ہر فرد اس کی سخاوت سے بہرہ اندوز ہوتا لہٰذا، یہ بھی فطری نتیجہ تھا کہ جو محروم رہتے وہ لینے والوں اور عطا کرنے والوں کے دشمن ہو جاتے تھے۔ چنانچہ نہ صرف عوام کے باہمی روابط بگڑ گئے بلکہ خلیفہ و عمال کے ساتھ بھی ان کے تعلقات خراب ہو گئے۔ وہ جب اس صورتِ حال پر غور کرتے اور عہدِ نبویؐ یا زمانۂ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا تصور ذہن میں لاتے تو وہ فوراً اس نتیجہ پہ پہنچ جاتے کہ ایک طرف تو حضرت عثمانؓ کا طریقہ سنت موروثہ سے کچھ مختلف ہے دوسرے یہ کہ ان پہ ظلم ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفتوحہ علاقہ سے محاصرہ سے قبل جو باغی آئے تھے انہوں نے حضرت عثمانؓ سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ مالِ غنیمت کے مصارف پہ از سرِنو غور کریں۔ ان کا مطالبہ تھا کہ مالِ غنیمت میں سے صرف انہی لوگوں کو ملے جنھوں نے اسے لڑ کر حاصل کیا تھا یا ان بزرگوں کو ملے جو رسولؐ خدا کے اصحاب ہیں، اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ ان کی نظر میں حضرت عثمانؓ اموالِ عامہ کے خرچ کرنے میں اسراف سے کام لے رہے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے حضرت عثمانؓ سے صرف یہی مطالبہ نہ کیا کہ وہ فضول خرچی سے باز رہیں بلکہ ان سے ایک ایسی نئی مالی سیاست کے مرتب کرنے کا بھی مطالبہ کیا جو خود فاروقی سیاست سے بھی جداگانہ ہو۔ مالِ غنیمت کے بارے میں حضرت عمرؓ کا طرزِ عمل واضح و متعین تھا۔ وہ حکمِ الٰہی کی رُو سے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ (خمس) لے لیتے اور باقی چار حصے اس مال کے حاصل کرنے والوں (فوج) کے حوالے کر دیتے۔ یہ خمس بہ خراج اور جزیہ کی وصول شدہ رقم میں شامل ہو جاتا۔ اس

رقم میں سے رفاہِ عامہ پر خرچ کرتے، ازاں بعد اسی رقم سے مسلمان مردوں اور عورتوں اور بچوں کو وظائف دیئے جاتے، تمام فوجیوں کو دوسرے عام لوگوں کی طرح وظیفہ دیا جاتا ساتھ ہی ان میں سے جنگ میں حصہ لینے والوں کو ان کا مالِ غنیمت کا حصہ الگ ملتا، مگر جب علاقۂ بصرہ کے باشندوں نے خلیفہ اور ان کے عمال کا مالِ غنیمت کے صرف میں اسراف دیکھا تو انھوں نے مطالبہ کیا کہ اموالِ عامہ میں سے صرف ان لشکریوں کو دیا جائے جنھوں نے مالِ غنیمت حاصل کرنے میں شرکت کی ہو۔ خواہ انھوں نے لڑائی میں حصہ لیا ہو یا نہ لیا ہو۔ لڑنے والوں کے لئے وہ رقم ان کا اجر ہوگا اور نہ لڑنے والوں کے لئے وہ رقم از قسم "معاش" (پنشن) ہوگی۔ ان لشکریوں کے علاوہ مالِ غنیمت سے اصحابِ رسولؐ کو حصہ دیا جائے کیونکہ وہ آپؐ کے ہمراہ شریکِ جنگ رہے اور بہت سے بعد میں دوسری فتوحات میں بھی شامل رہے۔ لہٰذا، وہ اس مالِ غنیمت میں سے "معاش" حاصل کرنے کے اسی طرح مستحق ہیں جس طرح ایسے سپاہی جو شریکِ جنگ ہوتے رہے اور پھر مجروح یا ضعیف ہو جانے کی وجہ سے پنشن کے حق دار ہو گئے۔ رہے وہ مسلمان جو کسی معرکہ میں بھی شریک نہ ہوئے تو انہیں مالِ غنیمت میں سے کچھ لینے کا کوئی حق نہیں۔ غرضیکہ اس طرح حضرت عثمانؓ کی مالی حکمت عملی نے ان باغیوں کو اس حد تک پہنچا دیا کہ وہ ان سے خود فاروقی سیاست کو بھی بدل دینے کا مطالبہ کرنے لگ گئے پھر جب کہ خود حضرت عثمانؓ ایک ایسی دور کی سیاست پر عمل پیرا ہو کر جو حضرت عمرؓ کی سیاست سے مختلف تھی ایک ایسا سرمایہ دار طبقہ پیدا کر چکے تھے جو ہوسِ ملکیت اور اس کی توسیع کی تمام حدود عبور کر گیا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی جو باغیوں کو حضرت عثمانؓ اور ان کے عمال سے سیرتِ عمرؓ کی مخالفت کا مطالبہ کرنے میں مانع ہوتی۔

جب ایسی حکومت سے پالا پڑ جائے جو ایثار کی بجائے خود غرضی و خود پروری پر قائم ہو اور مسلمانوں کے سابقہ روایاتی تقسیمِ دولت کے تناسب سے منحرف ہو تو اس سے اس خود غرضی کے دور میں کم از کم عدل کا یہ تقاضا تو پورا کرانا چاہیئے کہ دولت انہی لوگوں کے لئے خاص ہو جائے جو اسے اپنی محنت اور خون پسینہ ایک کر کے کماتے ہیں۔ اہم بات یہ تھی کہ باغی حضرت عثمانؓ کی پیدا کردہ سرمایہ داری کو انتہائی ممکن حد تک منصفانہ اور سب کے لئے یکساں دیکھنا چاہتے تھے ___ وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ بہت سے جوانانِ قریش اور اہلِ مدینہ اپنے وظائف کے سہارے بالکل بے کاری کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بلکہ بعض حالات میں انھیں ان وظائف کی ضرورت ہی نہ تھی۔ چنانچہ باغیوں نے یہ بھی کہا۔ "ان میں سے جو امیر ہیں انھیں تو بیت المال سے کچھ لینے کا حق ہی نہیں ہے اور جو غریب ہے اسے ہاتھ پیر چلا کر کمانا چاہیئے۔ اموالِ عامہ کو نکموں اور بے کاروں پر خرچ کرنے کا کیا مطلب ہے؟" حضرت عثمانؓ نے ان کا یہ مطالبہ

مان لیا، اور لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ جس کے پاس زمین ہے وہ اپنی کھیتی کا کام کرے جس کا کوئی کاروبار چل رہا ہے وہ اپنے کاروبار سے کمائے۔ بیت المال سے اب وظیفہ فقط مجاہدین اور اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ملے گا۔

لیکن حضرت عثمانؓ اپنی اس حکمتِ عملی کو نافذ بھی نہ کرنے پائے تھے کہ فتنہ و فساد کا آغاز ہو گیا۔ اگر حضرت عثمانؓ اموالِ عامہ کے بارے میں سیرتِ عمرؓ کا اتباع کرتے اور مال کو صرف اس کے مستحقین پر خرچ کرتے تو وہ اپنے آپ کو بھی اور مسلمانوں کو بھی ایک بہت بڑے فساد سے بچا لیتے۔ اور ممکن تھا کہ اسلام انسانیت کے لئے ایک ایسا مناسب سیاسی اور اجتماعی نظام پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا جو اسے بہت سی پریشانیوں اور فسادات سے بچا لیتا جس میں وہ مبتلا ہوتی رہی، لیکن زندگی کے حالات و انقلابات حضرت عثمانؓ کے بس کا روگ نہ تھے اور کون کہہ سکتا ہے کہ شاید خود حضرت عمرؓ بھی اگر وہ جلد ہی فوت نہ ہو جاتے تو ان کا مقابلہ کرنے کی تاب نہ لا سکتے[1]

---

[1] حضرت عمرؓ کے کوائفِ خلافت یہ بتاتے ہیں کہ اگر وہ کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو ایک نظام مستحکم طور پر قائم کر جاتے جو نوعِ انسانی کو ان پریشانیوں سے نجات دلا دیتا جن میں وہ مبتلا چلی آ رہی ہے۔

چھبیسواں باب

حضرت عثمانؓ کا اپنے مخالفین کے ساتھ طرزِ عمل

مسلمانوں نے حضرت عثمانؓ کے اس طرزِ عمل پر بھی اعتراضات کئے جو انھوں نے اپنے اوپر تنقیدیں کرنے والوں اور مخالفوں کے ساتھ روا رکھا، اس سلسلہ میں ان کا رویہ حضرت عمرؓ کی سیرت سے بہت زیادہ ہٹا ہوا تھا، حضرت عمرؓ نے جس شدت کے ساتھ اپنے عمال کو لوگوں کی آزادی سلب کرنے سے منع کیا اتنا اور کسی شے سے منع نہ کیا وہ کہا کرتے تھے کہ "تم نے لوگوں کو اپنا غلام کیوں سمجھ رکھا ہے حالانکہ آزادی ان کا پیدائشی حق ہے"۔ اسی طرح وہ رعایا کو ناحق جسمانی سزا دینے سے اپنے اعمال کو جس قدر سخت ہدایات دے کر منع کرتے تھے اتنی سختی وہ کسی اور حکم پر نہیں کرتے تھے۔ وہ شرعی حدود کے سوا کسی حالت میں بھی لوگوں کو مار کی سزا دینے کے روادار نہ تھے وہ کسی ایسے سرکاری عہدہ دار کو جو شرعی سزا کے علاوہ رعیت کو مارتا پیٹتا یا ناحق کسی پر زیادتی کرتا بغیر قصاص لئے کبھی نہ چھوڑتے لیکن حضرت عثمانؓ کی طرف سے اہلِ سنتؒ و معتزلہ حضرات خواہ کتنے ہی عذر کیوں نہ پیش کریں اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا، انھوں نے خود بھی رعایا پر زیادتی کی اور اپنے عمال کو بھی رعیت پر سختیاں اور زیادتیاں کرنے مارنے پیٹنے اور جلاوطن اور قید کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔ خود ان کے ہاتھوں یا ان کے حکم سے رسولِ خدا کے دو جلیل القدر صحابی پیٹے۔ حضرت عمار بن یاسر کو اس طرح مارا گیا کہ انہیں فتق کا عارضہ ہو گیا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو مسجدِ نبویؐ سے بڑی سختی اور ذلت کے ساتھ دھکے دے کر نکلوایا گیا کہ ان کی ایک پسلی ٹوٹ گئی۔ ان دونوں بزرگوں نے حضرت عثمانؓ

لہ مصنف نے ہر جگہ یہی کہا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی مدافعت اہلِ سنت اور معتزلہ کی طرف سے ہوتی تھی (اور ہوتی ہے) لیکن انہوں نے کہیں اس کی تصریح نہیں کی کہ ان کی مخالفت کس گروہ کی طرف سے ہوتی تھی

پر خواہ کیسی ہی سخت تنقیدیں اور طعن و تشنیع کیوں نہ کی ہوں ۔ کتنا ہی ان کو بدنام کیوں نہ کیا ہو ہمارے پاس کوئی ایسی اطلاع نہیں کہ حضرت عثمانؓ نے ان کے خلاف مقدمہ چلایا ہو یا ان کے خلاف عائد کردہ الزام پر کوئی پختہ ثبوت فراہم کیا ہو یا ان میں سے کسی کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا ہو۔ انھوں نے ان کے متعلق جو کچھ اپنے عمال یا مقربین سے سنا اس پر تکیہ اعتماد کر کے بغیر کسی دلیل و ثبوت کے انھیں سزا دے دی ۔ حالانکہ انھیں اس قسم کا کوئی حق نہ پہنچتا تھا ۔ اہل سنت اور معتزلہ میں سے حضرت عثمانؓ کے حامی یہ کہتے ہیں کہ امام کو سزا دینے کا حق حاصل ہے ہمیں اس میں بھی کوئی شک یا اعتراض نہیں بشرطیکہ مسلمان کو اسی وقت سزا دی جائے جب کہ اس کے خلاف جرم ثابت ہو جائے اور وہ سزا کا مستحق ہو جائے ، نیز یہ کہ مجرم سے جواب طلبی کر لی جائے اور اس کا عذر سنا جائے ۔ ہمیں نہیں معلوم کہ حضرت عثمانؓ نے حضرات عمارؓ یا ابن مسعودؓ کے خلاف تحقیقات کی یا مقدمہ چلایا ہو۔ اسی طرح انھوں نے بہ نفس نفیس حضرت ابوذر غفاریؓ پر سختی کی ۔ یہاں تک کہ انہیں جلاوطن کر دیا یا جلاوطنی پر مجبور کر دیا کسی خاص جرم کی پاداش میں نہیں بلکہ محض اس لئے کہ حضرت ابوذرؓ اموال عامہ سے متعلق حضرت عثمانؓ کی حکمت عملی پر معترض تھے اور اس نظام اجتماعی کو ناپسند کرتے تھے جس نے دولت مندوں کا ایک طبقہ پیدا کر کے ان کے لئے زر و سیم جمع کرنے اور بے شمار جائدادیں حاصل کر لینے کا سامان مہیا کر دیا تھا ۔ علاوہ ازیں حضرت عثمانؓ نے اپنے عمال کو یہ اختیار بھی دے رکھا تھا کہ جس کا بھی کوئی عمل ان کی پسند کے خلاف ہو وہ اسے جلاوطن کر دیں ۔ چنانچہ ان کے عمال نے کوفہ کی ایک جماعت کو ایک علاقہ اور کبھی دوسرے علاقہ میں بھیجا ۔ سعید نے ان لوگوں کو حضرت معاویہؓ کے پاس بھیجا اور حضرت معاویہؓ نے انہیں پھر سعید کے پاس بھیج دیا۔ اور سعید نے پھر انہیں حضرت عبدالرحمن بن خالد کے پاس روانہ کر دیا حالانکہ نہ ان کے خلاف تحقیقات کی گئی نہ ثبوت لئے گئے اور نہ ان سے صفائی طلب کی گئی ۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ نے عبداللہ بن عامر کو یہ اجازت دے دی کہ وہ عامر بن عبدالقیس کو شام کی طرف جلاوطن کر دیں ۔ لیکن امیر معاویہؓ عامر سے پہلی ہی ملاقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ وہ بے گناہ ہے اور اس کے خلاف دروغ بیانی کی گئی ہے لہٰذا ، امیر معاویہؓ نے اسے واپس بصرہ بھیج دینا چاہا مگر عامر نے جانے سے انکار کر دیا ۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کا حوصلہ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اس نے خلیفہ کے پاس شکایت کرنے والے بعض افراد کو اس قدر زدوکوب کیا کہ ان میں سے ایک کی موت واقع ہو گئی آخر مجبور ہو کر مہاجرین و انصار اور ازواج رسولؐ نے حضرت عثمانؓ پر زور دیا کہ وہ مصریوں سے ان کے عامل کے ظلم کا انصاف کریں ۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اس کا ارادہ بھی کیا لیکن عملی طور پر اپنا ارادہ پورا نہ کر سکے ۔

اس سخت گیر سیاست کا جس نے خلیفہ اور ان کے عمال کو لوگوں کو جسمانی اذیتیں پہنچانے اور عوام کے امن وحریت

سلب کرنے پر مسلط کر رکھا تھا۔ بھلا سیرتِ رسول اکرمؐ اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے طرزِ عمل سے کیا تعلق تھا؟ سیرت کے واقعات میں ہمیں ایک ایسے شخص کی جسارت کا واقعہ ملتا ہے جس نے خود آنحضرتؐ پر اعتراض کر دیا تھا اور کہا تھا "اے محمدؐ انصاف کریں۔ آپؐ نے انصاف نہیں کیا" اس نے تین بار جملہ دُہرایا۔ تیسری بار کے بعد آپؐ نے اس سے زیادہ کچھ نہ فرمایا "ہوش میں آؤ۔ اگر میں انصاف نہیں کرتا تو اور کون کرے گا؟" مسلمانوں نے اس شخص کو سزا دینی چاہی لیکن آپؐ نے انھیں ایسا کرنے سے منع فرما دیا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عہدِ عثمانؓ میں مسلمانوں نے نئے طور طریق اختیار کر لئے تھے۔ لہٰذا، خلیفہ کو بھی ان کے نئے اطوار کے مطابق رویّہ اختیار کرنا پڑا۔ یہ بالکل وہی بات ہے جو زیاد نے اہلِ عراق سے کی تھی، "تم نے کچھ نئے نئے ڈھنگ اختیار کر لئے ہیں لہٰذا، ہم نے بھی ہر جرم کے لئے نئی نئی سزائیں مقرر کر دی ہیں۔" اور یہ کتنی حیرت ناک بات ہے کہ ہمیں حضرت عثمانؓ اور اُن کے عمال کی سیاست دوبارہ سیاستِ زیاد کی یاد دلاتی ہے۔

اب جب کہ ہم ان رونما ہونے والے واقعات وحوادث اور ان کے متعلق متکلمین کی آراء پیش کر چکے ہیں۔ وہ مقام آگیا ہے جہاں ہم اس فتنہ کو اس کی جڑ سے پکڑ سکتے ہیں اور اسے اس کی صحیح شکل میں ابتدائی مرحلہ سے لے کر آخری مرحلہ تک پیش کر سکتے ہیں، وہ عظیم فتنہ جس میں امام کو قتل کر دیا گیا، بے خبری میں یا دھوکہ سے نہیں بلکہ علانیہ۔ بزور وجبر!!

ستائیسواں باب

مخالفتیں اور حضرت عثمانؓ

حضرت عثمان کے خلاف ان کے معاصرین کی مخالفتوں کا تدریجی ارتقاء

تمام مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ مسلمانوں نے خلافتِ عثمانؓ کا استقبال خوشی اور طمانیت کے ساتھ کیا تھا۔ کیونکہ حضرت عثمانؓ نے ان کے لئے ان چیزوں میں کشائش کی تھی جن میں حضرت عمرؓ تنگی اور شدت برتتے تھے اور انہوں نے ان کے لئے وہ امور آسان کر دیئے تھے جنھیں حضرت عمرؓ نے ان کے لئے سخت اور مشکل بنا رکھا تھا، جیساکہ آپ نے ملاحظہ فرمایا انھوں نے سب سے پہلے خلیفہ بنتے ہی وظائف بڑھا دیئے۔ علاوہ ازیں عوام سے نرمی کا سلوک کیا۔ دل کھول کر سخاوتیں کیں اور بخششیں دیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو ان کے دور میں کچھ اس قسم کی آسودگی اور فارغ البالی محسوس ہونے لگی جسے وہ عہدِ فاروقی میں نہ پاتے تھے، اسی طرح قریشیوں کو بھی ایک خاص قسم کی آزادی کا احساس ہونے لگا جس سے وہ عہدِ فاروقی میں آشنا نہ تھے۔ گویا حضرت عمرؓ کی طرح حضرت عثمانؓ سیاہ کنکھ بلی گھاٹی کے سرے پہ کھڑے ہو کہ قریش کا راستہ روکے نہ رہے تاکہ انھیں آگ میں گرنے سے بچالیں بلکہ اس کے دہانے سے ہٹ گئے اور قریش کو اجازت دے دی کہ محروسہ علاقوں اور شہروں میں جہاں چاہیں آباد ہو جائیں اس امر پر تقریباً تمام مؤرخین متفق نظر آتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے پہلے چھ سال امن و سلامتی سے گزر گئے اور جب دورِ ثانی کا آغاز ہوا تو سخت مشکلات اور پیچیدگیاں رونما ہونے لگیں۔

میرا خیال ہے کہ عامۃ المسلمین حضرت عثمانؓ کی خلافت سے ابتدائی چھ سال تک تو راضی رہے پھر اگلے چار برس تک اسے گوارا کرتے رہے اور جب ان کی مدتِ خلافت دس برس سے آگے بڑھ گئی تو مسلمان حضرت عثمانؓ سے تنگ آگئے اور انھیں یہ مدت طویل نظر آنے لگی۔ ان لوگوں نے شروع میں تو اس امر کا اظہار بڑی نرمی سے کیا۔ پھر بعد میں ذرا تندی اور گرمی پیدا ہو گئی اور پھر ان کی مخالفت نے روز افزوں شدت اختیار کر لی جو رفتہ رفتہ خطرناک شکل

اختیار کر گئی اور بالآخر اپنے بھیانک انجام یعنی قتلِ امام تک پہنچ گئی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت عثمانؓ کو ان دس سالوں میں کسی مخالفت کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو کیونکہ مخالفت تو روزِ اوّل ہی حضرت عبید اللہ بن عمرؓ کے جھگڑے سے شروع ہو گئی تھی، ہمارا مطلب یہ ہے کہ مخالفت نے خطرناک صورت حضرت عثمانؓ کی زندگی کے دو آخری سالوں میں اختیار کی۔ میرا یہ خیال تقریباً یقین کی حد تک پہنچ چکا ہے کہ جس دن حضرت عثمانؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر والی انگوٹھی چاہِ اریس میں کھو دی اسی دن سے لوگوں کے دلوں میں بدشگونی[1] آہستہ آہستہ گھر کرتی چلی گئی۔ یہ انگوٹھی آنحضرتؐ کے بعد باری باری حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو ملی، اور وہ دونوں حضرات مملکت کے سارے معاملات اسی خاتم کے ذریعے سرانجام دیتے رہے۔ وہ دونوں اسے باعثِ خیر و برکت سمجھتے اسے ایک اہم اور گراں قدر میراث جانتے تھے۔ دونوں حضرات خلیفۂ رسول اور سنتِ رسول کو نافذ کرنے والے اور انہی کے طریقہ پر کاربند ہونے کی حیثیت سے تمام معاملات اسی انگوٹھی کے ذریعے فیصل کرتے تھے۔ جیسے خود رسول اللہ زندگی بھر اس کی مہر ثبت فرما کر احکام نافذ فرماتے رہے۔ حضرت عثمانؓ کو یہ انگوٹھی حضرت عمرؓ سے ملی۔ اور حضرت عمرؓ کو یہ انگوٹھی حضرت ابوبکرؓ سے اور حضرت ابوبکرؓ کو جب وہ خلیفہ بنے تو یہ انگوٹھی اہلِ بیتِ رسولؐ سے ملی تھی۔ جب یہ انگوٹھی حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے کنوئیں میں گر پڑی اور باوجود پوری تلاش و جستجو کے جب مسلمانوں کو اسے پانے میں ناکامی ہوئی بالخصوص جب کہ کنوئیں میں پانی بھی زیادہ نہ تھا تو مسلمانوں پر یہ بات شاق گزری اور انھوں نے اس سے بدشگونی لی۔ خود حضرت عثمانؓ کو بھی اس انگوٹھی کے ضائع ہونے کا شدید قلق ہوا۔ بہر حال انھوں نے اسی کی تحریر و نقش کے مطابق دوسری انگوٹھی جس پر "محمد رسول اللہ" کندہ تھا بنوائی۔ لیکن یہ انگوٹھی انگشتِ رسولؐ سے مس نہ ہوئی تھی۔ نہ ہی وہ انگشتِ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے لگی تھی۔ وہ تو ایک نئی مصنوعی انگوٹھی تھی جو نہ وراثتاً ملی تھی۔ نہ قبل ازیں اس کے ذریعے فیصلوں اور احکامات پر مہر لگائی گئی تھی۔ گویا اس نئی انگوٹھی کے ساتھ حضرت عثمانؓ نے اپنی خلافت کے ایک دورِ جدید کا آغاز کیا،

راویوں کا بیان ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ وہ پہلے شخص ہیں جس نے حضرت عثمانؓ کے فیصلہ کی مخالفت کی جرأت کی۔

حضرت عثمانؓ کیخلاف پہلی جرأت

وہ اس طرح کہ کچھ کارندے صدقے کے اونٹ لائے حضرت عثمانؓ نے وہ اونٹ حکم کے کسی عزیز کو بخش دیئے۔ جب حضرت عبدالرحمٰنؓ کو اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے بعض صحابۂ کرامؓ کو بلا کر اس سے وہ اونٹ واپس منگوائے اور انھیں دوسرے لوگوں میں

---

[1] ایک اتفاقی حادثہ سے بدشگونی لینا نہ قرآن کی تعلیم کے مطابق ہے نہ عقل و بصیرت کی رو سے مستحسن۔

تقسیم کردیا۔ حضرت عثمانؓ اپنے گھر میں ہی تشریف فرما رہے۔ انھوں نے اس جرأت پر نہ تو اظہارِ ناگواری کیا اور نہ اس کارروائی میں کوئی تبدیلی کی۔ حتیٰ کہ انھوں نے حضرت عبدالرحمٰنؓ اور ان کے رفقاء سے اس ضمن میں کوئی بات بھی نہ کی۔ بہرحال حضرت عبدالرحمٰنؓ اور ان کے رفقاء کی یہ جسارت فی نفسہٖ بہت بڑا اور خطرناک اقدام تھا، کیونکہ ان کی یہ کارروائی فرمانِ حکومت میں تغیر و تبدل کے مترادف تھی۔ پھر اس گستاخی پر حضرت عثمانؓ کی خاموشی اس سے بھی زیادہ خطرناک بات تھی۔ کیونکہ اس کا مطلب اپنی غلطی کا اعتراف اور حکومت کی دھاک کو کم کرنا تھا۔

اس کے بعد لوگوں کو حضرت عثمانؓ کی سیاست میں جو بات بھی ناگوار گزرتی وہ اس کے خلاف اظہارِ ناپسندیدگی اور اعتراضات کرنے لگے۔ ان کے اعتراضات کبھی صحیح ہوتے اور کبھی غلط، لیکن بہرحال وہ مخالفت کرتے رہتے۔ بعض لوگوں کو بھرے مجمع میں حضرت عثمانؓ کے روبرو بھی مخالفت کرنے میں کوئی باک نہ تھا۔ بعض اشخاص ایسے بھی تھے کہ حضرت عثمانؓ کا حکم پاتے اور تعمیل سے انکار کر دیتے جیسے حضرت ابوذرؓ جو سرمایہ داروں کی مذمت بہ شد و مد کرتے۔ اور یہ آیۂ کریمہ تلاوت کرتے رہتے تھے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۹:۳۴)

اور جو لوگ سونے چاندی کے ذخیرے جمع کر رکھتے ہیں اور انہیں راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے انہیں المناک عذاب کی بشارت دے دو۔

حضرت عثمانؓ نے انہیں منع کر رکھا، لیکن حضرت ابوذرؓ نے تعمیلِ حکم سے انکار کر دیا۔ اور کہا "خدا کو ناراض کر کے عثمانؓ کو خوش کرنے کے مقابلے میں مجھے یہ زیادہ عزیز ہے کہ میں عثمانؓ کو ناراض کر کے خدا کو خوش کر لوں"۔

ولید بن عقبہ کا واقعہ بھی ایسا نہیں جو لوگوں کو وقارِ حکومت کا احساس دلاتا کیونکہ جب حکومت کے کسی عامل کے خلاف یہ ثبوت بہم پہنچ جائے کہ وہ شراب پیتا ہے اور خلیفہ کو اس عامل کے معزول کرنے اور اسے شرعی سزا دینے پر زور دیا جا رہا ہو نیز یہ چرچا عام ہو جائے کہ خلیفہ نے اسے حضرت سعدؓ کی جگہ عامل بنا کر غلط اقدام کیا۔ اور یہ خیال بھی پھیلنے لگے کہ خلیفہ نے یہ جاننے کے باوجود کہ وہ حکومت کے لائق نہیں محض قرابت داری کی وجہ سے اسے حاکم مقرر کر دیا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال ایسی نہ تھی جس سے حکومت کی شان و عظمت میں اضافہ ہوتا ہو۔

اس کے بعد مفتوحہ علاقوں میں مخالفت شدت اختیار کرنے لگی جس کی گونج مدینہ تک پہنچتی تھی۔ یہاں تک کہ مجبوراً حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو جلاوطن کرنے کا طریقہ رائج کیا اسی نہج پر خود مدینہ میں مخالفت روز بروز بڑھتی چلی گئی جس کی گونج مفتوحہ علاقوں تک پہنچ رہی تھی، جس سے اطرافِ ملک کے مخالفین کی سختی اور جرأت میں اضافہ ہوتا تھا۔ آخر تنگ آکر

حضرت عثمانؓ نے اپنے ان مخالفین پر سختی کرنا شروع کی۔ دھمکایا بھی، ڈرایا بھی، اور کبھی بے قابو ہوکر کسی مخالف کو زدوکوب بھی کر بیٹھے۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ ۳۴ھ میں لوگوں کی طرف سے حضرت عثمانؓ کی مخالفت بہت بڑھ گئی، ان کے ساتھ وہ ناروا سلوک کئے گئے جو کسی کے ساتھ روا نہیں رکھے جاتے۔ اصحاب رسولؐ یہ سب کچھ دیکھتے اور سُنتے تھے۔ لیکن ایک نہایت ضعیف سی جماعت کے سوا جو زید بن ثابتؓ۔ ابو اُسید الساعدیؓ، کعب بن مالکؓ۔ اور حسان بن ثابتؓ پر مشتمل تھی کوئی بھی نہ تو ان مخالفوں کو منع کر رہا تھا نہ خلیفہ کی حفاظت و مدافعت کر رہا تھا۔ بلکہ مدینہ میں مقیم صحابہ ان اصحاب رسولؐ کو جو سرحدی علاقوں میں منتشر تھے لکھ رہے تھے کہ مدینہ میں واپس آجایئے تاکہ خلافت کے معاملہ میں جو بل پڑ گئے ہیں انھیں نکالا جائے یہ لوگ ان کو یہ بھی لکھتے تھے کہ آپ لوگ جہاد کی جستجو میں نکل کھڑے ہوئے حالانکہ میدانِ جہاد آپ کے پیچھے ہے (یعنی مدینہ میں) دین کی سلامتی اور حفاظت کی خاطر مدینہ کی خاطر لوٹ آؤ کیونکہ اقتدار نے دین کو ایک بہت بڑے فساد کی نذر کر دیا ہے۔

اسی دوران میں ایک دفعہ لوگوں نے ایک جگہ جمع ہوکر ان حادثات و مصائب پر باہم گفتگو کی اور حضرت عثمانؓ کو بُرا بھلا کہا۔ پھر حضرت علیؓ کو آمادہ کیا کہ وہ حضرت عثمانؓ کے پاس جائیں اور ان سے کچھ کہیں سنیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ

لوگوں کی طرف سے حضرت عثمانؓ کے پاس حضرت علیؓ کی نمائندگی

حضرت عثمانؓ سے ملے اور کہا مجھے لوگوں نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے انھوں نے آپ کے بارے میں مجھ سے بہت کچھ کہا ہے۔ بخدا میں نہیں جانتا کہ آپ سے کیا کہوں۔ کوئی ایسی چیز میں نہیں جانتا جس کا آپ کو علم نہ ہو۔ نہ میں کسی ایسے معاملے کی طرف توجہ دلا سکتا ہوں جس سے آپ بے خبر ہوں۔ جو ہم جانتے ہیں وہ آپ پر بھی روشن ہے ہمیں کسی چیز کے بارے میں آپ پر سبقت حاصل نہیں کہ آپ کو مطلع کریں۔ کوئی بات ایسی نہیں جو صرف ہم تک محدود رکھی گئی ہو کہ ہم اسے آپ تک پہنچائیں۔ غرض کسی معاملے میں بھی آپ کو چھوڑ کر ہمیں کوئی خصوصیت نہیں بخشی گئی۔ آپ نے رسولِ خدا کو دیکھا۔ ان کی باتیں سنیں۔ ان کی صحبت میں رہے۔ آپ کو ان کی دامادی کا شرف بھی حاصل ہے۔ عمل حق میں حضرت ابوبکرؓ کو یا عمل خیر میں حضرت عمرؓ کو آپ پر کوئی فضیلت نہ تھی۔ رشتہ کو دیکھا جائے تو آپ رسولِ خدا سے قریب تر ہیں۔ کیونکہ آپ کو ان کی دامادی کا شرف حاصل ہے جو حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو حاصل نہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی وہ آپ سے کسی معاملہ میں فائق نہ تھے۔ لہٰذا، اے عثمانؓ! اپنے بارے میں خدا کا خوف کیجئے۔ بخدا آپ نابینا نہیں کہ آپ کو بصارت دی جائے آپ نادان نہیں کہ آپ کو دانش عطا کی جائے۔ راہ واضح اور روشن ہے، دین

کی حدود و علامات قائم ہیں۔ جان لیجئے اے عثمانؓ! کہ خدا کے نزدیک اس کا سب سے برگزیدہ بندہ امام عادل ہے جس نے ہدایت پائی اور ہدایت دی، جو سنتِ معروفہ کو قائم رکھے، اور ہر بدعت متروکہ کا قلع قمع کرے، بخدا سب کچھ عیاں ہے۔ سنت کے اپنے حدود علامات ہیں اور بدعتوں کے اپنے۔ یہ بھی جان لیجئے کہ خدا کے نزدیک بدترین انسان وہ جور پیشہ امام ہے جو خود گمراہ ہو اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے۔ اور جس نے سنتِ معروفہ کا قلع قمع کر کے بدعت متروکہ کو حیاتِ نو بخشی۔ میں نے رسولؐ خدا کی زبانی سنا ہے کہ قیامت کے روز ایک ظالم و جائر امام کو پیش کیا جائے گا جس کا نہ کوئی مددگار ہوگا نہ عذر خواہ۔ چنانچہ اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ پھر وہ جہنم میں اسی طرح گرداں رہے گا جیسے چکی۔ یہاں تک کہ جہنم کے کنڈ میں غرق ہو جائے گا۔ میں آپ کو خدا کا خوف دلاتا ہوں۔ اس کے جلال و انتقام سے ڈراتا ہوں۔ اس کا عذاب بڑا شدید اور المناک ہے۔ میں آپ کو خوف دلاتا ہوں کہ مبادا اس امت کے امام مقتول آپ ہی ہوں کیونکہ کہا گیا ہے کہ اس امت کا ایک امام قتل ہوگا اور اس کے قتل سے امت میں کشت و خون کا جو سلسلہ شروع ہوگا وہ تاقیامت جاری رہے گا اس قتل کی وجہ سے اُمت کے معاملات مشکوک اور مشتبہ ہو جائیں گے۔ گروہ بندیاں ہوں گی اور لوگ باطل کے تسلط کی وجہ سے حق کو پہچان ہی نہ سکیں گے اور تاابد اسی حق و باطل کی کشمکش میں حیران و سرگرداں رہیں گے[1]۔

نہیں معلوم کہ بیان کردہ گفتگو ہو بہو وہی ہے جو حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ سے کی یا ان مطالب کو اپنے الفاظ میں ڈھالا گیا ہے۔ بہرحال اہم چیز یہ ہے کہ مدینہ میں مخالفت و تنقید انفرادی حدود سے بہت آگے نکل گئی تھی جن میں اکا دکا متفرق مقامات پہ اعتراضات و مخالفتیں ہوتی ہیں جو دیرپا نہیں ہوتیں اور جلد رفع دفع ہو جاتی ہیں۔ بلکہ اس کے برخلاف یہ مخالفت ایک اجتماعی اور منظم شکل اختیار کر چکی تھی جس کی زد اب براہِ راست خلیفہ پہ پڑتی تھی۔ اب خلیفہ کے طرزِ عمل اور ان کی سیاست کے خلاف جو اعتراض بھی ہوتا وہ ان تک پہنچا دیا جاتا اس کے بعد اس کے ردعمل کا انتظار کیا جاتا، گویا ہماری آج کی بولی میں یہ مخالفت سلبی حیثیت سے نکل کر ایجابی شکل اختیار کر گئی تھی۔ بہرحال حضرت عثمانؓ نے مخالفین کے نمائندہ کی گفتگو سنی اور جواباً کہا " بخدا، مجھے علم تھا کہ یہ لوگ وہی کچھ کہتے ہیں جو آپ نے کہا۔ خدا کی قسم اگر آپ میری جگہ ہوتے تو نہ میں آپ کے ساتھ یہ درشتی روا رکھتا نہ آپ کا ساتھ چھوڑتا۔ نہ آپ کی عیب جوئی کرتا اور بھلا بتائیے کہ صلہ رحمی کر کے ضرورتمند کی حاجت روائی کر کے، بے سہارے کو پناہ دے کر میں نے کون سا نازیبا اور منکر کام کیا ہے؟ میں نے اسی قسم کے لوگوں کو

---

[1] اگر یہ بیان کسی روایت پہ مبنی ہے جسے رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو وہ روایت یقیناً وضعی ہوگی۔ اس لئے کہ علم غیب خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔

والی بنایا جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بناتے تھے۔ علیؓ! میں تمھیں خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کیا آپ جانتے ہیں کہ مغیرہ بن شعبہؓ اس طرح کے نہ تھے؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا "بجا ہے"۔ حضرت عثمانؓ نے کہا "آپ کو معلوم ہے کہ انھیں حضرت عمرؓ نے متعین کیا تھا؟ حضرت علیؓ نے کہا "بجا ہے"۔ حضرت عثمانؓ نے کہا "تو پھر عبداللہ بن عامر کی تولیت پر آپ لوگ مجھے اقربا نوازی کا الزام لگا کر کیوں ملامت کرتے ہیں؟ حضرت علیؓ نے کہا "میں آپ کو بتاتا ہوں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ جسے بھی حاکم بناتے تھے اس کے سر پر سوار رہتے تھے۔ اگر ایک حرف بھی ان کے خلاف انھیں معلوم ہوتا تھا تو فوراً جواب طلبی کرتے اور پھر انہیں انتہا تک پہنچا کر دم لیتے تھے لیکن آپ ایسا نہیں کرتے۔ آپ کمزور ہیں اور اپنے اعزہ سے نرمی کا سلوک اور رعایت کرتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے کہا "وہ لوگ آپ کے بھی تو اعزہ ہیں"۔ حضرت علیؓ نے کہا "واقعی وہ لوگ میرے قریبی رشتہ دار ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دوسرے لوگ ان سے زیادہ صاحبِ فضیلت ہیں"۔ حضرت عثمانؓ نے کہا "کیا آپ کو معلوم نہیں کہ حضرت عمرؓ نے معاویہؓ کو اپنی تمام مدتِ خلافت حاکم مقرر رکھا۔ لہٰذا میں نے بھی انہیں بحال رکھا" اس پر حضرت علیؓ نے کہا "میں آپ کو خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جس قدر معاویہؓ حضرت عمرؓ سے ڈرتے تھے اتنا حضرت عمرؓ کا غلام یرفا بھی ان سے خائف نہ تھا؟" حضرت عثمانؓ نے کہا، ہاں، حضرت علیؓ نے کہا "لیکن معاویہؓ آپ سے مشورہ کئے بغیر خود ہی معاملات کا فیصلہ کر دیتے ہیں پھر آپ کو علم ہے کہ وہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ حضرت عثمانؓ کا حکم ہے۔ پھر جب معاملہ آپ تک پہنچتا ہے تو آپ معاویہؓ کی کارروائی میں کوئی تبدیلی نہیں کرتے"۔[1]

یہ مختصر سا مکالمہ[2] جہاں اس ناگواری اور ناپسندیدگی کی صحیح ترین تصویر ہے جسے حضرت عثمانؓ کے خلاف مدینہ میں محسوس کیا جا رہا تھا۔ وہاں اس امر کی بھی صحیح ترین تصویر ہے کہ اس مخالفت کا حضرت عثمانؓ کیا جواب دیا کرتے تھے۔ مخالفین کو جو امر ناگوار اور قابلِ اعتراض معلوم ہوتا تھا وہ تھا حضرت عثمانؓ کا اموال و مناصبِ حکومت کے معاملہ میں "اقربا نوازی" نیز ان عمال سے جو ان کے اعزہ بھی تھے محاسبہ میں رعایت اور ڈھیلی گرفت کرنا، حضرت عثمانؓ نے اس کا جواب یہ دیا کہ انھوں نے ایسا صلہ رحمی، حاجتمند کی حاجت روائی، خانماں برباد کو پناہ بخشی کے لئے کیا ہے، نیز یہ کہ عمال کے انتخاب میں وہ حضرت عمرؓ کے طریق کار پر کاربند رہے ہیں جضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو حضرت عمرؓ نے عامل مقرر کیا تھا۔ اسی طرح حضرت معاویہؓ کو بھی حضرت عمرؓ نے اپنے تمام دورِ خلافت میں عامل رکھا۔ اس کا جواب حضرت علیؓ نے یہ دیا کہ حضرت عمرؓ اپنے

---

[1] تاریخ طبری ۳۴ھ کے حادثات۔

[2] اس قسم کے مکالمات کی بالآخر اتھارٹی کیا ہے؟ تاریخ تو دوسو سال بعد بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے مرتب کی گئی تھی

عمال پر بڑی کڑی نگاہ رکھتے تھے اور اگر ان سے ذرا سی بھی غلطی ہوتی تھی تو فوراً اس پر سخت گرفت کرتے تھے۔ نیز یہ کہ معاویہؓ حضرت عمرؓ سے اس درجہ ڈرتے تھے کہ خود حضرت عمرؓ کا غلام یرفاء بھی ان سے اتنا خائف نہ تھا۔ دونوں بزرگ کسی متفقہ فیصلہ پر پہنچے بغیر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ البتہ حضرت عثمانؓ کو حضرت علیؓ کے اس رویہ سے رنج پہنچا کہ انھوں نے ان کا ساتھ چھوڑ کر انہیں قصوروار ٹھہرایا اور ان پر نکتہ چینی کی۔ حالانکہ ان کا فرض یہ تھا کہ وہ باہمی قرابت کا لحاظ کرتے۔ پھر حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ کے ساتھ اپنی اس گفت و شنید ہی کو کافی نہ سمجھا بلکہ خود جملہ مخالفین سے اجتماعی شکل میں خطاب کرنے کا ارادہ کیا تاکہ انھیں ڈرائیں دھمکائیں۔ چنانچہ وہ گھر سے نکل کر منبر پر تشریف فرما ہوئے اور لوگوں سے خدا کی حمد و تعریف کے بعد یہ خطاب کیا: " مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ ہر شے کے لئے ایک آفت ہے اور ہر معاملہ

حضرت عثمانؓ کی سخت ترین تقریر

کے لئے ایک بربادی مقرر ہے۔ اس اُمت کی آفت اور اس نعمت کی بربادی وہ عیب چین اور زبان دراز لوگ ہیں جو تمہارے سامنے تمہاری پسندیدہ باتوں کو برملا بیان کرتے ہیں اور جو تمہاری ناپسندیدہ باتوں کو تم سے چھپاتے ہیں وہ برابر بولتے چلے جاتے ہیں۔ مگر ان لوگوں کی مثال شتر مرغوں کی سی ہے جو پہلی آواز پر ایک کے پیچھے ایک اندھا دھند بھاگتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا محبوب گھاٹ وہ ہوتا ہے جو دور ہو، ہمیشہ گدلے پانی پر اُترتے ہیں۔ ان کا کوئی نگہبان اور ناظم امور نہیں ہوتا، ایسے لوگ معاملات کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور ان کے لئے روزی کے ذرائع مسدود ہو جاتے ہیں۔ یاد رکھو بخدا تم مجھے ایسا کام کرنے پر مورد طعن و الزام بنا رہے ہو جس پر حضرت عمرؓ کو تم نے کچھ نہ کہا، اس لئے کہ حضرت عمرؓ نے تمہیں اپنے پاؤں تلے روندا۔ اپنے ہاتھوں سے مارا اور زبان سے تمہیں ٹوکا اور تنبیہ کی، لہٰذا، تم نے طوعاً و کرہاً اطاعت کی، لیکن چونکہ میں نے تمہارے ساتھ نرمی کا سلوک کیا تمہاری عزت افزائی کی، اپنے ہاتھ اور زبان سے تمہیں کوئی ایذا نہ پہنچائی، لہٰذا، تم میرے سر پر چڑھ گئے اور گستاخ ہو گئے۔ بخدا میں لوگوں اور قبیلوں میں سب سے بلند مرتبہ ہوں میرے حامی و مددگار بہت قریب اور تعداد میں کثیر ترین ہیں اور میری ایک آواز اس قابل ہے کہ اس پر لوگ میری طرف آ جائیں؛ میں نے تمہارے لئے تمہارے مدِّمقابل تیار کر رکھے ہیں بلکہ اور بھی کچھ زیادہ کا بندوبست کر رکھا ہے۔ تم نے میرا مزاج بگاڑ دیا، اور مجھے ایسے اخلاق اور ایسی گفتگو کرنے پر مجبور کیا جو میری طبیعت پسند نہیں کرتی۔ دیکھئے اپنے والیوں کے خلاف زبان طعن دراز کرنے اور ان پر نکتہ چینی کرنے اور عیب لگانے سے باز آئیے۔ میں نے تم سے ایسے شخص کو دور کر رکھا ہے کہ اگر وہ تم سے بات کرتا تو جو کچھ وہ کہتا تم اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے اور مجھے اس تقریر کی ضرورت ہی لاحق نہ ہوتی۔ مجھے بتاؤ تو سہی تمہارا کون سا حق مارا گیا ہے؟ بخدا میں نے اپنی طرف سے ان امور تک پہنچنے میں کوئی کوتاہی

نہیں کی جن تک میرا پیش رو پہنچا تھا، وہ شخص جس کے کاموں پر تم کوئی اختلاف نہیں کرتے تھے، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ مال و دولت کا ایک حصہ تقسیم کے بعد بچ گیا، تو اس میں کون سا امر مانع ہے کہ میں اس فاضلہ دولت سے جو چاہوں کروں، ورنہ پھر میرے امام ہونے کے کیا معنی ہیں؟" اس موقع پر مروان بن حکم نے کچھ کہنا چاہا حضرت عثمانؓ نے اسے یہ کہتے ہوئے ڈانٹ دیا "خاموش! میرے اور میرے ساتھیوں کے معاملہ میں دخل نہ دو، اس موقع پر تمہارا بولنا کیا معنے رکھتا ہے؟ کیا میں نے تمہیں پہلے نہ کہہ دیا تھا کہ تم کوئی بات نہ کرنا[1]؟"

یہ حضرت عثمانؓ کے تمام عہدِ خلافت میں ان کا سب سے زیادہ سخت خطبہ ہے انہیں خود بھی اس امر کا احساس تھا، چنانچہ اپنی نرم طبیعت اور خوش خلقی کی بنا پر انھوں نے ہلکی سی معذرت بھی پیش کر دی کہ "تم نے مجھے ایسے اخلاق اور ایسی گفتگو پر مجبور کر دیا جو میری افتادِ طبع کے خلاف ہے"۔ علاوہ بریں ابھی وہ اپنی تقریر ختم بھی نہ کر پائے تھے کہ حسبِ معمول وہ اپنی شگفتگی و خوش خلقی کی جانب لوٹ آئے۔ اور مروان سے کہا "میرے اور میرے ساتھیوں کے معاملہ میں دخل نہ دو" جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے مخالفین سے نہیں ساتھیوں سے باتیں کر رہے تھے۔ اور اگر انہوں نے کوئی سخت کلامی کی بھی تو اس لئے کہ ان کے ساتھیوں نے تشدد کر کے انہیں بد مزاج کر دیا تھا۔ بہر حال حلیم حلیم ہی رہتا ہے گو تھوڑی دیر کے لئے اس پر غصہ کی کیفیت طاری ہو جائے۔

الغرض حضرت عثمانؓ کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ ان کے ساتھی نکتہ چینیوں اور طعنہ بازوں کی گفتگو پر کان دھریں جن کا شیوہ برملا تو لوگوں کی پسندیدہ باتیں کرنا تھا لیکن دل میں ان کے جو باتیں تھیں وہ ناپسندیدہ تھیں یہ لوگوں کو ان کے امام کے خلاف بہکا رہے تھے اور کچھ ایسی چیزوں کا لالچ دے رہے تھے جن کے حصول کی کوئی صورت نہ تھی۔ حضرت عثمانؓ نے اپنی اس تقریر میں اس خاص گروہ کی طرف اشارہ کیا جسے وہ مخالفت کی جڑ سمجھتے تھے، اور جس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہی افراد اپنے مقاصد دیرینہ کی برآری کے لئے ان کے خلاف لوگوں کو ابھارتے اور برانگیختہ کرتے تھے ظاہر ہے کہ یہ وہی افراد ہوں گے جنھیں حضرت عثمانؓ خلافت کے بارے میں اپنا رقیب و حریف گمان کرتے تھے، اور جو اپنی خلافت کے متمنی و خواہاں تھے، عین ممکن ہے کہ ان کا اشارہ اہلِ شوریٰ کے بقیہ ارکان کی طرف یا عمار بن یاسرؓ جیسے مہاجرین و انصار کی طرف ہو جو ان کے خلاف نکتہ چینی اور اعتراضات کرنے میں لگے رہتے تھے۔

دوسری بات جو حضرت عثمانؓ نے کہی یہ تھی کہ لوگ ان کی ایسی کارروائیوں پر اعتراضات کرتے ہیں جو حضرت عمرؓ نے

---

[1] تاریخ طبری ۳۴ھ کے واقعات و حوادث۔

اپنے زمانہ میں کہیں اور کسی نے ان کے خلاف آواز نہ اٹھائی اس لئے کہ لوگ حضرت عمرؓ کی سخت گیری سے خائف رہے۔ لیکن چونکہ وہ (عثمانؓ) نرم خو تھے لہٰذا لوگ ان کے خلاف بولنے کی جرأت کرنے لگے۔ بعدازاں حضرت عثمانؓ اپنے ساتھیوں اور دوسرے مخالفوں کو جو ان کے خلاف لوگوں کو ورغلاتے اور بھڑکاتے ہیں ڈراتے اور دھمکاتے ہوئے بتاتے ہیں کہ قبیلہ کے اعتبار سے وہ سب سے قوی تر ہیں۔ ان کے مددگار سب سے قریب اور تعداد میں سب سے زیادہ ہیں وہ سب سے زیادہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی آواز پر لوگ لبیک کہیں۔ کوئی شک نہیں کہ اس دھمکی کا روئے سخن حضرت عثمانؓ کے ان حریفوں کی طرف ہے جو قوت و دبدبہ کے اعتبار سے حضرت عثمانؓ کی ٹکر کے نہ تھے۔ بلاشبہ بنو اُمیہ قریش کے باقی تمام قبائل کے مقابلے میں افراد و تعداد کی رو سے سب سے زیادہ قوی تھے اور ان کے مددگار سب سے زیادہ تھے اس کے بعد پلٹ کر وہ اپنے ساتھیوں سے سوال کرتے ہیں کہ آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟ ان کا اعتراض کیا ہے، انہیں غصہ کس بات کا ہے؟ جبکہ

اموالِ عامہ کے متعلق حضرت عثمانؓ کا خیال

وہ سب کا حق پورا پورا ادا کر رہے ہیں، جہاں تک حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پہنچے تھے اس تک پہنچنے میں ان سے کوتاہی نہیں ہو رہی ہے۔ اس کے بعد وہ خطبہ کا رُخ اموالِ عامہ کی طرف پھیرتے ہوئے کہتے ہیں، مال و دولت کا ایک حصہ تقسیم کے بعد بچ گیا تو اس میں کون سا امر مانع ہے کہ میں اس فاضلہ دولت سے جو چاہوں کروں، ورنہ پھر میرے امام ہونے کے کیا معنی ہیں؟" ان کا مطلب یہ ہے کہ جب بیت المال سے تمام مسلمانوں کا حق ادا کر چکنے کے بعد کچھ بچ جائے تو انھیں اس بقیہ مال کو حسبِ منشا خرچ کرنے کا پورا پورا اختیار ہے اور یہ اختیار انھیں امامت کے عہدہ سے ملا ہے۔ لہٰذا کسی کو اس ضمن میں اعتراض یا بحث و جدال کرنے کا حق نہیں۔

گویا حضرت عثمانؓ اور ان کے مقابلوں کے مابین یہ پہلا مقابلہ — ہماری نئی اصطلاح کے مطابق۔ ہار جیت کے بغیر برابر رہا۔ مخالفین نے پہلے اعتراضات کئے پھر اپنے اعتراضات کی ایک منظم شکل بنائی۔ پھر اسے خلیفہ تک پہنچا دیا حضرت عثمانؓ نے ان کے اعتراضات کی تردید کی پھر ان سے خطاب کرتے ہوئے انہیں ڈرایا دھمکایا اور سخت ہو گئے آخر میں قدرے نرمی اختیار کی لیکن اپنے مؤقف سے سرِمو انحراف نہ کیا اسی طرح مخالفین بھی اپنے مؤقف پر اڑے رہے اور ذرا بھی ادھر اُدھر نہ ہوئے۔ تاہم جو حادثات و واقعات رونما ہو رہے تھے وہ حضرت عثمانؓ اور ان کے حریفوں سے بھی زیادہ طاقتور تھے۔ مخالفین نے اپنے اعتراضات کی روش کو جاری رکھا، اسی دوران میں حضرت عثمانؓ کے پاس ملک کے اطراف سے خبریں آنے لگیں کہ وہاں کی مخالفتوں نے جو شکل اختیار کی ہے وہ کسی طرح بھی مدینہ والوں کی مخالفت سے کم ترحیثیت نہیں رکھتی، حضرت عثمانؓ حضرت عمرؓ کے طریق کار کا اتباع کرتے تھے۔ لہٰذا، انھوں نے اپنے دورِ خلافت میں دو مرتبہ کے سوا

ہر سال خود حاجیوں کی قیادت کی۔ پہلے سال تو وہ بیماری کی وجہ سے معذور تھے، اور آخری سال وہ محصور تھے۔ وہ حج کے موقع پر اپنے تمام عمال سے مل کر کچھ ان سے سُنتے کچھ اپنی کہتے۔ چنانچہ جب ۳۴ھ میں وہ اپنے عمال سے ملے تو سب کو مشورہ کے لئے جمع کیا۔ راویوں کا یہ بیان ہے کہ اس مشورہ میں حضرت عمرو بن العاصؓ بھی شریک تھے مگر مجھے اس میں شبہ ہے۔ کیونکہ عمرو بن العاصؓ ۳۴ھ میں حضرت عثمانؓ کے عامل نہ تھے اور پھر یہ کہ جب سے حضرت عثمانؓ نے انھیں مصر کی حکومت سے معزول کیا تھا انھیں حضرت عثمانؓ سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ راویوں نے عمرو بن عاصؓ کا نام اس مشورہ میں اس لئے شامل کر لیا کہ حضرت عثمانؓ کے لئے، ان کی حیرت انگیز چالبازی و حیلہ سازی کا نقشہ بھی سامنے لے آئیں[1]۔

حضرت عثمانؓ کا اپنے عمال کے ساتھ مشورہ

گمان غالب یہ ہے کہ اس مجلسِ شوریٰ میں ان کے چار بڑے عامل ہی شامل ہوئے تھے جو مملکت کے اہم صوبہ جات کی حکومت پر فائز تھے اور وہ تھے حضرت معاویہؓ۔ عبداللہ بن ابی سرح۔ عبداللہ بن عامر۔ اور سعید بن العاص۔ جب یہ سب حضرات ایک جگہ جمع ہو گئے تو حضرت عثمانؓ نے ان سے کہا "ہر امام کے وزیر ہوتے ہیں اور میرے وزیر آپ لوگ ہیں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ کس طرح میری دشمنی پر اتر آئے ہیں اور کس قدر پر زور مطالبہ کر رہے ہیں کہ میں اپنے عمال کو معزول کر دوں، آپ اس فتنہ سے بے خبر نہیں جو اپنا سر اٹھا رہا ہے۔ آپ لوگ مجھے مشورہ دیجئے کہ اس صورت حال کا کیونکر مقابلہ کیا جائے"۔

حضرت معاویہؓ نے تو اس سے زیادہ کچھ نہ کہا کہ عمال کو ان کے صوبہ جات میں واپس بھیج دیا جائے اور ان کے ذمے مخالفین سے نجات عہدہ برآ ہونے کا فریضہ ڈال دیا جائے، اور اس بات کی ضمانت لی جائے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے صوبہ کو پوری طرح سنبھال کر حزم و احتیاط سے اپنا فریضہ انجام دے گا اور خلیفہ کو اپنے علاقہ کے لوگوں کی طرف سے مطمئن رکھے گا۔

حضرت سعید بن العاصؓ نے یہ مشورہ دیا کہ قائدین مخالفت اور زعمائے فتنہ کو قتل کر دیا جائے۔ عبداللہ بن سرح نے یہ کہا کہ ان لوگوں کو خوش کر لیا جائے اور بیت المال سے روپیہ کا لالچ دے کر انہیں اپنا ہمنوا بنا لیا جائے، عبداللہ بن عامر نے یہ مشورہ دیا کہ لوگوں کو جہاد پر بھیج کر جنگوں میں مصروف کر دیا جائے اور پھر انہیں دیر تک سرحدی علاقوں ہی میں رکھا جائے اور یہی رائے حضرت عثمانؓ کو پسند آئی۔ چنانچہ انھوں نے عمال کو ان کے صوبہ جات میں واپس بھیج دیا اور انہیں حکم دیا کہ بطریقِ احسن حکومت کریں حقوق اللہ کے معاملہ میں سختی سے کام لیں۔ رعیت کے معاملات حزم اور مستعدی کے ساتھ انجام دیں اور انھیں جہاد پر بھیج دیں اور جس سے کجی یا انحراف رونما ہو اس کا وظیفہ بند کر دیں۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ مدینہ

[1] اس سے ان راویوں کی ثقاہت واضح ہو جاتی ہے جن کی روایات سے تاریخ مرتب ہوئی تھی

مدینہ میں مخالفین کے ساتھ حضرت عثمانؓ کا مشورہ

لوٹ آئے۔ حضرت معاویہؓ بھی شام جانے کے لئے ان کے ہمراہ تھے مدینہ پہنچ کر حضرت عثمانؓ نے ایک مجلس منعقد کی جس میں حضرت معاویہؓ کے علاوہ بہت سے صحابہ کرامؓ جن میں حضرات علیؓ، طلحہؓ، زبیرؓ اور سعدؓ بھی شریک تھے، سب سے پہلے حضرت معاویہؓ نے مجلس کو خطاب کیا۔ انھوں نے حاضرین مجلس کو بزرگ و معمر خلیفہ کے ساتھ تعاون و حسن سلوک کی ہدایت کی اور انہیں فتنہ و افتراق کے نتائج سے متنبہ کیا۔ اس انتباہ میں قدرے دھمکی بھی ملی جلی تھی۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کو ٹوک دیا۔ جس پر دونوں میں خاصی جھڑپ بھی ہوگئی۔ پھر حضرت عثمانؓ نے بڑے حلم اور نہایت نرمی سے اپنی تقریر شروع کی اور بتایا کہ وہ اس روش پر گامزن ہوں گے جس کا وہ لوگ انھیں مشورہ دیں گے۔ اس پر ان سے کہا گیا کہ آپ نے فلاں فلاں کو جو کچھ دیا ہے وہ واپس لے لیں۔ حضرت عثمانؓ نے ان کا مطالبہ پورا کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اس پر وہ لوگ راضی ہوگئے۔ چنانچہ یہ محفل ایک حد تک خوشگوار جذبات کے ساتھ برخواست ہوئی، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فریق مخالف بہر صورت ایک طرح سے فائدہ میں رہا کیونکہ حضرت عثمانؓ نے اُن کے زعماء سے مشورہ لیا اور ان کے بعض مطالبات کو مان بھی لیا۔

حضرت معاویہؓ نے دوبارہ پھر مہاجرین کو بزرگ و معمر خلیفہ کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے کی ہدایت کی اور بار دگر انتباہ و عقوبت کا احساس دلا کر چلے گئے۔ لوگوں میں یہ چرچا عام تھا کہ ۳۵ھ لوگوں کے لئے ایک قسم کے سکون و عافیت

کوفہ میں بغاوت

کا پیغام لے کر آئے گا۔ لیکن اہل کوفہ نے بغاوت کر کے اپنے والی سعید کو جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے واپس کر دیا۔ اور مطالبہ کیا کہ ابو موسیٰ اشعریؓ کو ان کا حکم مقرر کیا جائے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کو مجبوراً اُن کا مطالبہ ماننا پڑا۔ یہ گویا پہلا فتنہ تھا جسے اہل کوفہ نے دوسرے صوبہ جات کے لئے بطور نمونہ پیش کیا اور فوراً ہی دوسرے علاقوں نے بھی ان کا اتباع کیا اور لوگوں پر یہ راز منکشف ہوگیا کہ بغاوت ہی ایک ایسا راستہ ہے جس پر گامزن ہو کر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے مصریوں نے بھی اہل کوفہ کی روش اختیار کر لی اور اچانک ماہ رجب ۳۵ھ میں ایک بہت بڑا

مصری وفد کی مدینہ میں پہلی بار آمد

وفد بھیج دیا جو بظاہر تو عمرہ کی نیت سے جا رہا تھا لیکن آگے چل کر وہ عازم مدینہ ہوگیا۔ جہاں پہنچ کر اس نے ظاہر یہ کیا کہ وہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ ان کی سیاسی حکمتِ عملی اور عمال کی تقرری کی پالیسی پر مباحثہ کرنا چاہتا ہے۔ راویوں میں باہم اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ سے ان کی ملاقات مدینہ سے باہر ایک گاؤں میں ہوئی۔ یہاں انھوں نے حضرت عثمانؓ

سے بحث وتمحیص کی اور قرآن کو اپنے اور حضرت عثمانؓ کے درمیان ثالث بنایا۔ چنانچہ بہت سے معاملات میں حضرت عثمانؓ نے انہیں تسلی بخش جواب دے کر مطمئن کر دیا۔ اسی طرح بہت سی باتوں میں ان لوگوں نے حضرت عثمانؓ کو قائل کر لیا جس پر حضرت عثمانؓ نے معذرت پیش کی اور آیندہ احتیاط کا وعدہ کیا۔ بعض راوی یہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے مہاجرین کی ایک جماعت کو ان کے پاس بھیجا تھا جس میں حضرت علیؓ اور محمد بن مسلمہ انصاریؓ بھی تھے اور انھیں اپنی جانب سے یہ عہد دیا کہ وہ جو فیصلہ کر آئیں گے اس پر عمل کیا جائے گا۔ چنانچہ ان سفیروں نے اہلِ وفد سے ملاقات کر کے انھیں سمجھا بجھا کر راضی کر لیا۔ پھر وہ ان میں سے چند آدمیوں کا وفد بنا کر حضرت عثمانؓ کے پاس لائے جہاں حضرت عثمانؓ نے بھی اس عہد کی تصدیق وتائید کی، اس کے بعد حضرت عثمانؓ باہر تشریف لائے اور لوگوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے

حضرت عثمانؓ کا رقت انگیز خطبہ

اہلِ وفد کی تعریف کی اپنی فروگذاشتوں پر اظہارِ پشیمانی کیا۔ خدا سے مغفرت چاہی۔ خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رُلایا، جس سے لوگوں کے دل بزرگ ومعمر خلیفہ کے لئے گداز ہو گئے اور مصری خوشی خوشی واپس چلے گئے۔ راویوں کا قول ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اس خطبہ کے آخر میں یہ بھی کہا تھا کہ "جب کوئی آفت پڑے تو اپنے بہترین نمایندے میرے پاس بھیج دیں۔ کوئی ظلم ایسا نہ ہو گا جسے میں رفع نہ کر دوں اور کوئی حاجت ایسی نہ ہو گی جسے میں پورا نہ کروں"۔ لیکن جونہی وہ گھر پہنچے مروان نے انہیں

مروان کی مداخلت اور اُس کی تاثیر

ہر اس چیز سے منحرف کر دیا جس کا وہ عہد دے چکے تھے اور باہر نکل کر بڑی سختی اور ترش روئی کے ساتھ لوگوں کو گھر کی چار دیواری کے گرد سے دور ہٹایا۔ بہرحال مسلمہ امر یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ اس معاہدہ کے بعد نیز وفد کی دل جوئی اور اس کے سامنے اظہارِ پشیمانی سے لوگوں کے دل جیت سکتے تھے اور انہیں اطاعت، محبت اور اُمیدِ خیر کے نقطہ پر مرتکز کر سکتے تھے۔ لیکن دن پر دن گذرتے گئے اور حضرت عثمانؓ نے نہ تو کسی عامل کو معزول کیا اور نہ تغیر وتبدل کا کوئی وعدہ پورا کیا۔

ابھی اس سال کا ماہ شوال بھی شروع نہ ہوا تھا کہ مصری دوبارہ نکل کھڑے ہوئے، روایات کے مطابق ان کی

مصری وفد کی دوبارہ آمد

کم از کم تعداد چھ سو اور زیادہ سے زیادہ ایک ہزار تھی۔ عین اسی وقت کچھ لوگ کوفہ وبصرہ سے بھی نکل کھڑے ہوئے۔ لوگوں نے جب دیکھا کہ خلیفہ نے وہ وعدے ایفا نہیں کئے جن کے ایفا کا ان سے عہد وپیمان کیا تھا تو انھوں نے مایوس ہو کر مخالفت میں نکلنے کے لئے باہم

حضرت علیؓ اور حضرت محمد بن مسلمہؓ انصاری کا دوبارہ درمیان میں پڑنے سے انکار

وقت مقرر کر لئے جب یہ لوگ مضافاتِ مدینہ

میں پہنچے تو حضرت عثمانؓ کو ان کی آمد کا علم ہوا۔ لہٰذا، انھوں نے حضرت علیؓ اور محمد بن مسلمہؓ انصاری کو ان کے پاس بھیجنا چاہا۔ حضرت علیؓ نے تو انکار کر دیا۔ محمد بن مسلمہؓ نے جواب دیا کہ ایک ہی سال میں خدا کے ساتھ دو مرتبہ جھوٹ نہیں بولوں گا، بایں ہمہ اہلِ مدینہ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ مدینہ پر دوسرے لوگ چڑھ آئیں لہٰذا، وہ ان باہر سے آنیوالوں

صحابۂ کرام کی طرف سے مدافعتِ مدینہ کی تیاری

کو روکنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مصری، بصری اور کوفی وفد آگے بڑھتے چلے آئے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ حضرت علیؓ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ میں سے ہر ایک اپنے رفقاء کے ساتھ مقابلہ کے لئے مورچہ لگائے ہوئے ہے اور وہ دار الہجرت میں کسی کا جبراً داخلہ گوارا نہیں کرتے تو وہ پلٹ گئے اور انھوں نے ایسا ظاہر کیا گویا وہ اپنے اپنے علاقوں

باغیوں کی چال بازی

کی طرف واپس جا رہے ہیں اور مضافاتِ مدینہ سے اپنے مورچے اٹھا رہے ہیں، اور جب اہلِ مدینہ کو ان کی واپسی کا یقین ہو گیا تو وہ بھی اپنی روزمرّہ کی زندگی میں مصروف ہو گئے۔ پھر جس چیز نے انھیں حیران و سراسیمہ کر دیا وہ نعرۂ تکبیر کی گونج تھی جس نے سارے مدینہ کو سر پر اٹھا لیا اور اس وقت انہیں معلوم ہوا کہ ان لوگوں کی واپسی محض ایک چال تھی جس سے وہ اہلِ مدینہ کو اس طرف سے غافل کر دینا چاہتے تھے اور جب انھیں یقین ہو گیا کہ اہلِ مدینہ عافیت گزیں ہو گئے ہیں تو وہ پلٹ آئے اور مدینہ میں داخل ہو کر بغیر جنگ کے

مدینہ پر باغیوں کا قبضہ

شہر پر قبضہ کر لیا۔ ان کے نقیبوں نے یہ منادی کر دی" جو اپنے گھر میں رہے گا اسے امان حاصل ہے، اور جو ہمارے درپے آزار نہ ہوگا اسے امان حاصل ہوگی"۔ بعد ازاں ان لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر کے گرد گھیرا ڈال دیا۔

یہاں اس خط کا قصہ بھی سامنے آتا ہے جس کے بارے میں راویوں کا خیال ہے کہ وہ واپسی میں مصریوں کو ملا تھا

خط کا قصہ

لہٰذا، وہ وہیں سے پھر واپس مدینہ آ گئے، میرے خیال میں تو یہ قصہ سرے سے بے بنیاد اور من گھڑت ہے۔ اس ضمن میں سب سے بڑا ثبوت خود راویوں ہی کا یہ قول ہے کہ جونہی اصحابِ رسولؐ نے اس خط کے متعلق یہ سوال کیا کہ اہلِ بصرہ و کوفہ کو اس کا کیونکر علم ہو گیا کہ تم نے خط پکڑا ہے حالانکہ تم میں سے ہر گروہ اپنے اپنے علاقہ کی طرف چلا گیا تھا؟ تو وہ بے بس اور لاجواب ہو گئے اور انھوں نے کہا" اس بارے میں آپ جو چاہیں سمجھ لیں، ہمارا تو یہ فیصلہ ہے کہ ہمیں اس شخص (حضرت عثمانؓ) کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔ یہ ناقابلِ قبول اور غیر معقول بات ہے کہ حضرت عثمانؓ مسلمانوں کے ساتھ ایسی چال چلتے کہ ادھر تو وہ ان کی ایک جماعت کے ساتھ پیمانِ صلح باندھیں اور اُدھر ان کے عامل کے پاس پوشیدہ طور پر آدمی کے ہاتھ پیغام بھیج دیں کہ ان کی سخت گرفت کی جائے اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جائے۔ نہ یہ بات

قابل قبول اور معقول ہے کہ مروان خلیفہ کی طرف سے اتنی بڑی جرأت کر ڈالے کہ یہ خط لکھ کر اس پر خلیفہ کی مہر ثبت کر دے اور خلیفہ ہی کے غلام کو دے کر خلیفہ ہی کے اونٹ پر سوار کر کے روانہ کر دے یہ ایک حقیقی واقعہ سے زیادہ پُر از حماقت افسانہ ہے، معاملہ ان تکلفات سے زیادہ آسان ہے۔

سیدھی سی بات ہے کہ صوبہ جات کے لوگوں سے خلیفہ نے کچھ وعدے کئے جن سے وہ مطمئن ہو گئے۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ خلیفہ نے اپنے وعدے وفا نہیں کئے چنانچہ وہ بغاوت کے جذبہ سے سرشار آئے کہ اس جھنجھٹ ہی کو ختم کر ڈالیں اور بغیر معاملہ صاف کئے واپس نہ جائیں۔ مگر جب مدینہ کے قریب پہنچے تو وہاں اصحاب رسولؐ کو آمادۂ جنگ پایا اور ان سے لڑنا پسند نہ کیا، لہٰذا، اپنی چال کو کامیاب بنانے کے لئے پیچھے ہٹ گئے۔ پھر جب انھیں یہ یقین ہو گیا کہ وہ جنگ صحابہؓ ہتھیار اتار کر اپنے گھروں میں عافیت گزیں ہو گئے تو پلٹ آئے اور بغیر جنگ کئے مدینہ پر قابض ہو گئے۔

یہ لوگ صحابۂ کرامؓ سے نہ جنگ کرنا چاہتے تھے نہ انہیں قتل کرنا چاہتے تھے اور نہ اس بات کے خواہاں تھے کہ مدینہ کے گرد و نواح میں کوئی ایسی لڑائی لڑیں جو جنگِ اُحد یا جنگ احزاب کی یاد تازہ کر دے۔ ان کا مقصد تو یہ تھا کہ خلیفہ کا محاصرہ کر لیں اور جس قدر جلد ممکن ہو تو انھیں خلافت سے دست برداری پر مجبور کر دیں یا پھر انھیں قتل کر ڈالیں۔ چنانچہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے مدینہ میں گھس کر خلیفہ کا محاصرہ کر لیا۔

مجھے یقین سا ہے کہ خود اہلِ مدینہ میں بھی باغیوں کے حامی اور مددگار موجود تھے جنھوں نے انھیں بلایا تھا اور جو ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے جنھوں نے باغیوں کو اصحابؓ رسولؐ کے ارادہ سے آگاہ کیا تھا پھر انہیں یہ خبر بھی پہنچائی تھی کہ اب اہلِ مدینہ عافیت گزیں ہو چکے ہیں۔ پھر یہ لوگ باغیوں کے ساتھ حضرت عثمانؓ کے محاصرہ میں بھی شامل ہو گئے محاصرہ ابتداءً نرم تھا جو مدینہ پر قبضہ اور خانۂ حضرت عثمانؓ کے محاصرہ سے آگے نہ بڑھا تھا۔ خلیفہ کو گھر سے باہر آنے جانے کی اجازت تھی۔ وہ لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے اور خود باغی بھی ان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے[۱]۔ وہ لوگوں کو خطاب کر کے وعظ و نصیحت کرتے رہتے، اس اثنا میں دونوں طرف کے سفراء باہم صلح کی کوشش میں بھی سرگرم رہے۔ باغیوں کا مطالبہ تھا کہ حضرت عثمانؓ خلافت سے دستبردار ہو جائیں حضرت عثمانؓ کو انکار تھا کہ وہ اس قمیص کو جو انہیں خدائے عز و جل نے پہنائی ہے کیونکر اتار دیں۔

لیکن معاملات اچانک پیچیدہ و سنگین ہو گئے۔ باغیوں کو علم ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے عمال کو اپنی مدد اور محاصرین کو مدینہ سے باہر نکالنے کے لئے لشکر روانہ کرنے کا حکم بھیج دیا ہے اور اس خبر کے معلوم ہوتے ہی باغیوں کے محاصرہ میں شدت اور حضرت عثمانؓ کے ساتھ ان کے رویّہ میں نمایاں تغیر پیدا ہو گیا۔

---

۱ [illegible]

اٹھائیسواں باب

حضرت عثمانؓ کی شہادت

ایک روز حضرت عثمانؓ حسب سابق گھر سے نکلے اور معمول کے مطابق نماز پڑھا کر منبر پہ بیٹھ گئے اور اپنی عادت کے مطابق لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنے لگے دوران وعظ میں فرمایا "اے دشمنو! خدا سے ڈرو۔ خدا کا خوف رکھو، بخدا اہلِ مدینہ جانتے ہیں کہ تم لوگ رسولِ خدا کے فرمان کے مطابق ملعون ہو، لہٰذا اپنی

مسجد میں حضرت عثمانؓ سے نوک جھونک اور زیادتیاں

خطاؤں کو اپنی خوش عملی کی مدد سے محو کر دو۔ کیونکہ خدائے عزّوجل بدی کو صرف نیکی کے ذریعہ ہی مٹاتا ہے۔ مورخین کا بیان ہے کہ اس پر محمد بن مسلمہؓ کھڑے ہوئے اور کہا "میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں" حکیم بن جبلہ اٹھے اور انہوں نے محمد بن مسلمہؓ کو بٹھا دیا۔ اس پر زید بن ثابتؓ اٹھے اور کہا "مجھے کتاب اللہ دو" ایک جانب سے محمد بن ابی تنیرہ آئے اور انھوں نے زید بن ثابتؓ کو بٹھا دیا۔ بات یہ تھی کہ محمد بن مسلمہؓ نے حضرت عثمانؓ کے اس قول کی تائید کی تھی کہ خدا بدی کو صرف نیکی کے ذریعہ ہی دور کرتا ہے۔ زید بن ثابتؓ اسی بات کو قرآن سے نکال کر بتانا چاہتے تھے اور لوگوں کے سامنے یہ آیت قرآنی تلاوت کرنا چاہتے تھے۔

إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱۵)

بیشک حسنات سیئات کو دور کر دیتی ہیں

لیکن لوگوں نے دونوں کو بٹھا دیا۔ اس کے بعد انصار میں سے ایک شخص جبلہ بن عمرو الساعدی نے اٹھ کر کہا۔ "اے عثمانؓ! منبر سے اتر جاؤ تاکہ ہم تمہیں ایک لمبا چلا پہنا کر ایک دراز قد اونٹ پر سوار کر کے جبل دخان کی طرف اسی طرح جلا وطن کر دیں جس طرح تم ہمارے بہترین انسانوں کو بے گھر کرتے رہے ہو" حضرت عثمانؓ نے جواب دیا۔ "خدا تجھے اور تیرے ارادہ کو کبھی کامیاب نہ کرے"۔ یہ جبلہ کئی بار حضرت عثمانؓ کو کنایۃً و اشارۃً قتل کی دھمکیاں

دیتا رہتا تھا، وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ اگر یہ (حضرت عثمانؓ) اپنے قریبی رشتہ داروں کو ماز دار بنانے سے باز نہ آئے تو ان کے گلے میں طوق ڈال کر انھیں خارش زدہ اونٹنی پر بٹھا کر جبل دخان میں پھینک دیا جائے گا، یہ شخص خاص طور پر حضرت عثمانؓ پر ان کے عمال کے تقرر نیز مروان اور آلِ حکم نوازی کے بارے میں سخت اعتراضات، تنقیدات اور ملامتیں کرتا رہتا تھا۔ اور اگر کوئی اس کے آڑے آتا اور اسے قدرے نرم لہجہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا تو وہ کہتا "بخدا کیا تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ کل جب خدا سے سامنا ہو تو میں کہوں۔

إِنَّآ أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَأَضَلُّونَا ٱلسَّبِيلَا۠ (۳۳ / ۶۷)

ہم نے اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت کی تو انھوں نے ہمیں بے راہ کر دیا۔

ابھی حضرت عثمانؓ جبلہ کی بات کا جواب دینے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ کے قبیلہ ہی کا ایک شخص جہجاہ بن سعید غفاریؓ جو بیعتِ رضوان میں شریک ہونے والے صحابی تھے اچھل کر منبر تک پہنچے اور حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے وہ عصا چھین لیا جس پر ٹیک لگا کر وہ کھڑے تقریر کر رہے تھے اور اپنے گھٹنے پر رکھ کر اسے توڑ دیا یہ وہی عصا تھا جسے ہاتھ میں لے کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما خطبے دیا کرتے تھے۔ راویوں کا بیان ہے کہ اس دن سے جہجاہ کا گھٹنہ زخمی ہوا اور ناسور کی ابتداء ہوگئی۔ بعد ازاں حضرت عثمانؓ نے اس عصا کو بندھوا لیا۔ اب لوگ بھڑک اٹھے اور ایک دوسرے پر پتھراؤ کرنے لگے۔ یہ سنگ ریزے حضرت عثمانؓ کے بھی لگے یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ اسی عالم میں انہیں گھر پہنچایا گیا جہاں سے وہ پھر قتل کے بعد ہی باہر نکلے۔

محاصرہ میں تشدد

اس دن سے باغیوں نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ صحیح معنوں میں ناروا برتاؤ شروع کر دیا۔ انہیں مسجد نبویؐ میں نماز ادا کرنے سے روک دیا اور اپنے میں سے ایک شخص جو مصری وفد کا لیڈر تھا یعنی غافقی کو نماز پڑھانے کے لئے مقرر کر لیا۔ کبھی کبھار حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ یا حضرت علیؓ بھی نماز پڑھا دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد باغیوں نے حضرت عثمانؓ کا پانی بند کر دیا، یہاں تک کہ وہ اور ان کے اہل و عیال

پانی کی بندش

سخت پیاس کی تکلیف میں مبتلا ہو گئے اور ایک دن حضرت عثمان نے چھت پر سے جھانک کر باغیوں کو یاد دلایا کہ یہ جسے تم پیاسا مار رہے ہو وہی ہے جس نے رسولؐ خدا کے حکم سے رومہ کا کنواں خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا تھا اور اس کے صلہ میں نبی اکرمؐ نے میرے لئے جنت کا وعدہ فرمایا تھا، آج اس کنویں کے پانی سے بھی میں محروم کیا جا رہا ہوں اور گدلے بدمزہ پانی سے افطار کر رہا ہوں۔ انہیں یہ بھی یاد دلایا کہ رسولِ خدا کے حکم سے ہی میں نے وہ قطعۂ ارضی خریدا تھا جسے آپؐ نے توسیع مسجد کے لئے مسجد کے رقبہ میں شامل

فرمایا اور پھر اس کے صلہ میں بھی آپؐ نے مجھ سے جنت کا وعدہ فرمایا تھا لیکن آج میں ہی وہ پہلا مسلمان ہوں جسے اس مسجد میں نماز ادا کرنے سے بھی روک دیا گیا ہے۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے اصحابِؓ رسولؐ اور امہات المومنینؓ کے نام پیغام بھیجے کہ اگر ہوسکے تو کچھ میٹھا پانی پہنچا دیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ کسی تدبیر سے تھوڑا سا پانی ان کے گھر لے جانے میں کامیاب ہوگئے، انھوں نے باغیوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا "تمہارا یہ طرزِ عمل نہ اسلامی ہے نہ کافرانہ، ایرانی اور رومی بھی جب کسی کو قید کرتے ہیں تو کھانا پانی بند نہیں کرتے" حضرت ام المؤمنین ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان تھوڑا پانی لے کے آئیں لیکن باغیوں نے ان کے خچر کے منہ پہ مارا اور اس کی زین کا تنگ کاٹ ڈالا۔ اور اگر لوگ پکڑ کر نہ سنبھال لیتے اور انھیں واپس گھر تک نہ پہنچا دیتے تو وہ اپنی سواری پر سے گر جاتیں۔ حالانکہ ام المؤمنینؓ نے باغیوں کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ حضرت عثمانؓ سے بنو امیہ کے یتیموں اور ان وصیت ناموں کے بارے کچھ گفتگو کرنے آئی ہیں جو حضرت عثمانؓ کی تحویل میں ہیں، لیکن اس پر بھی باغیوں نے ان کی ایک نہ مانی۔ جب سے محاصرہ شدید ہوا اکثر صحابہ کرامؓ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ رہے۔ اسی طرح دوسرے لوگ بھی خانہ نشین ہوگئے۔ اگر کوئی گھر سے نکلتا بھی تو تلوار ساتھ رکھتا، یہ حالت بھیانک شکل اختیار کرتی گئی۔ قتل کا بازار گرم ہوگیا۔ مصیبت بہت بڑھ گئی۔ حضرت عثمانؓ وقتاً فوقتاً چھت سے جھانکتے اور باغیوں کو فتنہ و فساد کے انجام سے ڈراتے اور آشتی کنارہ کشی کی تلقین کرتے۔ انھیں آیاتِ قرآن اور احادیث رسول اللہؐ سنا کر سمجھاتے لیکن وہ ان کی کوئی بات نہ سنتے نہ ان کی پرواہ کرتے۔ بلکہ بعض اوقات وہ انھیں بہت تلخ جواب بھی دیدیتے۔

بنی امیہ کے تمام لڑائی میں شریک ہونے کے قابل افراد جن میں مہاجرین کے جوان بیٹے بھی شامل ہوگئے تھے جمع ہوکر

حضرت عثمانؓ کی مدافعت کرنے والی جماعت

حضرت عثمانؓ کے گھر میں پہنچ گئے تھے اور باغیوں سے گھر اور حضرت عثمانؓ کی مدافعت کر رہے تھے، ان لوگوں میں حضرات عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیر، حسن اور حسینؓ اور محمد بن طلحہ رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے۔ حضرت عثمانؓ نے اس گروہ کی قیادت حضرت عبداللہ بن زبیر کے سپرد کی اور انھیں لڑائی نہ کرنے کی سختی سے تاکید کر دی، حالات اور بگڑتے گئے حتیٰ کہ اب نہ کوئی حضرت عثمانؓ کے گھر میں رہنے والا باہر نکل سکتا تھا۔ نہ باہر والا اُن کے گھر کے اندر جا سکتا تھا۔ کئی دن تک یہ صورتِ حال جاری رہی، پھر یہ خبریں آئیں کہ عراقی کمک مدینہ کے قریب پہنچ گئی ہے، اور شامی کمک وادیٔ

کمک قریب پہنچنے کی خبریں

القریٰ تک آگئی ہے ——— یہاں راویوں میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ حضرت عثمانؓ کے طرفدار کہتے ہیں کہ یہ خبریں سُن کر باغی ڈرے۔ انہیں خوف ہوا مبادا یہ امدادی لشکر آکر انھیں حصولِ مقصد سے روک دیں، لہٰذا، انھوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے اور ایک دستہ جس

کی قیادت محمد بن ابوبکرؓ کر رہے تھے مرتب کیا یہ لوگ دیوار پر چڑھ کر اس کھڑکی کے ذریعے جو عمرو بن حزم اور حضرت عثمانؓ

باغیوں اور مدافعت کرنے والوں میں جھڑپ کی ابتداء

کے گھر کی مشترکہ دیوار میں تھی حضرت عثمانؓ کے پاس جا پہنچے اور انھیں قتل کر دیا۔ باغیوں کے حامیوں کا کہنا ہے کہ خود اہلِ خانۂ عثمانؓ ہی نے پہل کر کے باغیوں کو چھیڑا۔ ہوا یوں کہ حضرت عثمانؓ چھت پر سے جھانک رہے تھے کیونکہ باغیوں میں سے ایک ضعیف العمر صحابی نیار بن عیاض نے حضرت عثمانؓ کو بلایا تھا وہ انہیں پند ونصیحت کے ذریعہ سمجھا رہے تھے کہ آپ خلافت سے دست بردار ہو جائیں نیار بن عیاض محوِ گفتگو تھے کہ حضرت عثمانؓ کے گھر سے کسی نے انھیں تیر یا پتھر مارا جس سے ان کی موت واقع ہوگئی۔ باغیوں نے حضرت عثمانؓ سے مطالبہ کیا کہ ہمارے ساتھی کا قاتل ہمارے حوالے کیا جائے تاکہ ہم اس سے قصاص لیں۔ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا قاتل کون ہے اور کیسے تمہارے حوالے کروں؟ یا حضرت عثمانؓ نے یہ جواب دیا تھا "میں اس آدمی کو تمہارے حوالے نہیں کروں گا جو میری مدافعت کر رہا تھا اور تم تو مجھے قتل کرنا چاہتے ہو"۔ پھر ایک بھیانک رات آئی جس کی صبح کو باغیوں

حضرت عثمانؓ کے مکان پر حملہ

نے حضرت عثمانؓ کے مکان پر حملہ کر دیا، اس کے دروازوں کو آگ لگا دی۔ گھر والے باغیوں سے جنگ کرنے کی خاطر باہر نکل آئے۔ جنگ نے شدت اختیار کر لی۔ عبداللہ بن زبیرؓ کو بہت سے زخم لگے پھر ان پر بے ہوشی ہوگئی۔ حتیٰ کہ لوگ سمجھے کہ وہ مر گیا ہے' دوسرے بہت

حضرت عثمانؓ کا قتل

سے مارے گئے اور باغی بزور گھر کے اندر گھس گئے۔ اسی اثناء میں عمرو بن حزم نے اپنا دروازہ کھول دیا اور چند افراد کو کھڑکی میں سے گزار دیا جنھوں نے بڑھ کر حضرت عثمانؓ کو قتل کر دیا۔

گمان غالب یہ ہے کہ جب امدادی لشکروں کے مدینہ سے قریب پہنچنے کی خبریں باغیوں کو ملیں تو انھوں نے چاہا کہ ان کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ اس جھگڑے کا فیصلہ کر ڈالیں، کمکوں کے پہنچنے کی جو خبریں باغیوں کو پہنچی تھیں مروان کو بھی پہنچیں لیکن وہ ضبط سے کام نہ لے سکا اور جلدی سے جنگ چھیڑ دی اس کا خیال تھا کہ وہ محاصرین کو گھر سے دور بھگا دے گا اور کمکوں کے آنے تک لڑائی جاری رکھ سکے گا۔ اسے یہ پسند نہ تھا کہ امیر معاویہؓ یا ابنِ عامر اس پر یہ احسان جتائیں کہ ان کی فوجوں نے انھیں گھر میں محصور پایا پھر محاصرہ توڑ کر انہیں حیاتِ نو بخشی۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ جب امداد آئے تو اسے مدینہ میں رہنے والے اموی افراد کے دوش بدوش پامردی و کامیابی سے لڑتے ہوئے پائے اسی خیال کے تحت وہ رجز پڑھتا، دعوتِ مبارزت دیتا گھر سے باہر نکلا۔ اس کے ساتھ بنی اُمیہ کی ایک جماعت بھی رجز پڑھتی ہوئی

نکلی، حضرت عثمانؓ انھیں صبر کا حکم دیتے اور جنگ سے روکتے رہے مگر انھوں نے ان کی کوئی بات نہ مانی۔ یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ کو مجبور ہو کر یہ قسم دینی پڑی کہ جو میری اطاعت کا دم بھرتا ہے وہ تلوار رکھ دے۔ چنانچہ ان کے بہت سے اصحابؓ نے تلواریں رکھ دیں، لیکن بنو امیہ باز نہ آئے۔ اس دوران میں کہ لوگ لڑائی میں مشغول تھے، محافظینِ خانہ ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور مخالفین گھر میں گھس گئے، اور ایک خبر دینے والے نے گھر سے باہر نکل کر اعلان کیا "ہم نے عثمانؓ کو قتل کر دیا۔" پھر کیا تھا دروازے کھلوا دیئے گئے۔ حضرت عثمانؓ کا گھر اور بیت المال لوٹ لیا گیا۔ لوگوں کے منتشر ہوتے ہوتے حادثہ وقوع پذیر ہو چکا تھا فتنہ رونما ہو چکا تھا اور جو بلائے عظیم مسلمانوں پر نازل ہونی تھی وہ نازل ہو چکی تھی۔

بعض روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ آخر الامر ایک گونہ عافیت پسندی کی طرف مائل ہو گئے تھے۔

کیا حضرت عثمانؓ آخری وقت میں خلافت سے دستبرداری کیلئے تیار تھے؟

کہا جاتا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ حضرت عثمانؓ کے پاس گئے ان سے بات چیت کی پھر وہ انا للہ الخ کہتے ہوئے حضرت علیؓ کی تلاش میں نکلے اور مسجدِ نبویؐ میں انہیں پا لیا۔ حضرت سعدؓ نے کہا "اے ابو الحسنؓ! لو میں تمہارے پاس ایسی بہترین تجویز لایا ہوں جس سے بہتر کوئی حل پیش نہیں کیا جا سکتا، اور وہ یہ ہے کہ آپ کے خلیفہ نے اپنی مرضی آپ لوگوں کے حوالہ کر دی ہے۔ دوڑیئے ان کی مدد کیجئے۔ اور اس فضیلت میں سبقت فرمائیے"، لیکن ابھی دونوں کی یہ سرگوشی جاری تھی کہ حضرت عثمانؓ کے قتل کی خبر آ گئی۔

مجھے یقین کی حد تک اعتقاد ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت سعد کو بلوا کر انھیں اپنے اور حضرت علیؓ کے مابین سفارت پر آمادہ کیا ہوگا تاکہ لوگوں کو قتل و قتال سے روک دیا جائے۔ اور یہ شرط طے پائی ہوگی کہ خلافت کا معاملہ مسلمانوں کے اصحابِ شوریٰ اور اربابِ حل و عقد کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ جسے چاہیں خلافت کا عہدہ سونپ دیں، لیکن افسوس کہ اس سفارت میں دیر ہو گئی، اور تقدیرِ خداوندی اپنا وقت پورا کر چکی تھی[1]۔

۱؎ "تقدیرِ خداوندی" کی سپر مؤرخین کے بڑی کام آتی ہے۔

انتیسواں باب

لمحۂ فکریہ

امیر معاویہؓ کی دو تجویزیں

۳۴ھ میں حضرت عثمانؓ کو الوداع کہنے سے قبل امیر معاویہؓ نے ان کے سامنے دو تجویزیں پیش کی تھیں جن کی حضرت عثمانؓ نے سختی سے تردید کر دی تھی۔ پہلی تجویز یہ تھی کہ حضرت عثمانؓ امیر معاویہؓ کے ہمراہ شام چلے جائیں اور وہاں امن و حفاظت سے رہیں۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے جوارِ رسولؐ اور ہجرت کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ قیام کرنا پسند نہ کیا، گمان غالب یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے دل میں اس تجویز کے دوسرے پہلوؤں پر بھی غور کیا ہوگا جس کا تذکرہ امیر معاویہؓ سے نہ کیا ہوگا۔ مثلاً یہ کہ اگر وہ مدینہ چھوڑ دیں تو گویا خلافت کا دارالحکومت اس شہر کی بجائے جہاں اسلام نے اپنے دشمنوں پر فتح پائی تھی جہاں رسولؐ خدا نے اسلام کے علم گاڑے تھے اور جہاں حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ نے عظمت اسلام کو قائم کیا تھا کسی اور شہر میں منتقل ہو جائے گا، اور حضرت عثمانؓ کے لئے اس سے زیادہ مبغوض بدعت اور کوئی نہ ہوتی، ان کی طبع حساس پر صحابۂ کرامؓ کا یہ اعتراض بھی بڑا شاق گزرتا کہ آپ نے اسلامی حکومت کے مرکز کو اس جگہ سے ہٹا کر جہاں اسے رسولِ خدا اور حضرات ابوبکر و عمرؓ نے برقرار رکھا تھا ایک اجنبی شہر میں منتقل کر دیا۔ علاوہ ازیں اگر حضرت عثمانؓ ایسا کر بھی لیتے تو گویا وہ امیر معاویہؓ کے ہاتھ میں اسیر ہو جاتے۔ مگر حضرت عثمانؓ کو یہ گوارا تھا کہ وہ معاویہؓ بن ابوسفیان کی بجائے اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں میں اسیر ہو جائیں جنہوں نے ان کے ہمراہ ہجرت کی تھی اور جنہوں نے مہاجرین کو پناہ دی اور ان کی مدد کی تھی جو ان کے اور رسولِ خدا کے دوش بدوش شریکِ جہاد رہے تھے اور جنہوں نے ان کی ہم نشینی میں رسولؐ خدا کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا تھا قطع نظر اس قرابت کے جو ان کے اور امیر معاویہؓ کے مابین تھی اور قطع نظر اس قوت و غلبہ اور امن و حفاظت کے جو انھیں امیر معاویہؓ کے ہاں میسر آسکتا تھا۔

امیر معاویہؓ کی دوسری تجویز یہ تھی کہ وہ شامیوں کا ایک لشکر حضرت عثمانؓ کی خدمت میں بھیج دیں جو مدینہ میں

ان کے پاس رہے اور انھیں پیش آنے والے خطرات سے محفوظ رکھے۔ حضرت عثمانؓ نے یہ پیشکش بھی ٹھکرا دی اور کہا میں اصحابِ رسول اللہ کو لشکر کی موجودگی و ہمسائیگی سے ستانا نہیں چاہتا۔ گمان اغلب یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے دل میں اس تجویز کے دوسرے گوشوں پر بھی نظر ڈالی ہوگی جس کا انھوں نے امیر معاویہؓ سے تذکرہ کرنا مناسب نہ سمجھا ہوگا، مثلاً رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کی روش کو چھوڑ کر یہ پسند نہ کرتے تھے کہ اپنا قول قوت و غلبہ کے بل بوتے پر منوائیں اور دارالہجرت کو امیر معاویہؓ کی پیش کردہ قوت سے تابع فرمان کر کے اسلام میں اس بہت بڑی بدعت کا آغاز کریں۔ یعنی یہ کہ مہاجرین و انصار مسجد نبویؐ اور شہر مدینہ منورہ کو اس لشکر سے محکوم و مغلوب کر دیں جسے معاویہؓ بن ابی سفیان نے ایسے لوگوں میں سے بھیجا ہے جنہوں نے نہ رسولِ خدا کے ارشادات گرامی سنے تھے نہ آپؐ کے اخلاق و عادات کو دیکھا تھا اور نہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے طرزِ عمل کا نظارہ کیا تھا حضرت عثمانؓ وہ پہلے شخص نہیں بننا چاہتے تھے جو خلافت کو شاہی میں تبدیل کر دیتے۔ انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ خلافت کو اس کے جانے پہچانے نرمی و محبت کے طریقہ سے ہٹا کر قہر، جبر اور دبدبہ میں منتقل کر دیں۔ اگر حضرت عثمانؓ ایسا کرتے تو ان کی حیثیت ایک ایسے خودسر کی ہوتی جو صحابۂ کرامؓ پر اس لشکر کے ذریعہ حکومت کرتا جو انہیں ان کے ساتھیوں سے محفوظ رکھتا، جب تک وہ اپنے گھر میں رہتے یہ لشکر اس گھر کی پاسبانی کرتا رہتا، جب وہ اپنے گھر سے باہر نکلتے تو وہ لشکر ان کے ساتھ ان کی حفاظت کے لئے چلتا، جب وہ منبر پر خطبہ دیتے تو یہ لشکر ان کو اپنے گھیرے میں لے لیتا، اور جب وہ مدینہ کی گلیوں میں گشت کرتے تو یہ لشکر بھی ان کے آگے پیچھے رہتا، لیکن اس تمام طرزِ عمل کا سیرتِ نبویؐ اور سیرتِ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور خود حضرت عثمانؓ کی اپنے سابقہ طرزِ حکومت سے کیا تعلق تھا! وہ تو مدینہ میں بغیر کسی محافظ کے گھومتے رہتے تھے۔ لوگوں کی محفلوں میں جاتے، ان کی سنتے اور اپنی کہتے تھے۔ وہ تو اپنی چادر کا ایک حصہ اپنے بدن پر لپیٹ کر اس کے دوسرے کنارہ کو سر کے نیچے تکیہ کی طرح رکھ کر مسجد نبویؐ میں سو رہتے تھے، اور جمعہ کے دن وہ منبرِ رسولؐ پر جلوہ گر ہوتے تو لوگوں سے ایک شفیق باپ، مہربان بھائی، یا جاں نثار دوست کی طرح مختلف موضوعات پہ باتیں کرتے تھے۔ ان کے مریضوں کی خیریت پوچھتے، ان کے دیگر عمومی معاملات و ضروریات دریافت کرتے۔ منڈی کے نرخ معلوم کرتے۔ اور جب مؤذن اذان دیتا تو حسبِ موقع خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ پھر فارغ ہوتے تو لوگوں کے ساتھ بیٹھ جاتے اور از سرِ نو مریضوں کی خیریت، احوال و ضروریات اور منڈی کا نرخ دریافت کرنے لگ جاتے۔ پھر جب مؤذن دوسری اذان دیتا تو اٹھ کر لوگوں کو نماز پڑھا دیتے تھے۔ یہ انھیں کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ اس سارے نظام کو بدل کر شام چلے جائیں، دارِ ہجرت کو

چھوڑ دیں، منبرِ رسولؐ پر بیٹھ کر خطبہ نہ دیں، نہ مسجدِ نبویؐ میں نماز پڑھیں جہاں رسولِ خدا اور حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ نمازیں ادا کرتے رہے تھے؟ وہ یہ بھی کیونکر گوارا کر سکتے تھے کہ مدینے میں شامی لشکر کے گھیرے میں رہتے جو انھیں ان لوگوں سے بچائے رکھتا جو رسولِ خدا اور خود ان کے ساتھ ہر میدانِ جنگ میں شریک رہے؟ بہر حال حضرت عثمانؓ امیر معاویہؓ کی شام منتقل ہونے کی تجویز یا شامی لشکر کے مدینہ بھیجے جانے کے پیش کش کسی طور منظور کر ہی نہیں سکتے تھے، بالآخر جب امیر معاویہؓ نے ان سے کہا " اگر آپ ان دونوں تجاویز میں سے کوئی تجویز بھی منظور نہیں کرتے تو پھر حالات کی نزاکت بتلا رہی ہے کہ یا تو آپ کے خلاف لڑائی کی جائے گی یا پھر اچانک بے خبری میں آپ کو مار ڈالا جائے گا۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے جواب دیا۔

حَسْبِیَ اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ

میرے لئے خدا کافی ہے اور وہ بہترین چارہ ساز ہے۔

بہر حال حضرت عثمانؓ نے جب سے خلافت کا عہدہ سنبھالا ان کی نیت یہی رہی کہ وہ اپنے پیش رو دونوں خلفاء (ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کی روش پر گامزن رہیں اور اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ کریں، اور مجموعی طور پر دیکھا جائے تو وہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی طرز پر قائم بھی رہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اور لوگوں کے درمیان کوئی حجاب یا دربان بھی نہ رکھا، نہ لوگوں پر اپنی بڑائی و برتری اور غلبہ کا رعب ڈالا نہ کسی قسم کے جابرانہ اقتدار و تسلط کا اظہار کیا، ان میں جو کمزوری تھی اس کا سبب بدنیتی یا قانون سے بغاوت نہ تھا بلکہ وہی کمزوری تھی جو بعض شخصیتوں میں کریمانہ و فاضلانہ اخلاق نیز خیر خواہی اور بھلائی میں رغبت کے باعث پیدا ہو جاتی ہے۔

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو وہ ستر برس کے بوڑھے تھے۔ وہ نہایت درجہ سخی اور فیاض اور بہت صلہ رحمی کرنے والے نہایت شرمیلے، بڑے نرم دل اور خوش خلق

ان حالات کا خلاصہ جو بالآخر حضرت عثمانؓ کی شہادت کا باعث بن گئے

تھے، وہ لوگوں کے متعلق اچھی رائے اور حسن ظن رکھتے، ان کی ان صفات کو ذرا ان کے رشتہ داروں اور خاندان والوں کو صفات میں ملاکر دیکھئے۔ جو نہایت درجہ حریص و طماع بے پناہ خواہشات رکھنے والے، اپنے مفاد کی خاطر دور دور تک نظریں دوڑانے والے اور تسلط و غلبہ کے پورے ساز و سامان سے آراستہ و مسلح تھے، یہ سب چیزیں مل کر از خود وہ خراب شکل پیدا کر دیتی ہیں جس کا حضرت عثمانؓ کو سامنا کرنا پڑا، پھر اگر حضرت عثمانؓ کی خوبیوں اور ان کے رشتہ داروں کی عادتوں میں اس امر کا بھی اضافہ کر لیا جائے کہ خود صحابہ کبارؓ میں سے ایک جماعت جس نے اپنے کاروبار کو وسیع کر کے

بڑا سرمایہ جمع کر لیا تھا اپنے عظیم سرمایہ کے بل بوتہ پر اپنے دلوں میں یہ خیال کرنے لگی تھی کہ وہ حضرت عثمانؓ سے کسی طور خلافت کی کمتر مستحق نہیں ہے بلکہ شاید وہ بار خلافت کی ذمہ داریاں اٹھانے میں حضرت عثمانؓ سے زیادہ مستعد اور قابل ثابت ہوسکے گی کیونکہ وہ حضرت عثمانؓ کی طرح سن رسیدہ نہیں ہے۔ ان تمام حالات سے مل کر جو شکل بنتی ہے وہ یقیناً اس قابل ہے کہ حضرت عثمانؓ کی ذمہ داریوں کو مشکل سے مشکل تر بنا دے اور ان کی سیاسی گتھیوں کو پیچیدہ تر کرتی چلی جائے اور حالت یہ ہو جائے کہ جب وہ ایک الجھاؤ کو سلجھائیں تو دوسری اس سے زیادہ مشکل و پیچیدہ الجھنیں ان کے سامنے آتی چلی جائیں۔

پھر ان تمام امور کے ساتھ یہ بھی اضافہ کیا جائے کہ ان بوڑھے مہاجرین و انصار نے جو زندگی بسر کی تھی اگر وہ ٹھیٹ دیہاتی اور خالص خانہ بدوش زندگی نہ بھی تھی تو بہر حال مہذب شہری زندگی کے مقابلہ میں بہت زیادہ دیہاتی اور غیر متمدن ضرور تھی۔ پھر اچانک جب ان لوگوں نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو ایک ایسی عظیم سلطنت کے سامنے پایا جو دور دراز تک پھیلی ہوئی تھی، جسے گوناگوں پیچیدہ مسائل درپیش تھے جن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کسی نئی تہذیب کی نہیں، بلکہ ایک ایسے قدیم و مستحکم تمدن کی ضرورت تھی جس کے اصول و ضوابط معین ہوں اور جو مقررہ خطوط پہ چلے جا رہے ہوں، جب ان تمام امور کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھیں گے تو آپ اس نتیجہ پہ پہنچ جائیں گے کہ جن حالات نے حضرت عثمانؓ کو آگھیرا تھا وہ حضرت عثمانؓ اور ان کے اصحاب کی طاقت سے باہر تھے۔ یہ کہنا بے جا ہوگا کہ حضرت عمرؓ نے بھی تو ایسے ہی حالات کا سامنا کیا تھا اور ان پر قابو پا لیا تھا، اس لئے کہ حضرت عمر ان چند منفرد شخصیتوں میں سے تھے جنھیں عالم انسانیت شاذ و نادر ہی پیدا کر سکتا ہے۔ اس قسم کی غیر معمولی شخصیتیں اپنے جانشینوں کو سخت مشکلات اور آزمائشوں میں مبتلا کر جاتی ہیں، بلکہ اگر احتیاط مانع نہ ہو تو میں کہوں گا کہ اوّل و آخر صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عبقریت (غیر معمولی استعداد و صلاحیت) ہی ان حالات کی ذمہ دار ہے جن میں حضرت عثمانؓ اور ان کے ساتھی گھر گئے تھے۔ وہ عبقریت جو حضرت عمرؓ کے بعد ان کے ساتھیوں میں سے کسی کو بھی نہ ملی جن میں حضرت عثمانؓ بھی شامل ہیں۔

بہر حال رونما ہونے والے ان حادثات نے اور اس فتنہ نے جو قتل عثمانؓ کے بعد پہلا مرحلہ طے کر چکا تھا مسلمانوں کو ایک دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا، ان کے سامنے دو راستے تھے اور دونوں رستے بالکل سیدھے اور پوری طرح واضح تھے جن میں کوئی

مسلمانوں کے سامنے آنے والا دوراہہ

کجی موڑ یا پیچیدگی نہ تھی، ایک راستہ وہ تھا جس پر امم سابقہ گامزن رہی تھیں۔ یعنی ملوکیت، جس میں حکومت کو تدبر، عزم و حزم، قوت و استبداد۔ زور اور دبدبہ کے ذریعہ چلایا جاتا ہے اور دنیوی مشکلات کو دنیوی وسائل کے ذریعہ حل کیا

جاتا ہے چنانچہ سلطنت رو بہ ترقی ہوتی ہے، طاقت پکڑتی ہے، اور خوب پھیلتی پھولتی ہے پھر وہ کمزور ہو کر رو بہ زوال و انحطاط ہو جاتی ہے تاکہ وہ ایک حال سے دوسرے حال میں، ایک ریاست سے دوسری ریاست میں، ایک قوم سے دوسری قوم میں منتقل ہو جائے۔ دوسرا راستہ وہ نیا راستہ تھا جس کی طرح رسولِ خدا نے ڈالی تھی۔ اور جسے آپؐ کے بعد آنے والے دو خلفاء (ابوبکرؓ و عمرؓ) نے سربلندی و تقویت دی تھی۔ یہ وہ طرزِ حکومت ہے جس میں اقتدار کا دار و مدار قوت پر نہیں ہوتا بلکہ اقتدار کی بنیاد محبت اور انصاف پر مبنی ہوتی ہے جو قوت کو اپنے ذرائع میں سے ایک ذریعہ اور وسائل میں سے ایک وسیلہ بناتی ہے۔ جس میں خود غرضی، تحکم اور زور و جبر سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، اس میں دنیوی مشکلات کو دنیوی وسائل سے حل نہیں کیا جاتا۔ بلکہ انھیں دینی وسائل سے حل کیا جاتا ہے اور وہ وسائل جن کی اساس امر بالمعروف ونہی عن المنکر، نیکی سے محبت، اور شر سے نفرت، قربانی و ایثار اور خود غرضی سے برأت پر ہوتی ہے۔ اس حکومت کی اولین شرط باطن کی صفائی ضمیر کی پاکیزگی اور دلوں کی طہارت ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس میں دنیا کو محض وسیلۂ آخرت ہی بنا دیا جاتا ہے بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ ایک اعتبار سے اسے وسیلۂ آخرت اور دوسرے اعتبار سے اسے ایک ایسی نئی دنیا کا وسیلہ بنایا جاتا ہے جو زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ، پاکیزگی، رونق و صفائی میں آگے بڑھتی چلی جائے۔

قتلِ عثمانؓ کے بعد مسلمانوں نے دیکھا کہ وہ اسی دوراہہ پر کھڑے ہیں۔ ان میں سے اکثر لوگوں نے تو پہلی راہ اختیار کر لی، انھیں اس راہ میں وہی آزمائشیں پیش آئیں اور اب تک پیش آرہی ہیں جو دوسری قوموں اور نسلوں کو پیش آئیں، البتہ ان میں سے بہت تھوڑے افراد نے دوسری راہ اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن آخر وہ بھی انسان ہی تھے جیسے ہی وہ اس راہ میں ذرا آگے بڑھے ان کے خون اور ان کی جانیں ابتلاء و آزمائش میں پڑ گئیں، اور بالآخر اکثریت ان پر غالب آگئی۔

آج بھی مسلمان دیکھ رہے ہیں کہ اس پہلے راستہ پر مسلمانوں کی بھیڑ اور ہجوم ہے اور وہ اس پر پروانہ وار ٹوٹے جا رہے ہیں۔ ان کے سامنے دوسرا راستہ بھی ہے جو بدستور صاف اور واضح ہے لیکن وہ خالی ہے۔ اس پر صرف اولوالعزم ہی چل سکتے ہیں ـــــ مگر اولوالعزم لوگ ہیں کہاں ؟

تیسواں باب

ایک جواب طلب سوال

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس کا قدمار نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا بلکہ اکثر بزرگوں نے تو اس کا جواب دینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ لیکن بایں ہمہ ہمیں اس سوال کا کوئی جواب تلاش کرنا ہی پڑے گا، سوال یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے عمال نے ان کو مدد دینے میں کس طرح اور کیوں اتنی تاخیر اور سستی روا رکھی کہ باغی حضرت عثمانؓ کا دیر تک محاصرہ کئے رہنے اور آخر کار ان کو قتل کر دینے میں کامیاب ہو گئے؟ کہا جاتا ہے کہ محاصرہ مسلسل چالیس دن تک جاری رہا۔ یہ صحیح ہے کہ ذرائع نقل وحمل آسان اور قریب نہ تھے لیکن دوسری طرف ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خبریں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ صوبہ جات میں پہنچ رہی تھیں، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح (والیٔ مصر) کو علم تھا کہ مصری حضرت عثمانؓ کے خلاف غم وغصہ کے جذبات لئے ہوئے گئے ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ انھوں نے امیر معاویہؓ کو اس امر کی اطلاع بھی دی تھی۔ اسی طرح انھوں نے خود حضرت عثمانؓ کو بھی خط کے ذریعہ اس صورت حال سے مطلع کر دیا تھا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے بھی اہل کوفہ کو مدینہ کا رخ کرتے دیکھا تھا، وہ بھی عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی طرح جانے والوں کے مقصد و ارادہ سے آگاہ تھے۔ یہی صورت بصرہ میں عبداللہ بن عامر کی تھی پھر آخر کیا سبب ہے کہ اتنی خبر ہونے کے باوجود یہ عمال خلیفہ کی امداد پر بسرعت تمام کمر بستہ نہ ہو سکے؟ پھر ان عمال کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ حضرت عثمانؓ کی طرف امداد کے مطالبہ پر مشتمل خطوط ملنے کے بعد بھی تیزی سے مدینہ نہ پہنچے؟ آخر ان لوگوں نے کیوں اتنی دیر لگائی اور تساہل برتا کہ ان کی مدد پہنچنے سے قبل ہی شر واقع ہو گیا اور امام قتل کر دیئے گئے، پھر ان سب امور سے بڑھ چڑھ کر یہ کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے عمال کو پابند کر رکھا تھا کہ وہ حج کے دنوں میں ان سے ضرور ملا کریں آخر کیا سبب ہے کہ ان کے عمال اس سال اپنے اپنے صوبوں میں رہے اور حج پر نہ گئے۔ یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ نے محصور ہونے کی وجہ سے مجبوراً حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو حج کی قیادت پر مقرر کیا۔ ان سب سے بھی زیادہ حیرت انگیز و تعجب خیز بات یہ ہے کہ مؤرخین

کے بیان کے مطابق حضرت ابنِ عباسؓ حضرت عثمانؓ کی طرف سے حاجیوں کے نام ایک چٹھی لے گئے تھے جس میں انھوں نے اپنا قضیہ پیش کیا تھا اور اپنا بے قصور ہونا ثابت کیا تھا۔ مورخین کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے یہ چٹھی حج کے موقع پر لوگوں کو پڑھ کر سنائی، یہ خط جس کا مکمل متن طبری نے بیان کیا ہے کس طرح لوگوں نے سن لیا اور ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی، سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور کوئی بھی خلیفہ کی مدد پر کمر بستہ نہ ہوا اور کوئی گروہ بھی مدینہ کے حادثات کا مشاہدہ کرنے کے لئے وہاں نہ پہنچا؟ یہ کیسے ہوگیا کہ حضرت عثمانؓ کا عامل مکہ خاموشی بے حسی اور اطمینان سے اس خط کو پی گیا اور اس نے لوگوں کو خلیفہ کی امداد پر برانگیختہ نہ کیا؟ اگر وہ اہلِ مکہ ہی کو جوش دلا کر بھیج دیتا اور وہاں کے صحرانشینوں کا ایک لشکر جمع کر دیتا تو یقیناً یہ فوج باغیوں کو اس وقت تک مشغول کئے رکھتی جب تک کہ صوبہ جات سے باقاعدہ فوجی کمک پہنچ جاتی۔ کیا سبب ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہ ہوئی؟ کیا وجہ ہے کہ کسی عامل نے بھی حرکت نہ کی؟ کیا سبب ہے کہ حاجی بھی خلیفہ کی امداد پر آمادہ نہ ہوئے؟ کیا اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ تمام امت نے متفقہ طور پر اس خلیفہ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا؟ رعیت تھک گئی تھی۔ عمال اپنے دلوں میں کچھ اغراض چھپانے کی وجہ سے کاہلی اور سستی کر رہے تھے، ان میں سے ہر ایک کو اپنی پڑی ہوئی تھی۔ اور انھوں نے خلیفہ کو مدینہ والوں کے سپرد کر دیا تھا کہ وہ جو کچھ ان کے ساتھ کرنا چاہیں کر دیں، یا حضرت عثمانؓ جو کچھ ان کے ساتھ کر سکیں کریں۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ خود اہلِ مدینہ کی اکثریت باغیوں کے ساتھ شامل تھی۔ مدینہ میں صحابۂ کرامؓ کی ایک مختصر جماعت ایسی بھی تھی جس نے عملاً تو حضرت عثمانؓ کا ساتھ چھوڑ رکھا تھا لیکن زبانی وہ اس صورتِ حال پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتی تھی، اگر اصحابِ رسولؐ کی یہ جماعت ہی باغیوں کے مقابلہ میں کھڑی ہو جاتی اور ان کی امیدیں خاک میں ملا دیتی تو یہ باغی لوگ بے نیل مرام واپس ہو جاتے۔ جیسا کہ بعض قدیم مورخین کی رائے ہے" ان چیزوں کے پیشِ نظر حضرت عثمانؓ کا وہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ لوگ میری درازیٔ عمر کو لامتناہی سمجھ کر مجھ سے دل برداشتہ ہو گئے ہیں مگر غالباً لوگوں کے لئے صرف ان کی درازیٔ عمر ہی ایک اکتا دینے والا مسئلہ نہ تھا بلکہ وہ اس سیاست کے لامتناہی سلسلہ سے دل برداشتہ ہو گئے تھے جو انھیں عہدِ فاروقیؓ کی سیاست سے مختلف معلوم ہو رہی تھی اور جو ان کی دیکھی بھالی قیصر و کسریٰ کی ملوکیت سے بھی الگ کوئی سیاست نظر آتی تھی، انھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان دونوں ریاستوں کے بین بین کوئی سیاست ہے۔

اکتیسواں باب

حضرت عثمانؓ کے خون ناحق کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

جس رات وہ تیر یا پتھر مارا گیا جس سے نیار بن عیاض الاسلمی کی موت واقع ہوئی اس کی صبح حضرت عثمانؓ نے روزہ رکھا اور اپنے اصحاب سے کہا کہ میں آج مار ڈالا جاؤں گا۔ اصحاب نے کہا "اے امیر المومنین! خدا آپ کے دشمنوں سے آپ کو محفوظ رکھے گا" تو حضرت عثمانؓ نے فرمایا "اگر تم یہ نہ کہو کہ میں اپنے دل سے بات بنا رہا ہوں تو میں تمہیں ایک عجیب بات سناؤں"۔ اصحاب نے کہا "ہم یہ نہیں کہیں گے"۔ اس پر آپ نے کہا "میں نے آج رات رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو خواب میں دیکھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا "اے عثمانؓ! آج روزہ ہمارے پاس کھولنا"۔

حضرت عثمانؓ کا خواب

ازاں بعد حضرت عثمانؓ اپنے اصحاب کے ساتھ باتوں میں مشغول رہے۔ انھیں باتوں میں آپ نے کہا "یہ لوگ مجھے کس بناء پر قتل کرنا چاہتے ہیں؟ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ حدیث سنی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا مردِ مسلم کا خون صرف اسی شکل میں روا ہے جب کہ وہ ان تین کاموں میں سے ایک کام کا مرتکب ہو جائے یا تو وہ اسلام لانے کے بعد کافر ہو جائے، یا شادی کے بعد زنا کرے یا کسی جان کو ناحق قتل کر دے[1]"۔ بخدا میں نے نہ کبھی جاہلیت میں زنا کیا نہ اسلام لانے کے بعد، اور جب سے خدائے تعالےٰ نے مجھے ہدایت سے سرفراز فرمایا میں نے اپنے دین کے عوض کبھی کسی اور دین کی تمنا بھی نہیں کی اور نہ ہی میں نے کسی نفس کو قتل کیا ہے؟ پھر آخر یہ لوگ میری گردن کس جرم میں مارنا چاہتے ہیں" انھوں نے

کس جرم پر مجھے قتل کر رہے ہو؟

---

[1] پہلی دو باتیں قرآن کے خلاف ہیں، اسی لئے یہ روایت صحیح نہیں ہو سکتی۔

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اپنے اصحاب سے کہا "اگر مسلمانوں نے مجھے قتل کر دیا تو پھر اس کے بعد وہ سب مل کر کبھی یک جا نماز ادا نہ کریں گے، نہ متحد ہو کر کسی دشمن کے خلاف صف آرا ہوں گے"۔ پھر حضرت عثمانؓ اپنے اصحاب کے ساتھ گفتگو کرتے رہے وہ ان لوگوں کو جو باغیوں سے جنگ کرنے پر مصر تھے قتل و قتال سے روک رہے تھے، اسی ضمن میں حضرت عثمانؓ نے کہا "رسولِ خدا نے مجھ سے ایک عہد لیا تھا اور میں اس عہد پر اس وقت تک پختگی سے قائم رہوں گا جب تک کہ خدا کی طرف سے مقرر کی ہوئی جگہ پر میں قتل نہ کر دیا جاؤں" وہ اسی طرح محوِ گفتگو تھے کہ باغیوں نے آکر انھیں شہید کر دیا۔

خونِ ناحق

حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کے بارے میں لوگوں میں بڑا سخت اختلاف ہے، بہر حال یہ بات یقینی اور قطعاً غیر مشکوک ہے اور اس میں کسی قسم کے نزاع کی گنجائش نہیں کہ اللہ تعالےٰ کے قانون نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون ان کے قاتلوں کے لئے مباح نہیں کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی سیاسی حکمت عملی مبنی بر خطا یا مبنی بر صواب ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے اصحاب نے دانستہ یا نادانستہ طور پر ظلم روا رکھا ہو۔ بہر حال معترضین و مخالفین کے لئے زیادہ سے زیادہ آخری حد یہ تھی کہ وہ مخالفت کرتے اور تمام امّت کو اس مخالفت میں ہم خیال بنا کر شامل کر لیتے اور جب تمام قوم کو خلیفہ کی مخالفت پر متحد کر لیتے تو ہر شہر اور ہر صوبے میں سے مسلمانوں کے نمائندے منتخب کر لیتے ان نمائندوں کا فرض ہوتا کہ وہ حضرت عثمانؓ سے گفت و شنید اور بحث و تمحیص کرتے۔ پھر وہ جیسا مناسب سمجھتے یا تو حضرت عثمانؓ کو بحال رکھتے یا خلافت سے معزول کر کے ان کی بجائے نیا خلیفہ چن لیتے۔ پھر وہ قصاص یا مال سے متعلق حضرت عثمانؓ پر لگائے ہوئے الزامات کی جانچ پڑتال اور محاسبہ کا کام نئے خلیفہ کے سپرد کر دیتے۔ لیکن یہ طرزِ عمل کہ باغی خود ہی نمائندے بن بیٹھیں اور مسلمانوں سے حقوقِ وکالت حاصل کئے بغیر ہی خلیفہ کو معزول کر دیں۔ تو اس کا حق انھیں ہرگز نہیں پہنچتا تھا، چہ جائیکہ انھوں نے حضرت عثمانؓ کو صرف معزول ہی نہیں بلکہ قتل ہی کر ڈالا حالانکہ ان کا خون بھی اسی طرح حرام تھا جس طرح دوسرے مسلمانوں کا، بلکہ ان کے خون کی حرمت خلافت کے عہدہ کی وجہ سے دوہری ہو گئی تھی۔

لوگوں نے باغیوں کی حمایت میں بہت عذر تراشے ہیں[1]۔ ان کا بیان ہے کہ مصر و شام اور عراق کے عمال کے خوف

باغیوں کے عذر

سے باغیوں میں یہ ہمت نہ تھی کہ خلیفہ کو معزول کر دیتے اور انہی عمال کے خوف کی وجہ سے وہ زیادہ دیر انتظار بھی نہ کر سکتے تھے کیونکہ اگر وہ حضرت عثمانؓ کو قتل نہ کرتے تو یا تو خود حضرت عثمانؓ انہیں قتل کر دیتے یا حضرت عثمانؓ کے عمال ان کا خاتمہ کر دیتے لیکن یہ تمام عذر تراشیاں انھیں یہ حق نہیں

[1] یہ کون لوگ ہیں؟

دیتیں کہ وہ اس خون کو مباح کرلیں جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے اور اقتدارِ خلافت کو اس طرح بے حرمت کر ڈالیں۔

شاید اس حادثۂ فاجعہ کے لئے ایک ہی عذر ہے جو نہ صرف باغیوں بلکہ حضرت عثمانؓ کے حق میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے نیز ان لوگوں کے حق میں بھی جو بعد ازاں اس حادثہ کی بناء پر باہم گردست وگریبان

اس خونِ ناحق کے ذمہ دار بے قابو ہو جانے والے حالات تھے

ہوئے خون ریزیاں کیں اور ان نفوس و اموال کو مباح کیا جنھیں خدا نے حرام قرار دیا تھا۔ اور وہ عذر یہ ہے کہ اس دور کے احوال ہی اس درجہ قوی تھے کہ ان میں سے کوئی بھی ان کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکتا تھا اور خدا نے ہی ان کے لئے مقدر کر دیا تھا کہ اس فتنۂ کبریٰ کے ذریعہ ان کے دین و دنیا کو آزمائے۔ اسی فتنہ کی شرح کرتے ہوئے حضرت علیؓ نے اہل کوفہ سے کیا خوب کہا تھا "حضرت عثمانؓ نے اپنے اقرباء کو ترجیح دی تو برا کیا اور تم نے اس پر احتجاج کر کے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا یہ بھی برا کیا" ابنِ سعد نے بروایت ابن دکین۔ ابان بن عبداللہ البجلی۔ نعیم بن ابی ہند نے ربعی بن حراش سے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ میں (ربعی بن حراش) حضرت علیؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ان کے پاس حضرت طلحہؓ کے صاحبزادے آئے اور سلام کیا۔ حضرت علیؓ نے انہیں خوش آمدید کہا اس پر حضرت طلحہؓ کے صاحبزادے نے کہا "اے امیر المومنین! آپ نے میرے والد کو قتل کیا اور میرا مال چھین لیا پھر خوش آمدید بھی فرما رہے ہیں؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا "تمہارا مال بیت المال میں الگ جمع ہے، وہاں جاکر اسے لے لو۔ رہا تمہارا یہ قول کہ میں نے تمہارے والد کو قتل کیا تو اس کے جواب میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اُمید ہے کہ میں اور تمہارے والد قیامت کے روز ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے بارے میں خدائے تعالےٰ نے فرمایا ہے:۔

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ (۱۵/۴۷)

"اور ہم ان کے دلوں کا غبار صاف کر کے انہیں بھائی بھائی بنا دیں گے جو مسہریوں پر ایک دوسرے کے بالمقابل بیٹھے ہیں"

یہ سن کر ہمدان قبیلہ کے ایک کانے شخص نے کہا "اللہ اس سے زیادہ عدل کرنے والا ہے"۔

حضرت علیؓ کی گرجتی ہوئی آواز جس نے محل کو تھرا دیا نکلی "اگر یہ ہم لوگوں کے لئے نہیں کہا گیا تو پھر اور کون ہیں جن کے متعلق یہ کہا گیا ہے"!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ط ساری ذمہ داری (معاذ اللہ) خدا پر ڈال دی! یہی وہ ٹیکنیک ہے جس سے متعین بات کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔

ضمیمہ

حضرت عثمانؓ کا صوبوں کے نام خط

(برائے امداد طلبی)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اما بعد! اللہ تعالےٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر بھیجا، آپؐ نے حکم خداوندی کے مطابق اللہ کے پیغامات لوگوں کو پہنچائے اور اپنا فریضہ انجام دینے کے بعد آپؐ اللہ سے جا ملے اور اپنے بعد ہمارے لئے کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔ جس میں اللہ کی طرف سے حلال اور حرام کی ہوئی چیزوں کا بیان ہے اور ان امور کا بیان ہے جسے اس نے قانون بنا کر جاری و ساری کر دیا ہے خواہ بندے اسے پسند کریں یا ناپسند، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کے پہلے جانشین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہوئے، اور دوسرے خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہوئے۔

پھر یہ عہدہ شوریٰ نے ایک نمائندہ جماعت کی موجودگی میں متفقہ طور پر مجھے تفویض کیا، میں اس عہدہ کا نہ امیدوار تھا نہ خواہاں، نہ مجھے اس کے ملنے کا پہلے سے کوئی علم ہی تھا، الغرض میں نے لوگوں کے معروف طریقہ کے مطابق، خود نمونہ بننے کی نہیں بلکہ اپنے پیش رووں کو نمونہ بنا کر ان کی اتباع کرنے کی کوشش کی، مقررہ اصول و

ضوابط کی پیروی کی اور اس میں اپنی طرف سے کوئی بدعت ایجاد نہ کی، پھر جب معاملات اپنی حدوں پر پہنچے، اور شر نے اپنے ساتھیوں کو اکسایا، تو کینے اور خود غرضیاں ابھر کر سامنے آنے لگیں جن کا کوئی معقول سبب نہیں، نہ میری گزشتہ کوئی ایسی بدعملی ہے جس کی پاداش میں یہ کچھ کیا جا رہا ہو۔ ہاں ایک خط کا معاملہ ضرور ہے جس پر دستخط کر لیے گئے، بغیر کسی معقول عذر اور مناسب ثبوت کے یہ لوگ مصر ہیں مرضی کچھ اور ہے ظاہر کچھ اور کر رہے ہیں، میرے خلاف ان باتوں پہ اعتراض کر رہے ہیں جن پر پہلے وہ خود بھی راضی تھے، بہت سی ایسی باتوں پر نکتہ چینی کر رہے ہیں جو اہلِ مدینہ کی نمائندہ جماعت کے سامنے طے کی گئیں اور جن کا ان کے سوا کوئی تدارک ہی نہ تھا، میں نے ان کی ان تمام مخالفانہ سرگرمیوں پر صبر کیا، تمام حالات جانتے بوجھتے برسوں میں نے خود کو ان سے بچایا، لیکن یہ اللہ عزوجل کی مخالفت میں اپنی گستاخی اور جسارت میں بڑھتے ہی چلے گئے، تا آنکہ سرزمینِ ہجرت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار و حرم میں یہ لوگ ہم پر حملہ آور ہو گئے، ان لوگوں نے عرب کے جاہل دیہاتیوں کو بھی اپنا ہم نوا بنا لیا، ان کے اجتماع کی بالکل وہی کیفیت ہے جو جنگِ خندق، یا جنگِ احد میں ہمارے مخالفین کی تھی فرق صرف یہی ہے کہ ان کا ظاہر کچھ اور ہے۔

بہرحال ان حالات میں جو بھی ہماری مدد کے لئے پہنچنے کی قوت رکھتا ہو اس کا فرض ہے کہ وہ مرکز میں پہنچے۔

حاجیوں کے نام حضرت عثمانؓ کا خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امیرالمؤمنین بندہ خدا عثمانؓ کی طرف سے جملہ مومنین و مسلمین کی خدمت میں السلام علیکم ــــ میں آپ کے سامنے خدائے واحد و برتر کی حمد بیان کرتا ہوں جو وحدہٗ لاشریک ہے اور جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

بعدازاں میں آپ لوگوں کو اللہ عزوجل کے وہ انعامات و احسانات یاد دلاتا ہوں جو اس نے آپ لوگوں پر اسلام کی تعلیم دے کر، گمراہی سے ہدایت کی طرف لا کر، کفر سے نجات دے کر، روشن دلائل دکھلا کر، روزی میں وسعت و فراوانی بخش کر، دشمن پر غلبہ دے کر، اور اپنی کامل نعمتوں سے سرفراز کر کے ــــ فرمائے جس کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے اللہ تعالےٰ کا بجا ارشاد ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (۱۴/۳۴)

اگر تم اللہ تعالےٰ کی نعمتوں کو گننے لگو تو ان کا پورا پورا شمار نہیں کر سکو گے، بلاشبہ انسان بڑا ہی ظالم اور نہایت ناشکرا اور ناقدرا ہے۔

اور ارشاد باری تعالےٰ ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِھٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِھٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْھَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِھٖ لَعَلَّكُمْ تَھْتَدُوْنَ ۝ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ

الْمُفْلِحُوْنَ ○ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۳ / ۱۰۲-۱۰۴)

اے ایمان والو! اللہ سے اس طرح ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تمہاری موت صرف ایسی حالت میں واقع ہو کہ تم خدا کی اطاعت شعاری میں لگے ہو اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھام لو، اور فرقہ فرقہ نہ ہو جاؤ، اور اللہ نے تم پر جو انعام و احسان کیا ہے اسے یاد کرو کہ ایک وقت وہ تھا جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں کو باہم جوڑ دیا اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی ہو گئے، اور تم آگ کے گڑھے کے دہانہ پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے بچالیا، اس طرح اللہ اپنی آیات تمہارے لئے بیان کرتا ہے تاکہ تم صحیح راہ پر لگ جاؤ، اور تمہیں ایک جماعت بن جانا چاہیئے جو خیر کی طرف دعوت دے' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر شیوہ بنالے اور یہی کامیاب لوگ ہیں' اور ان لوگوں کی طرح نہ جاؤ جو روشن دلائل آجانے کے بعد فرقہ فرقہ بن گئے۔ اور باہم اختلاف کرنے لگے ایسے لوگوں کے لئے تو بڑا عذاب ہے۔

اور اللہ تعالےٰ کا یہ فرمان بالکل حق ہے :۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (۵ / ۷)

اور تم اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو اور اس پختہ عہد کو بھی جس کے ذریعہ اس نے تمہارے یہ کہنے پر "ہم نے سنا اور اطاعت کی" تم سے پختہ قرار لیا۔

اور فرمان خداوندی حق ہے :۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ○ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ○ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ (۴۹ / ۶-۸)

اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم لاعلمی سے کسی قوم کو تکلیف پہنچا دو پھر اپنے کئے پر پچھتانے لگ جاؤ، اور جان لو کہ تم میں اللہ کا رسول ہے۔ اگر وہ تمہاری بہت سی باتوں کی اطاعت کرنے لگ جائے تو تم مشقت میں پڑ جاؤ گے، لیکن اللہ تعالےٰ نے تمہارے لئے ایمان محبوب کر دیا

ہے اور تمہارے دلوں میں اسے خوشنما بنا دیا ہے اور اس نے تمہاری نظروں میں کفر، فسق اور عصیان کو برا کر دیا ہے اور ایسے لوگ ہی صحیح راہ پانے والے ہیں، یہ اللہ کا فضل اور نعمت ہے، اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

اور ارشاد باری تعالےٰ ہے :۔

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۳/۷۷)

بے شک جن لوگوں نے اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی قیمت لے لی، ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، اللہ قیامت کے دن نہ ان سے بات کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پروان چڑھائے گا اور ان لوگوں کے لئے عذاب الیم ہے۔

اور فرمانِ باری تعالےٰ حق ہے :۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنْفِقُوا خَيْرًا لِأَنْفُسِكُمْ، وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۶۴/۱۶)

جہاں تک تم سے بن سکے اللہ سے ڈرتے رہو اور سنو اور اطاعت کرو اور خرچ کرتے رہو بھلائی کو اپنی جانوں کے لئے، اور جسے اس کی جان کے بخل سے بچا دیا گیا تو یہی لوگ کامیاب ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کا فرمانِ حق ہے :۔

وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا، إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ٥ وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ يَبْلُوكُمُ اللَّهُ بِهِ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ٥ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِنْ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَلَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ٥ وَلَا تَتَّخِذُوا أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌ بَعْدَ ثُبُوتِهَا وَتَذُوقُوا السُّوءَ بِمَا صَدَدْتُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ٥ وَلَا تَشْتَرُوا بِعَهْدِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا، إِنَّمَا عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ٥ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ، وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا

اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۶/۹۱-۹۷)

اور اللہ کے عہد کو جب بھی تم عہد کرو پورا کرو، قسموں اور معاہدوں کو پختہ کرنے کے بعد نہ توڑو، حالانکہ تم نے اللہ کو اس پر گواہ وضامن بنا لیا ہے، بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اسے جانتا ہے، اور اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے سوت کو پختہ کت جانے کے بعد ڈھیلا کر دیتی ہے، تم اپنی قسمیں آپس میں ایک دوسرے کو فریب دہی کے لئے استعمال کرتے ہو تاکہ ایک جماعت دوسری سے زیادہ بڑھ چڑھ جائے، اللہ اس ذریعہ سے تمہاری آزمائش کرتا ہے اور تاکہ ان چیزوں کو جن میں تم اختلاف کرتے ہو قیامت کے دن تمہارے لئے آشکارا کر دے اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک جماعت بنا دیتا لیکن وہ تو اسے گمراہ کرتا ہے جو گمراہ ہونا چاہتا ہے اور اسے ہدایت دیتا ہے جو ہدایت چاہتا ہے، اور تم سے تمہارے اعمال کی بازپرس ہوگی، اور اپنی قسمیں ایک دوسرے کو فریب دہی کے لئے استعمال نہ کرو، ورنہ قدم جمنے کے بعد لغزش کھا جائے گا اور تمہیں اللہ کے راستہ سے اعراض کرنے کا بُرا نتیجہ چکھنا پڑے گا اور تمہارے لئے بڑا عذاب ہوگا، اور اللہ کے عہد کو تھوڑی قیمت کے عوض نہ دے ڈالو، بے شک جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم علم رکھتے ہو جو کچھ تمہارے پاس ہے ختم ہونے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے، اور وہ ضرور صبر کرنے والوں کو ان کے بہتر کاموں کا بدلہ دے گا۔

اور فرمانِ خداوندی حق ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ، فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ، ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ تَأْوِيْلًا ۝ (۴/۵۹)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے حاکموں کی، پھر اگر تم میں آپس میں کسی بات پر جھگڑا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پلٹا دو اگر تم اللہ پر اور روزِ آخر پر یقین رکھتے ہو یہ بہتر اور انجام کے اعتبار سے خوب تر ہے،

اور ارشادِ باری تعالیٰ حق ہے :-

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّ

لَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ، يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ
بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ٥ (النور)

وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انھیں ضرور زمین کی خلافت دے گا جیسے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت دی اور ان کے لئے اس زمین پر کاربند ہونا ضرور ممکن بنادے گا جسے وہ ان کے لئے پسند کرتا ہے اور انھیں خوف کے بعد امن میں منتقل کر دے گا وہ میری عبادت کریں گے اور میرا کسی کو شریک نہ بنائیں گے اور جس نے اس کے بعد کفر کیا تو یہی لوگ فاسق ہیں۔

اور فرمانِ باری تعالےٰ حق ہے :-

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ، فَمَنْ نَّكَثَ
فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ، وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (الفتح)

بے شک جو لوگ کہ آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں، ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے، تو جو پلٹا وہ خود اپنی ہی خرابی کرے گا، اور جس نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو وفا کیا تو وہ اسے بڑا اجر دے گا۔

بعد از اں عرض ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کے لئے جن اصولوں کو پسند کیا ہے وہ سمع و طاعت اور نظام جماعت کی پابندی ہے اس نے آپ کو نافرمانی، فرقہ بندی اور اختلافات کے مہلک عواقب سے ڈرایا ہے۔ اس نے تم سے پہلی اقوام کے حالات تمھیں بتلائے، اور تمھیں پہلے سے اس سلسلہ میں ہدایت کر دی تاکہ اگر تم اس کے قوانین کی نافرمانی کرو تو اس کے پاس تمہارے خلاف ثبوت موجود ہو، لہٰذا، اللہ عزوجل کی نصیحت قبول کرو اور اس کے عذاب سے ڈرو، تمہیں دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسی قوم نہیں ملے گی جو اجتماعی توازن برقرار رکھنے کے باوجود فنا ہو گئی ہو۔ ہلاکت اسی وقت آتی ہے جب قوم میں اختلاف و تشتت رونما ہو جاتا ہے، اور جب بھی تم ایسا کرنے لگو گے تو تم یکجا جمع ہو کر نماز ادا نہ کر سکو گے[1] اور تمہارے اوپر تمہارے دشمن مسلط کر دیئے جائیں گے۔ اور تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کی حرمتوں کو حلال کرنے لگو گے، اور جب ایسا کیا جانے لگے گا تو اللہ کا دین برقرار نہیں رہ سکے گا، اور تم فرقہ فرقہ ہو جاؤ گے، اللہ عزوجل نے اپنے رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا :-

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ، اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ

---

[1] کیسا صحیح اندازہ تھا حضرت عثمانؓ کا !

اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ٥ (۶/۱۶۰)

بیشک جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور جماعت جماعت بٹ گئے، تیرا ان سے کوئی بھی واسطہ نہیں ہے، ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے پھر وہ انہیں ان کے اعمال کے بارے میں بتائے گا۔

میں بھی آپ لوگوں کو اسی تعلیم کی وصیت کرتا ہوں جس کی اللہ تعالےٰ آپ کو تعلیم دیتا ہے اور میں آپ کو اللہ کے عذاب سے ڈراتا ہوں حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا :۔

يَا قَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَا اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صَالِحٍ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ٥ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ٥ (۱۱/۸۹-۹۰)

اے میری قوم! کہیں تمہیں میری مخالفت اس جرم کا مرتکب نہ کردے جس کی وجہ سے تمہیں بھی وہ عذاب پہنچے جو قومِ نوحؑ قومِ ہودؑ یا قومِ صالحؑ کو پہنچا اور لوطؑ کی قوم تو تم سے کچھ ایسی دور بھی نہیں ہے، اور اپنے رب سے مغفرت چاہو پھر اس کی طرف رجوع کرو بیشک میرا رب رحیم و ودود ہے۔

امابعد ۔ یہ لوگ جو میرے خلاف احتجاج کرتے ہوئے جمع ہو گئے ہیں لوگوں کو یہی بتا رہے ہیں کہ وہ کتاب اللہ اور حق کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہے ہیں نیز دنیا اور دنیوی اغراض سے کوئی سروکار نہیں رکھتے لیکن جب ان کے سامنے حق پیش کیا گیا تو یہ مختلف الخیال ہو کر علیحدہ علیحدہ جماعتوں میں منقسم ہو گئے ۔ ایک گروہ حق کو لے لیتا ہے اور دوسرا جب اسے حق دیا جاتا ہے تو اس سے گریز کرتا ہے۔ ایک اور گروہ جو حکومت کے معاملہ کو ناحق بھر لے لینا چاہتا ہے وہ حق کو چھوڑ دیتا ہے۔ میری درازیٔ عمر ان پر گراں گزر رہی ہے اور ان کے حکومت کے خوابوں کی تعبیر میں دیر ہو رہی ہے لہٰذا، یہ قانونِ قدرت میں دخل اندازی کر کے اس سے جلدی تاریخ برآمد کرانے کے لئے بضد ہیں، یہ لوگ پہلے آپ کو لکھ چکے ہیں کہ وہ میرے طے کئے ہوئے معاہدہ پر رضامند ہو کر واپس جا رہے ہیں اور میرا خیال ہے کہ میں نے معاہدہ کی کوئی شق بھی ایسی نہیں چھوڑی جس پر عمل نہ کیا ہو، ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہ حدود کو نافذ کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں تو میں نے ان سے کہہ دیا کہ جس کے متعلق تمہیں یہ معلوم ہو کہ اس نے کسیؓ ...... حدود سے تجاوز کیا ہے اس پر حدود نافذ کرو، جس نے بھی تمہاری حق تلفی کی ہے خواہ وہ دور کا ہو یا قریب کا اس پر حدود نافذ کرو، انھوں نے کہا کہ کتاب اللہ

ؓ طبری کے متعلق نسخوں میں اسی طرح مذکور ہے۔ یہاں عبارت میں کچھ نقص رہ گیا ہے ۔

کی تلاوت کی جائے گی، تو میں نے کہا ضرور تلاوت کی جائے گی، لیکن تلاوت کرنے والے کو چاہیئے کہ اس میں غلو نہ کرے اور کتاب میں اللہ کی نازل کردہ تعلیمات سے تجاوز نہ کرے۔ ان لوگوں کا مطالبہ ہے کہ نادار و محروم کو روزی دی جائے، مال کو اس کے صحیح اور مناسب مقامات پر خرچ کرنے کے لئے پوری پوری توجہ دی جائے، خمس اور صدقہ کے اخراجات میں جائز حدود سے تجاوز نہ کیا جائے، صاحب قوت و امانت کو امیر مقرر کیا جائے، لوگوں کے جائز حقوق جو تلف کئے گئے انہیں واپس دیئے جائیں۔ میں نے ان کے یہ مطالبات تسلیم کر لئے اور اس پر پختگی سے کاربند رہا۔ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی خدمت میں مشورہ لینے کے لئے گیا، انھوں نے یہ مشورہ دیا کہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن قیس رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کرو، معاویہؓ کو نہ چھیڑو کیونکہ انہیں تمہارے پیش رو نے مقرر کیا ہے۔ نیز وہ اپنے علاقہ کا درست انتظام رکھتے ہیں اور ان کی فوج بھی ان سے خوش ہے عمروؓ کو واپس اپنے عہدہ پر بھیج دو کیونکہ ان کا لشکر انہیں پسند کرتا ہے انہیں تاکید کرو کہ وہ اپنے علاقہ کی اصلاح پر توجہ دیں۔ اور میں نے ان کے مشورہ کے مطابق یہ سب کچھ تبدیلیاں کر دیں۔ اس کے بعد بھی مجھ پر زیادتی کی جا رہی ہے اور حق پر ظلم ہو رہا ہے۔

میں یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں اور میرے وہ ساتھی جو قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے لینے کے آرزو مند ہیں تقدیر خداوندی سے نتیجہ نکلوانا چاہتے ہیں، وہ نماز سے بھی روک رہے ہیں، انھوں نے میرا مسجد میں جانا بھی بند کر دیا ہے اور اپنے مقدور بھر یہ لوگ مدینہ پر غلبہ حاصل کر چکے ہیں، اس وقت تک جب کہ میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ یہ لوگ مجھے تین باتوں میں سے ایک کو قبول کرنے کا اختیار دے رہے ہیں،

یا تو مجھ سے ہر اس آدمی کا بدلہ (قصاص) لیں جسے میں نے غلطی سے یا بجا طور پر کوئی سزا دی ہے اور اس سلسلہ میں کوئی رعایت یا چھوٹ نہ ہوگی۔

یا میں خلافت سے معزول ہو جاؤں اور وہ میرے علاوہ کسی دوسرے کو خلیفہ بنا لیں۔

یا پھر وہ میرے پاس اپنے ہم خیال وہم نوا لشکروں اور شہریوں کو بھیجیں گے جو اپنی اس ذمہ داری (یعنی سمع و طاعت) سے برأت کا اظہار کریں گے جو اللہ تعالےٰ نے میرے لئے ان پر ڈالی ہے۔

میں نے ان لوگوں کو جواب دیا کہ جہاں تک مجھ سے قصاص لینے کا تعلق ہے آپ لوگ جانتے ہیں کہ مجھ سے پہلے

ل خط کے متن کی اس عبارت اور تاریخ کی روایات میں اختلاف ہے، جس پر ہم ان شاء اللہ دوسرے حصہ میں بحث کریں گے۔

بھی خلیفے گذر چکے ہیں جنھوں نے غلط فیصلے بھی کئے اور صحیح بھی، لیکن ان میں سے کسی سے بھی قصاص کا مطالبہ نہیں کیا گیا اور یہ تو مجھے معلوم ہی ہے کہ یہ لوگ میری جان کے دشمن ہیں۔ جہاں تک خلافت سے معزولی کا تعلق ہے، تو اگر یہ لوگ مجھے سخت تکلیف دہ اور بدن میں چبھ کر پھنس جانے والے بھالوں سے بھی ماریں گے تو میں یہ تکلیف بخوشی برداشت کر لوں گا لیکن اللہ تعالیٰ کی خدمت و خلافت جو مجھے تفویض ہوئی ہے اس سے برأت کا اظہار ہرگز گوارا نہ کروں گا، اور یہ لوگ جو فوج اور شہریوں کو میرے پاس میری سمع و طاعت سے اظہار برأت کے لئے بھیجنا چاہتے ہیں تو میں ان کا کوئی وکیل نہیں ہوں، نہ میں نے ان کو پہلے اپنی سمع و طاعت کے لئے مجبور کیا تھا ان لوگوں نے بخوشی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اپنے باہمی تعلقات خوشگوار رکھنے کے لئے میری سمع و طاعت قبول کی تھی، یاد رکھو تم میں سے جو بھی دنیوی اغراض کا طالب ہے تو اسے ان میں اتنی ہی کامیابی ہوگی جتنی اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقرر کر دی ہے اور جو خوشنودی مولیٰ، دار آخرت اور اصلاح امت کا لوجہ اللہ طلب گار ہے اور اس سنتِ حسنہ پر چلنے کا خواہاں ہے جسے آنحضرتؐ نے اور ان کے بعد ابوبکرؓ و عمرؓ نے قائم رکھا تو اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ دے گا۔

میرے پاس تمہارا بدلہ نہیں ہے، اور اگر میں تمہیں تمام دنیا بھی دے دوں تو بھی وہ تمہارے دین کا بدل نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی فائدہ پہنچا سکتی۔ لہٰذا، اللہ سے ڈرو اور جو کچھ اس کے پاس ہے اس پر اپنے اعمال کی بنیاد رکھو، جو بھی تم میں سے اپنے عہد و پیمان سے پلٹنا چاہتا ہے تو میں اس کے لئے یہ طریقہ پسند نہیں کرتا، اور اللہ تعالیٰ کو بھی یہ پسند نہیں کہ تم اس کے عہد سے پھر جاؤ۔

یہ لوگ مجھے جو کچھ بھی اختیار دے رہے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ میں خلافت سے دستبردار ہو جاؤں اور یہ کسی اور کو امیر بنالیں، میں خود کو اور اپنے ساتھیوں کو روکے ہوئے ہوں اور اللہ کے فیصلہ کا منتظر ہوں کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ جس طرح چاہے اس نعمت کو بدلے، میں بُری سنت ایجاد کرنا، اُمت میں اختلاف ڈالنا اور خونریزی کرنا پسند نہیں کرتا، میں آپ لوگوں کو اللہ کی قسم دلاتا، اسلام کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ لوگ صرف حق کا ساتھ دیجئے میری طرف سے حق ادا کیجئے اور بغاوت کو سرکشوں تک چھوڑ دیجئے، ہمارے درمیان فرمانِ الٰہی کے مطابق عمل سے فیصلہ کیجئے۔ میں تمہیں اللہ عزوجل کی قسم دلاتا ہوں جس نے تمہارے اوپر امر اللہ کے بارے میں پاسداریِ عہد اور باہمی تعاون فرض کیا ہے، اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کا فرمان ہے اور وہ حق ہے کہ

وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (۱۵/۴)

اور تم عہد کو پورا کرو، بے شک عہد کے بارے میں تم سے بازپرس کی جائے گی

یہ اس لئے ہے کہ میں اللہ کے پاس عذر پیش کر سکوں اور تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

آخر میں مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ میرا یہ دعوےٰ نہیں کہ میرا نفس عیوب و نقائص سے پاک و مبرّا ہے، بیشک نفس تو بُرائی کا بہت حکم دینے والا ہے بجز ان لوگوں کے جن پر میرے رب کا رحم ہوا بے شک میرا رب غفور رحیم ہے، میں اپنے ہر کئے ہوئے کام سے خدا کی طرف توبہ کرتا ہوں اور اس سے مغفرت کا طالب ہوں اُس کے سوا کوئی نہیں جو گناہوں کی مغفرت کرسکے بیشک میرے رب کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے، یقیناً اللہ کی رحمت سے سوائے گمراہ لوگوں کے اور کوئی ناامید نہیں ہوتا، اور یقیناً وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور سیئات سے درگزر کرتا ہے اور وہ اپنے بندوں کے کاموں سے باخبر ہے، اور میں اللہ عزوجل سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میری اور تمہاری مغفرت فرمائے اور اس امت کے دلوں کو خیر پر جوڑ دے، اور ان کے دلوں میں فسق کو ناپسند بنا دے، اے مومنو! اور مسلمانو! تم سب پر خدا کی سلامتی و رحمت و برکات ہوں۔

اعتذار

اس حصہ میں ہم نے عبداللہ بن سبا کے حالات جو ابن سوداء کے نام سے مشہور ہے بالتفصیل بیان نہیں کئے ہیں اس لئے کہ اس کے واقعہ میں کچھ طول اور پیچیدگی ہے اس لئے بھی کہ اس کی اہم سرگرمیاں ہمارے خیال میں حضرت علیؓ کی خلافت کے دوران میں ہوئیں، لہٰذا، ہم نے اس موضوع کی تفصیل کو اسی کتاب کے دوسرے حصہ میں لے لیا ہے۔

اسی طرح ہم نے حضرت عثمانؓ کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور عمرو بن العاصؓ کے باہمی نزاع کا بھی تذکرہ نہیں کیا ہے، اس لئے کہ ان دونوں کی اہم سیاسی سرگرمیاں بھی حضرت علیؓ کے عہد میں رونما ہوئیں۔ لہٰذا، اس موضوع کو بھی ہم نے اس کتاب کے دوسرے حصہ میں شامل کر لیا ہے۔[1]

---

[1] یہ کتاب ادارہ کی طرف سے شائع نہیں ہوئی

مآخذ

اس کتاب میں جو بھی واقعہ، تاریخی روایت یا قدیم متکلمین کی رائے بیان کی گئی ہے اس کی سند مندرجہ ذیل کتابوں میں سے کسی میں ضرور ملے گی۔

۱۔ سیرت ابنِ ہشام
۲۔ طبقات ابن سعد
۳۔ انساب الاشراف للبلاذری
۴۔ تاریخ البخاری
۵۔ کتب احادیث کے مختلف مجموعے اور ان کی شرحیں
۶۔ تاریخ الامم والملوک للطبری
۷۔ تفسیر الطبری
۸۔ الکامل لابن اثیر
۹۔ البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر
۱۰۔ تاریخ ابن خلدون
۱۱۔ تاریخ دمشق لابن عساکر
۱۲۔ تاریخ بغداد للخطیب بغدادی
۱۳۔ تاریخ عقد الجمان للعینی
۱۴۔ نہایۃ الأرب للنویری
۱۵۔ مسالک الابصار فی الممالک والامصار، للعمری
۱۶۔ الخطط، للمقریزی
۱۷۔ النزاع والتخاصم، للمقریزی
۱۸۔ ولاۃ مصر وقضاتہا للکندی
۱۹۔ الجاحظ کے مختلف رسائل
۲۰۔ الفصل فی الملل والأہواء والنحل، لابن حزم
۲۱۔ کتاب الفرق بین الفرق، لعبد القاہر بن طاہر بغدادی
۲۲۔ التبصیر فی الدین، للابی المظفر اسفرائینی
۲۳۔ الملل والنحل للشہرستانی
۲۴۔ منہاج السنۃ لابن تیمیہ

اس موضوع پر معاصرین کی تصانیف میں سے صرف تین ہم نے پڑھی ہیں۔

۱۔ اشہر مشاہیر الاسلام، لرفیق بک عظم
۲۔ الاسلام واصول الحکم، للاستاذ علی عبد الرزاق
۳۔ کتاب عثمان بن عفان، للاستاذ الشیخ صادق ابراہیم عرجون

مستشرقین کی کتابوں میں سے اس ضمن میں ہم نے صرف دو چیزیں زیرِ نظر رکھی ہیں۔

۱۔ کیٹانی کی کتاب "انالی دی الاسلام"
۲۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی متفرق فصلیں۔